مزید آوارگی

(سفرنامہ)

جاوید دانش

© جاوید دانش

"MAZEED AAWARGI" *(Travelogue of Japan)*

Jawaid Danish ---- **2006**

بارِاول ______ جنوری۴۹۹۱ء

بارِدوم ______ جون۶۰۰۲ء

تعداد ______ ایک ہزار

کمپوزنگ ___ ایکمی گرافکس، کلکتہ-۳۷

مطبع ______ پرنٹ ویل آفسٹ، کلکتہ-۷۱

سرِورق ____ عظمیٰ دانش

قیمت

۰۰۲/روپے/۰۱ڈالر

تقسیم کار :

حنفی ٹرسٹ (ہندستان) ۴۱/۱۱،جھاؤتلہ روڈ،کلکتہ-۷۱

رنگ منچ (کینیڈا) ۴۷۵۱،میجراوکس روڈ، پکرنگ،L1X2J7،کینیڈا

بیٹے

عدیل

اور

احسن

کے نام

فہرست

۱	جاپان پہنچتے ہی ہم لکھ پتی بن گئے ـــــ مگر	۷
۲	ابھرتے سورج والے مقدس جزیرے	۱۵
۳	جاپانی آموختہ اور اس کی بھول بُھلیّاں	۲۴
۴	گیسوئے اردو اور گیسو دراز جاپانی گرو	۲۹
۵	ہاں! میں نے کچی مچھلی کھائی	۳۵
۶	شنتو کاہن اور نروان کی دھند	۴۰
۷	لکھنؤ والے پاکستانی رئیس	۴۸
۸	کانکریٹ کے جنگل میں منگل	۵۳
۹	یہ ریڈیو جاپان ٹوکیو ہے	۶۲
۰۱	چیری کے شگوفوں تلے، پھول والوں کی سیر	۶۸
۱۱	جاپانی نوٹنکی وغیرہ	۷۵
۲۱	ہکونے ـــــ فیوجی یاما کے دامن میں	۸۵
۳۱	جشنِ چائے اور گیشا گرلز	۹۷
۴۱	تبسم عارفانہ سے غسلِ عاشقانہ تک	۱۰۱
۵۱	فیئر ویل ڈنر ـــــ سایونارا	۱۰۹

۶۱ شہرِ خوباں — ہانگ کانگ ۱۲۱

۷۱ ذکر کچھ کوچہ و بازار کے ہنگاموں کا ۱۳۸

۸۱ آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا ۱۴۵

۹۱ جائیں تو جائیں کہاں — ہائے ۷۹۹۱ء ۱۵۲

۰۲ مسکراہٹوں کا شہر — بنکاک ۱۵۷

۱۲ میں گوتم نہیں ہوں ۱۶۹

۲۲ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ۱۷۹

۳۲ راجا صاحب کی نفیری اور تھائی نوٹنکی ۱۸۷

۴۲ راہ میں ان سے ملاقات ہوئی ۱۹۳

مجھ کو آوارگی ہی راس آئی!

''آوارگی'' نے میرے لیے نئی دنیا کے دروازے کھول دیے تھے۔ تمام سفری دشواریوں کے باوجود میں اک نئے سفر کے لیے خود کو ہمیشہ پا بہ رکاب پاتا ہوں۔ جتنا سفر میں کر چکا ہوں اتنا ہی دنیا اور اپنے آپ کو سمجھتا چلا جا رہا ہوں۔ اب سفر کا سلسلہ داخلی ہے ـــــ سفر نہ صرف میرا مقدر ہے بلکہ میرے لیے مقدم بھی ہے!

جہاں ''آوارگی'' کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا وہیں بیشتر تنقید نگاروں اور اساتذہ حضرات نے تمام تر خامیوں کے باوجود کہا ''......لیکن کتاب اچھی ہے۔''!

پہلے لکھنؤ اردو اکاڈمی نے اسے اعزاز بخشا' پھر مغربی بنگال اردو اکاڈمی' کلکتہ نے اول انعام ۹۸۹۱ء سے نوازا ـــــ گویا کتاب پسند کی گئی۔

''مزید آوارگی'' بھی نقشِ اول کی طرح مقبول ہوئی۔ اعزازات سے سرفراز ہوئی اور اس کا ہندی ایڈیشن بھی مقبول ہوا اور انعام سے نوازا گیا۔ اب اس کا بنگلہ ترجمہ بھی جلد منظرِ عام پر آیا چاہتا ہے۔

دوستوں اور کرم فرماؤں کی دلچسپی کی خاطر یہ دوسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔

اگلے سفر تک کے لیے اجازت۔

جاوید دانش

ٹورانٹو

جون ۲۰۰۲ء

جاپان پہنچتے ہی ہم لکھ پتی بن گئے ـــــ مگر!

میرے گھر والے، رشتہ دار، دوست احباب، رفیق رقیب اور محلے ٹولے والے یہ پڑھ کر خوش ہولیں کہ آخر کار زندگی میں پہلی بار (اور شاید آخری بار) ہم لکھ پتی بن ہی گئے۔

خالہ چاچی کی پیشین گوئیاں کہ ''بندے نے کتاب قلم کے چکر میں خود کو تباہ کر ڈالا۔ اور یہ آوارگیاں دیکھو کیا گل کھلاتی ہیں۔'' ـــــ دھری کی دھری رہ گئیں! بھئی قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے، چلو عزیزوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

مارچ کی ٦/تاریخ ہے، دوپہر کے تین بجا چاہتے ہیں، میں کیتھے پیسی فِک کی ایک تام جھام فلائٹ سے صرف ٢٠/منٹ پہلے اتارا گیا ہوں۔ کسٹم وغیرہ کے بعد میں نے موسم کا اندازہ کرتے ہوئے اپنا اکلوتا گرم لانگ کوٹ نکال کر پہن لیا ہے۔ سردی صرف ٧/ڈگری ہے مگر ناریتا ایئرپورٹ کا ماحول گرم ہے۔ لوگوں کی بھیڑ رواں دواں ہے۔ جلد ہی میں نے اندازہ کر لیا کہ موٹی موٹی دھندے کی باتیں انگلش میں لکھی ہیں۔ باقی ہر سو جاپانی کا دور دورہ تھا۔ کیوں نہ ہو۔ میں ٹوکیو پہنچ چکا تھا۔ ابھی میں لابی کا معائنہ کر رہا تھا کہ ایک بینک مل گیا۔ لوگ لائن میں لگے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ ادھر ادھر سے بھی آ کر کاؤنٹر سے چیک جاتے تھے اور حیرت یہ تھی کہ سامنے والا خاموشی سے اخبار پڑھ کر اپنے صبر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گویا کہ جاپانی بڑے صابر ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوں گے، سچ پوچھو تو اصل صبر میں کر رہا تھا کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا، کیوں کہ اہلِ جاپان پر اپنا پہلا امپریشن میں خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بات پر اور کوفت ہو رہی تھی کہ کاؤنٹر پر بیٹھی دوشیزہ کرنسی کے تبادلے کا حساب کیلکو لیٹر کی جگہ ایک لکڑی کے فریم میں لگے چھوٹے چھوٹے دانے پر کر رہی تھی! جی ہاں وہی فریم یا چوکھٹا جسے ہمارے یہاں چینی بچے اسکول لے جاتے نظر آتے ہیں۔ حد ہوگئی، ساری دنیا کو الیکٹرانک گیجٹ اور کیلکو لیٹر فراہم کرنے والی قوم خود روایتی حساب کتاب میں مست ہے۔ یعنی ہماری عادتیں بگاڑ کر خود الگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ جاپانی اپنی قدیم روایت کو اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس قبول صورت و سیرت دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے موشی موشی کہا۔ جاپانی کا یہ واحد لفظ تھا جسے میں جانتا تھا، باقی کام کی باتیں آج سے سیکھنا تھیں! میں نے بھی بڑے جاپانی انداز میں موشی موشی یعنی ہیلو کہتے ہوئے امریکن ایکسپریس کے آٹھ سو ڈالر والے ٹراویلرس چیک بڑھا دیئے۔ اس نے جیسے ہی

چینی چوکھٹا اٹھایا میں نے فوراً روکا اور انگلش میں پوچھا ''بی بی! اس قدیم جمع اور ضرب کے مشکل کشا کو آپ کی شیریں زبان میں کیا کہتے ہیں بھلا؟ پہلے تو وہ اس بے جا باز پُرس پر چونکی پھر معاملے کو سمجھتے ہوئے بصد خلوص بتایا۔ ''سوربان'' میں بھی بصد احترام جاپانی آداب بجالانا چاہتا تھا کہ اس نے ایک فارم پُر کرنے کو بڑھا دیا۔

جب تک میں فارم پُر کرتا رہا، وہ اس چینی کیلکو لیٹر پر حساب کرتی رہی۔ پھر مجھ سے چیکس پر سائن کرایا۔ اس کے بعد چند بہت بڑے نوٹ ساتھ کچھ چھوٹے اور مٹھی بھری ریزگاری ایک چھوٹی سی بید والی ٹوکری میں رکھ کر میرے آگے بڑھایا اور لگی مسکان بکھیرنے، جب میں ٹوکری خالی کر چکا تو اس نے ایک رسید بڑھاتے ہوئے آخری دستخط کی گذارش کی، میں نے سائن کر کے رسید کی نقل اسے واپس لوٹا دی۔ اس نے کچھ کہا جس کا مطلب شکریہ کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا۔ نوٹ بٹورتے ہوئے رسید پر نظر پڑی تو اندازہ ہوا کہ ہاتھ میں دس ہزار کے دس بڑے نوٹ یعنی ایک لاکھ اور کچھ سو روپے کے نوٹ اور ڈھیر ساری ریزگاری تھی۔ پہلے یقین نہ آیا پھر ایکسچینج ریٹ دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ حساب چینی کیلکو لیٹر واقعی بالکل درست کرتے ہیں۔ فوراً ذہن میں ایک کوندا سا لپکا کہ حضرتِ دانش آخر تم لکھ پتی بن ہی گئے۔ اب دیکھیں ایک لاکھ اور کچھ ین کیا گل کھلاتے ہیں۔ گو پیسے کو میں نے عام لوگوں کی طرح کبھی ہاتھ کا میل نہ سمجھا، یہ اور بات ہے کہ پیسہ مجھے میلا کچیلا سمجھ کر ہمیشہ مجھ سے دور بھاگتا رہا ہے۔ پھر بھی طرفین کو ایک دوسرے سے کوئی گلہ نہیں۔ ہم اپنی قلندری اور آوارگی میں مست ہیں، پیسہ بینک میں خوش اور محفوظ ____ سنتے ہیں لکھ پتی بن جانے پر ایک عجیب سی کیفیت ہوتی ہے، مگر اس عجیب وغریب کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہوسکتا ہے لاکھ ین کی گرمی کو موسم کی سرد ہوا نے ٹھنڈا کر رکھا ہو اور اس کے وزن کا اندازہ میرے بیگ سوٹ کیس نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ہاں! جیب میں جھولتی ریزگاری سے یہ بات صاف تھی کہ اس ملک میں خوش حالی کی طرح ریزگاری کی بھی کمی نہیں ہے۔ ہمارے وطن کی طرح نہیں کہ خوش حالی کی طرح ریزگاری بھی عنقا ہے! میں نے بیگیج اسٹوریج کا معلوم کیا اور سفری معمول کے مطابق بڑا سوٹ کیس وہاں جمع کرنے پہنچا۔ دو جاپانی نوجوانوں نے بغیر مسکرائے میرا استقبال کیا اور بڑے مشینی انداز میں ۳۰۰ ین ____ روزانہ کی فیس بتادی۔ میرا پروگرام کم از کم ہفتے بھر کا تھا۔ جو بڑھ بھی سکتا تھا۔ ۲۱۰۰ ین دیتے ہوئے مجھے لگا چارج کچھ زیادہ ہے، ارے تمام ایئر پورٹ مہنگے ہوتے ہیں یار ____ اب اتنا سوچنا کیا!

ٹورسٹ انفارمیشن کاؤنٹر پر بیٹھی دوشیزہ اپنا میک اپ ری ٹچ کر رہی تھی، ساتھ والی محترمہ ایک

چھوٹے سے کیلکو لیٹر سے کھیل رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ میک اپ گائیڈ کمپیوٹر ہے یعنی اس میں اگر کوئی حور بانو اپنی جلد کی ٹائپ اور رنگ فیڈ کر دے تو یہ آفت گائیڈ بتائے گا کہ کون سا رنگ یا غازہ اس کے چہرے کو مزید پُرکشش اور قدرتی بنائے گا۔ اچھا، جہاں ضرورت ہے ''یعنی حساب میں'' انگلیوں کا استعمال ہو رہا ہے اور جہاں ضرورت نہیں وہاں برقی میک اپ گائیڈ استعمال کی جا رہی ہے' مجھے اس سے کیا، ہر ترقی یافتہ قوم کی اپنے طرز کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ خبر دار جو کسی کی ذاتیات میں تاک جھانک کی۔ مجھے میک اپ میں الجھا دیکھ کر بچیاں قدرتی طور پر مسکرائیں اور انگلش میں پوچھا، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟ میں نے ایک پرچی ان کے آگے بڑھا دی اور بتایا مجھے اس پتے پر جانا ہے۔ انھوں نے ٹوکیو کا نقشہ نکال کر میرے آگے پھیلا دیا اور بتایا '' یہاں آپ کھڑے ہیں، داہنے ہاتھ پر باہر شٹل والی بس کھڑی ہے' یہ آپ کو سٹی ریلوے اسٹیشن لے جائے گی۔ وہاں سے آپ ٹرین لے کر نی پوری اتر جائیں اور وہاں سے ایک اور ٹرین آپ کو ہیگاشی جوجُو لے جائے گی، باہر نکل کر ٹیکسی لے لیں' بس! میں نے شکریہ ادا کیا اور چلتے چلتے پوچھا کہ اس بس، ٹرین اور ٹیکسی کا کرایہ تقریباً کیا ہوگا اور دیر کتنی لگے گی۔ محترمہ نے دوبارہ کسی چارٹ پر دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا یہی کوئی ڈھائی تین ہزار ین اس کے بعد لڑکی نے کیا کچھ کہا مجھے سنائی نہیں دیا مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لکھ پتی والا ٹائٹل چند دنوں کا مہمان ہے۔ ابھی میں ایئر پورٹ سے باہر نہیں آیا تھا اور پانچ ہزار ین ہنسی خوشی خرچ کر چکا تھا۔ سنا تھا ٹوکیو بہت مہنگا شہر ہے مگر اب یقین ہو چلا ہے کہ یہ دنیا کا مہنگا ترین شہر ہے۔

کےسی اسٹیشن پر اسکائی لائن ایکسپریس بہت خوبصورت اور صاف ستھری لگی۔ پلین کی طرح کشادہ اور آرام دہ نشستیں، سرخ قالین، ایئر کنڈیشنڈ، زیادہ تر مسافر جاپانی، تھوڑے امریکن، اپنے طرز کا میں فردِ واحد۔ جب باہر کے نظارے سے فرصت ملی تو میں نے ڈبے کا معائنہ کرنا شروع کیا۔ میرے سامنے چند جاپانی مرد اور عورتیں منہ پر سفید نقاب لگائے بیٹھے تھے، جیسے ہمارے یہاں جین مذہب کے ماننے والے لگائے رکھتے ہیں۔ یہ بدھ مت کے بعد جین مذہب یہاں کب آ پہنچا ____ مگر جلد مجھے اندازہ ہوا کہ بہت سارے لوگ ایسے نقاب میں تھے۔ پتہ چلا سردی سے بچنے کے لیے اس کا استعمال عام ہے۔

سُپر ایکسپریس ایئر لائنز نے ڈیڑھ گھنٹے میں '' نی پوری'' پہنچا دیا۔ وہاں سے جے آر لائن کی ٹرین لے کر کوئی پندرہ منٹ میں ہیگاشی جوجُو پہنچا۔ باہر نکلتے ہی ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور انگلش نہیں جانتا تھا۔ میں نے دوبارہ اپنے ٹھکانے کی پرچی دکھائی۔ میٹر ڈاؤن ہوتے ہی ۶۷۰ ین مجھے منہ چڑا رہے تھے۔ ہمیں چلے پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک چوراہے پر ٹیکسی پولیس والے کے سامنے رکی۔ ڈرائیور نے

مجھے گاڑی میں چھوڑا اور خود اتر کر پولیس والے سے کچھ بات کرنے لگا۔ یہ سب اچانک ہوا۔ میں گھبرایا کہ کس مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔ دو منٹ بعد پولیس اپنی چوکی سے ایک ڈائری لیے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ ہیلو کہتے ہوئے اس نے کہا معاف کیجیے ڈرائیور کو انگلش نہیں آتی۔ سیدھے جا کر بائیں ہاتھ والی گلی مڑ جائیں۔ تین مکان کے بعد والا مکان آپ کا پتہ ہے۔ آپ خود نمبر دیکھ کر گاڑی رکوالیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا کہ یہاں پولیس والے بڑے شریف ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایکو مینشن کے سامنے کھڑے تھے۔ ۷۰۰ ین کا بل ادا کر کے میں بلڈنگ کا سرا ڈھونڈنے لگا۔ ایک گھومتی ہوئی سیڑھی بلڈنگ کی پسلی سے اوپر جارہی تھی۔ مجھے پانچویں منزل پر جانا تھا۔ اس وقت ٹورانٹو کے لفٹ یاد آرہے تھے۔ ایک تو سفر کی تھکن، ین کی آئس کریم کا بڑی تیزی سے گھلنا اور پانچویں منزل؟

کال بیل پر انور صاحب نے دروازہ کھولا اور لپک کر بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے اور پھر پانچ منٹ تک ایئرپورٹ نہ پہنچنے کا کفارہ ادا کرتے رہے۔ دراصل ان کی دوپہر کی کلاس تھی اور وہ فرصت نہیں نکال پائے تھے۔ میں نے بات رکھنے کے لیے (اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں سے واپس لیا جو وہ مصافحے کے بعد چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے) کہا، میاں میں صحیح سالم پہنچ گیا، بس اب گرم گرم چائے ہو جائے۔ انور میاں دوبارہ چہکے ”مجھے یقین تھا کہ آپ پتہ ڈھونڈ نکالیں گے، آخر آپ جہاں گرد ٹھہرے! اس توصیفی کامنٹ پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ فلیٹ دو کمروں کا سادہ بلکہ بے حد سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ فرش پر اصلی تنکوں والی چٹائی بچھی نہیں بلکہ چپکی تھی، یعنی ہمیشہ کے لیے بچھا دی گئی تھی۔ ڈنر ٹیبل قدرے نیچے جس کے گرد کرسیوں کے بجائے چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا اہتمام تھا' اصلی چٹائی اور بغیر کرسی کی ٹیبل اور فرشی اہتمام تک میرا کلکتے والا فلیٹ بالکل جاپانی تھا۔ اس کا احساس ہمیں پہلے نہ تھا۔ ہم لوگ خواہ مخواہ نیچے بیٹھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کوئی جاپان آکر دیکھے نیچے بیٹھنے میں کیسا سرور اور آنند ملتا ہے۔ دیوار پر ایک جاپانی لینڈ اسکیپ والا کلینڈر اور ایک بڑا روح افزا پوسٹر امریکن سنگر 'ماڈونا' کا لگا تھا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے آواز لگائی ”تو ماڈونا آجکل آپ کی منظورِ نظر ہے۔“ کچن سے انور کے ہنسنے کی آواز آئی، صرف میری نہیں بلکہ سارے جاپانی نوجوانوں کی' ماڈونا اور مائیکل جیکسن کے لیے طلبا پاگل ہیں۔ چائے کی ٹرے سنبھالے انور آئے اور میز پر رکھ دی، پھر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کلکتہ اور دیگر دوستوں کی خیریت پوچھی' سب ٹھیک ہے۔ ارے ہاں تمہاری چٹائی اور پوسٹر میں ایسا الجھا کہ تمھارے خطوط نکالنا ہی بھول گیا۔ انور نے کہا یہی یہاں کا اسٹائل ہے۔ جاپانی ہوتے تو بڑے ماڈرن اور رنگین مزاج ہیں مگر ان کا طرزِ رہائش بہت سادہ ہوتا ہے مگر راستے میں بڑے خوبصورت مکان اور کاٹج میں دیکھتا آرہا ہوں۔ ہاں

خوبصورت تو یہ ضرور ہوتے ہیں مگر صرف مکان کا صدر دروازہ اور آنگن جس میں پیڑ پودے، پھولوں سے لدی کیاریاں، چھوٹا سا مصنوعی جھرنا اور چھوٹا سا تالاب جس میں تیرتی رنگ برنگی گولڈفش' مگر اندر کا ماحول بہت سادہ، پھر زیادہ تر لوگ زمین پر ہی سوتے ہیں اور آج آپ کو بھی فرش پر ہی آرام کرنا ہوگا اور ہم دونوں ہنس پڑے' میاں! میں نے اتنا سفر کیا ہے کہ اب پلنگ اور بستر دونوں کی قید سے آزاد ہوں اور پھر آج تم سونے کی بات کیسے کرنے لگے۔ آج تو شب بیداری ہوگی۔ کچھ ٹورانٹو کی سنو، کچھ ٹوکیو کی بتاؤ بھائی' میں نے اپنا بیگ کھول کر چند خطوط انور کو بڑھا دیئے، ساتھ ہی گنگورام کے رس گلوں کا ڈبہ! اوہ شکریہ' انور کا چہرہ رس گلے دیکھ کر تمتما اٹھا۔ وطن سے دور لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کس قدر خوش ہوجاتے ہیں۔ انور نے جوش میں کہا'' بھائی اس ڈبے میں مٹھائی نہیں وطن کی شیریں یادیں بند ہیں' بھئی اور بھی بہت کچھ لا سکتا تھا مگر راستے میں رکتا ہوا آیا ہوں، ویسے مجھے امید نہ تھی کہ تم سے ملاقات ہوگی۔

انور میرے کلکتہ کے نوٹنکی گروپ کے ساتھی خورشید کے دوست جاوید صاحب کے سالارِ جنگ تھے۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت خورشید نے انور کا فون نمبر دیا تھا۔ میں نے معاملہ کنفرم کرنے کی غرض سے ہانک کانگ سے بے شمار فون کیے مگر ہر دفعہ انور کے روم میٹ آزاد صاحب سے بات ہوتی۔ میرے پہنچنے کی خبر ان لوگوں کو ہوگئی تھی مگر میں خود انور سے ایک بار بات کرنا چاہتا تھا۔ اس شش و پنج میں ہانک کانگ سے صرف ۵۰۰ ڈالر خرچ ہو چکے تھے۔ آخیر دن میں نے رات گئے فون کیا اور انور میاں سے بات ہوئی۔ انھوں نے ایئرپورٹ نہ پہنچنے کی مجبوری بتائی مگر راستہ سمجھا دیا اور خوش آمدید کہا! باتوں ہی سے مجھے انور ملنسار نوجوان لگا۔ ملنے پر اس کی خوش مزاجی بھی سامنے آئی۔ ہم لوگ اس ملاقات سے خوش تھے۔

ایک تو انور میاں کی طبیعت اچھی، دوسرے ان کے بہنوئی کا حسنِ اتفاق سے میرا ہم نام ہونا (صرف جاوید کی حد تک) یعنی نام اور رشتے کی نزاکت نے مہمان نوازی میں چار نہیں بلکہ کئی چاند لگا دیئے تھے۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ ہم لوگ پہلی بار ملے ہیں۔ انور اپنے خطوط ختم کر کے اٹھے اور چائے سے کپ دوبارہ بھرنے لگے۔ اہلِ کلکتہ کی طرح جاپانی بھی چائے بہت پیتے ہیں مگر یہ دیسی نہیں، ان کی چائے کھوچا کہلاتی ہے، کل آپ کو پلاؤں گا، انور نے کہا۔ اتنے میں آزاد صاحب آ گئے، ان سے بھی تعارف ہوا، بات تو کئی بار فون پر ہو چکی تھی، انور کے کہنے پر آزاد صاحب کچھ شاپنگ کرنے چلے گئے!

انور نے بتایا کہ آزاد بھائی میری طرح اسٹوڈنٹ ہیں اور ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ ہم دونوں جاپانی زبان کا ڈپلوما کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میرا پروگرام آٹوموبائیل انجینئرنگ کرنے کا ہے۔ ہم لوگ پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہے ہیں کیوں کہ ٹوکیو کی مہنگائی کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے'' میں نے فوراً لقمہ دیا

نہیں مجھے اس مہنگائی کا خوب اندازہ ہو چکا ہے ـــــ انور نے ہنستے ہوئے کہا ''حضور ابھی تو آپ آئے ہیں، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! میں نے کہا کہ مہنگائی تو بے پناہ ہے مگر لوگ اچھے لگتے ہیں۔ میں نے پولیس والا واقعہ سنایا۔ پتہ چلا ایسی پولیس چوکی ہر چوراہے پر موجود ہے اور یہ لوگ بڑی خندہ پیشانی سے راہنمائی کرتے ہیں۔ میں نے کہا لگتا ہے یہاں جرائم کم ہیں اور پولیس والے کارِخیر میں لگا دیئے گئے ہیں ۔انور بولے، ہاں کلکتہ اور نیو یارک کی طرح نہیں مگر انڈر ورلڈ والے کسی بڑے شہر سے کم نہیں ،مگر عام پبلک امن پسند اور ایماندار ہے۔

آزاد صاحب لدے پھندے شاپنگ کر کے لوٹے۔ انور نے کہا بھائی آپ فریش ہو جائیں ، جب تک ہم کچھ کھانا تیار کرلیں۔ میں نے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ مجھے ہانگ کانگ کے چُن کنگ مینشن والے باتھ روم یاد آ گئے۔ جاپانی باتھ روم سائز میں اتنا سا ہی بڑا تھا مگر صاف ستھرا ،گرم اور ٹھنڈے نل کے علاوہ ایک اسٹیل کا چوکور ٹنکی نما ٹب بھی تھا۔ میں نے لٹیا ڈبو ڈبو کر دیسی اسٹائل میں خوب نہایا اور لباس تبدیل کر کے باہر آ گیا! ارے! بہت جلد فارغ ہو گئے۔ آپ نے شاید ہاٹ ٹب کا استعمال نہیں کیا،انور نے پوچھا! اچھا آپ اسے ہاٹ ٹب کہتے ہیں اور استعمال سے کیا مراد ہے،نہا تو لیا بھائی۔ انور میاں مسکرائے ـــــ نہانے کے بعد اس ٹب میں اتر کر بیٹھتے ہیں بڑا آرام ملتا ہے ـــــ مگر اس میں بیٹھتے کیوں کر ہو! میں چھ فٹا انسان اس میں سماتا کیسے بھائی۔ جاوید بھائی! جاپانی لوگ اسی طرح نہاتے ہیں اور یہ ٹب ان کے قد کے مطابق ٹھیک بھی ہے ـــــ میرے مسکرانے کی باری تھی۔ جی ہاں، اسی لیے اکثر جاپانی شرٹ کی آستین مجھے چھوٹی پڑ جاتی ہے اور میں اکسٹرا لارج خریدتا ہوں ـــــ اچھا آپ لوگ اب آ جائیں، کھانا تیار ہے۔ آزاد صاحب نے آواز لگائی!

ہم لوگ اپنی باتیں چھوڑ کر کھانے کی میز کے گرد جمع ہو گئے۔ ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ میز ہلنے لگی۔ مجھے لگا کہ میرا جیٹ لیگ ہے اسی لیے چیزیں ڈولتی لگ رہی ہیں ـــــ دوسرا نوالہ اٹھا رہا تھا کہ سالن کا پیالہ چھلک پڑا۔ اب تک انور خاموش تھے مگر آزاد صاحب کے لب ہل رہے تھے۔ پہلے میں سمجھا کہ بھائی نیک مسلمان ہے، کھانے سے پہلے کی دعا پڑھ رہا ہے۔ مگر اب دعا کی جگہ آزاد صاحب تھوڑی اونچی آواز میں کسی کلمہ کا ورد کرنے لگے۔ پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا کیوں کہ قرأت کا لہجہ بنگلہ دیشی تھا اور مصیبت میں ہر عقل مند آدمی اپنی مادری بھاشا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انور میاں بڑے تسلی دینے والے انداز میں مسکرائے اور بولے زلزلہ ہے! کیا ـــــ نوالہ میرے حلق میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ حیرت

بھی ہوئی کہ یہ لوگ بیٹھے کیوں کر ہیں اور باہر بھی شور شرابا نہیں —— کمرے میں مکمل سناٹا تھا، تھوڑے تھوڑے وقفے سے دیوار پر کلینڈر کھڑکھڑانے اور دریچے کے شیشے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ وحشت کوئی ایک منٹ جاری رہی، پھر سب معمول پر تھا۔ انور بڑی دیر کے بعد بولے، یہ تو اکثر ہوتا رہتا ہے، مگر آج آپ کے آنے کی خوشی میں زمین کچھ زیادہ جھوم اٹھی۔ سب ہنس کر اپنے خوف کو چھپانے لگے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جاپانی ایسا مکان بناتے ہیں کہ زلزلے کے جھٹکے سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لکڑی کے یہ مکان لوہے کے فریم پر کھڑے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا کہ زلزلے سے شدید نقصان ہوا ہو۔ میں نے پوچھا سال میں کتنی بار آزاد بھائی کلمہ دہراتے ہیں۔ انور نے کہا جناب ہفتے میں کم از کم ایک بار اور مہینے کے دو جھٹکے تو کہیں نہیں گئے۔ مگر آج معاملہ کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں نے اپنے ہوش میں پہلی بار ایسا تجربہ حاصل کیا تھا۔ زمین کا لرزنا اور در و دیوار کا کانپنا پھر تمام تر تسلی کے باوجود میزبان کا رنگ اڑا اڑا سا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ کلکتے والا مجھے یاد آ گیا۔ میں کوئی ۸ر سال کا تھا۔ رات گئے اچانک چیخ و پکار سے سب کی آنکھیں کھل گئیں، میری والدہ نے لپک کر مجھے اپنے کلیجے سے چمٹایا ہوا تھا۔ باہر عورتیں چیخ رہی تھیں، کچھ مرد مومن زور زور سے اذان دے رہے تھے۔ پہلے ہم لوگ سمجھے کہ کوئی فساد ہوا کیوں کہ ان دنوں رائٹ کا دور تھا —— عجیب افراتفری مچی تھی۔ پتہ چلا کہ زلزلہ ہے۔ مجھے اندازہ نہ ہوا کہ زلزلہ کیسا ہوتا ہے کیوں کہ زمین سے زیادہ میری اماں کانپ رہی تھیں۔ آج اندازہ ہوا کہ زمین کیسے لرزتی ہے!

اس دوران ہم لوگ اپنے اپنے خیالوں میں گم خاموشی سے کھاتے رہے۔ ڈنر کے بعد کافی کا دور چلا۔ آزاد صاحب نے موضوع بدلنے کے لیے فلم ''نام'' لگا دی۔ فلم کے ساتھ ہم لوگ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ پتہ چلا آزاد صاحب آٹھ سالوں سے مختلف ممالک کی سختیاں جھیل کر جاپان آئے ہیں، مگر بنیادی طور پر خوش نہیں۔ سسٹم کی خامیاں، تعصب اور مہنگائی - وہ کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا کہ یہ چھوٹی چھوٹی خامیاں اور تکالیف تو ہر ملک میں موجود ہیں۔ آپ یہ دیکھیں آپ چاہتے کیا ہیں۔ رہی تعصب کی بات تو وہ تھوڑا بہت شمالی امریکہ میں بھی موجود ہے۔ مگر ہم لوگ خود کو مین اسٹریم سے جوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ پھر کیا تعصب اور مصیبتیں اپنے وطن میں نہیں۔ مجھے اپنے ''اردو انٹرنیشنل'' والے دوست اشفاق حسین کا شعر یاد آ گیا :

ہم اجنبی ہیں یہاں پر مگر وطن سے کم
دھواں دھواں سا ہے منظر مگر وطن سے کم

اور اگر اتنے حساس ہیں تو معاف کیجیے اپنا محلّہ نہ چھوڑ نا تھا آپ کو! بھائی کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ تو قربان کرنا پڑتا ہی ہے۔اسی دوران فلم کا ایک گیت کم بخت ماحول کو اور بوجھل کر گیا۔''چٹھی آئی ہے......'' گیت بے شک اچھا تھا مگر بہت میلوڈرامیٹک تھا۔زلزلے کا لرزہ اور گیت کا درد لیے محفل برخواست ہوئی —— دوسری صبح ۷ بجے آزاد کو کام پر جانا تھا —— تھکا ہوا تھا اس لیے امید کے خلاف جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔پتہ نہیں کب تک میاں انور اور آزاد صاحبان وطن کی مٹی کو یاد کرتے رہے —— !

☆☆☆

ابھرتے سورج والے مقدس جزیرے

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں سناٹا تھا۔ بھائی لوگ کہیں نکل چکے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔آٹھ بج چکے تھے۔سردی کافی تھی۔میں نے بڑی مشکل سے خود کو چائے بنانے پر تیار کیا۔پانی کیتلی میں رکھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔باہر ہر سو سفیدی کی چادر بچھی تھی۔شاید ساری رات شدید برف باری ہوئی تھی۔اب بھی ہلکی برف کی پھوار سی پڑ رہی تھی مگر فضا میں ایک گہری خاموشی تھی۔ایک الوہی دھند نے صبح کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔افق کی سرحد پر کہرا ہی کہرا تھا۔زمین اور آسمان کو تقسیم کرنے والی خط کہیں گم تھی۔بس سفیدی تھی چار سو۔سفید زمین،سفید آسمان،سفید عمارتیں اور سفید کاٹج کی چھتیں،کہیں کہیں اُڑتے سفید پرند —— ایک عجیب پراسرار سکوت!

میرے ذہن کے دھندلکے میں ایک سفید باریش —— بوڑھے شنتو کاہن کی شبیہ ابھر رہی ہے، کانوں میں اس کی آواز گونج رہی ہے۔ایسی ہی ایک کہر آلود صبح ابتدائے آفرینش سے پہلے آسمان وزمین ایک تھے اور محض انتشار تھا،ایک بے چینی —— پھر ایک لطیف حصہ اوپر اٹھا اور آسمان بن گیا،ایک ٹھوس حصہ نیچے گرا اور زمین کی تشکیل ہوئی —— ان دونوں کے درمیان ایک روشنی ابھری —— جو خدا تھا! پھر چار دیوتا اور پیدا ہوئے —— ان سے مزید سات دیوتاؤں نے جنم لیا،ان کی آخری اولادیں ازانگی دیوتا اور ازانامی دیوی تھیں۔ان آخری دیوتاؤں کی اولاد جاپان ہے۔سمندر پر تیرتے یہ پُرسکون جزیرے جن کی تعداد آٹھ تھی' دیوتاؤں کے حکم سے پیدا ہوئے تھے۔پھر ازانگی اور ازانامی دیوی کے یہاں جاپانی نسل نے جنم لیا —— ان کی پہلی اولاد سوریہ دیوی اور چاند دیوتا تھے۔ان دونوں کے یہاں وہ سارے دیوتا پیدا ہوئے جن کی حکمرانی ساری کائنات پر ہوئی،ازانامی اگنی دیوی کو جنم دے کر مرگئی' اس غم کی تاب نہ لا کر ازانگی بھی موت کی وادی میں روپوش ہو گیا —— جب زمین اور آسمان ایک دوسرے سے دور ہو گئے تو سوریہ دیوی نے اپنے پوتے جموتینو کو جاپان کا پہلا شہنشاہ بنا کر دنیا میں بھیجا۔جاپان کا شہنشاہ سوریہ دیوی کا بیٹا ہے' جاپانی دیوتاؤں کی اولادیں —— یہ جزیرے مقدس جزیرے ہیں!

ایک سیٹی کے شور نے میرے جاپانی دیومالائی تسلسل کو توڑا۔گھوم کر دیکھا چائے کی کیتلی آواز دے رہی تھی۔میں نے چائے بنائی،ایک گھونٹ لیا۔خشک حلق میں گرم چائے نے تازگی بخشی۔قریب ہی کسی پگوڈا میں گھنٹا گونج رہا تھا۔باہر برف باری پھر تیز ہو گئی تھی۔بوڑھا کاہن کہیں غائب ہو چکا تھا!

میں صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر نکلا تو دیکھا کہ میاں انور رین کورٹ اور کانوں میں مفلر لپیٹے ہوئے ہاتھوں میں ایک بھراپُرا لفافہ لیے ہوئے داخل ہوئے۔ صبح بخیر حضور! آپ جاگ گئے؟ لگتا تو ہے کہ جاگ رہا ہوں ـــــ تو پھر ناشتے کے لیے تیار ہو جایئے۔ انور نے لفافے سے ڈبل روٹی، شہد اور دودھ کا ڈبہ نکالا۔ ڈبل روٹی واقعی ڈبل اور اچھی تھی مگر دس بارہ کی جگہ صرف چھ سلائس تھیں، بھاری بھر کم۔ بس دو سے طبیعت سیر ہوگئی۔ میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے چائے کی فرمائش کی۔ ہاں صاحب، اب بتایئے کیا پروگرام ہے، انور نے پوچھا۔ میں نے باہر دیکھتے ہوئے کہا' یار وہ موسم ...... بھئی موسم کو آپ بھول جائیں۔ کیا کینیڈا میں اس سے کم برف باری ہوتی ہے؟ ٹھیک ہے میں بس پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں!

ایکومینشن سے دس منٹ کی واک پر ہیگاشی جوجو اسٹیشن تھا۔ برف باری کے باوجود ٹوکیو کی صبح نہ صرف بیدار تھی بلکہ حرکت میں تھی، بالکل شمالی امریکہ کے کسی شہر کی طرح! یہ علاقہ ٹوکیو شہر سے کوئی چالیس منٹ کی دوری پر تھا۔ یہاں ہائی رائز عمارتیں زیادہ نہ تھیں۔ بیشتر مکان چار یا پانچ منزلہ یا پھر کاٹج نما لکڑی کے گھر، گلیاں سجی سجائی۔ پتہ چلا موسمِ بہار کی آمد آمد ہے۔ اسی لیے گھر، بازار، گلیاں، چوراہے پر کاغذ کی جھنڈیاں اور لالٹین۔ ساتھ ہی سلک کے پھولوں سے آرائش کی گئی تھی ـــــ ٹکٹ کی مشین پر ایک نقشے میں تمام اسٹاپ اور اس کی قیمتیں درج تھیں مگر سارا معاملہ جاپانی میں تھا' بڑی بوریت ہوئی۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ انور بول پڑے، کہیں بھی جانے کے لیے آپ ۱۲۰ ر ین کا ٹکٹ مشین سے خرید لیں۔ آپ جس اسٹیشن پر اتریں گے وہاں گیٹ پر ٹکٹ کلکٹر آپ سے کم بیش کا حساب کر لے گا۔ اس میں کسی خفت کی ضرورت نہیں' ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے۔ تین اسٹاپ تک ۱۲۰ ر ین اس کے بعد مختلف اسٹاپ کے مختلف ٹکٹ ہیں جو ۵۰۰ ر ین تک جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی ہمارے یہاں کسی بھی سب وے میں ایک ڈالر کا ٹوکن لے کر بیٹھ جاؤ اور شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاؤ، ٹکٹ وہی ڈالر کا ہوتا ہے' بلکہ گر ہفتے بھر (اپنے رسک پر) سب وے سے نہ نکلو تو ٹکٹ اتنے ہی کا رہے گا۔ اسی لیے نیویارک میں بہت سے بے کار لوگ گھر کی بجائے سب وے میں زندگی بسر کرتے ہیں ـــــ جناب یہ ٹوکیو ہے۔ دنیا کا مہنگا ترین اور بہترین شہر۔ انور صاحب نے وکالت کی!

ٹوکیو اور مضافات میں تقریباً ۲۵ ر ٹرین پرائیوٹ کمپنیاں چلا رہی ہیں' ساتھ ہی کوئی ۸ ر مختلف زمین دوز سب وے دوڑ رہی ہیں۔ ہر ریل اور سب وے اپنے رنگ سے پہچانی جاتی ہے۔ یعنی لال، پیلی، سبز، نیلی، گلابی وغیرہ۔ یہ ٹرین سروس ہر منٹ پر دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ بس، ٹیکسی اور ٹرام کار ـــــ کلکتے

کی طرح دم توڑتی اور رینگتی ٹرام نہیں بلکہ خوبصورت اور تیز گام! ہم لوگ نیلی ٹرین جے آر یعنی جاپان ریلویز کا انتظار کررہے تھے۔منٹ نہیں گزرا کہ ریل آ گئی۔ہم لوگ سوار ہوئے۔دن کے گیارہ بج رہے تھے' پھر بھی ٹرین بھری ہوئی تھی۔سیٹ پر بیٹھتے ہی ہم باہر کے مناظر میں کھو گئے۔کہرا چھٹ چلا تھا! ابھرتے سورج کا دیس میرے سامنے حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔برف باری تقریباً بند ہو چکی تھی۔سورج کی شوخ کرنیں سفید برف پر دھنک رنگ بکھیر رہی تھیں۔جدید عمارتوں کے شانہ بشانہ قدیم طرز کے کاٹج اور پگوڈا ہمارے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ہر سو ہریالی برف کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔خاص برانڈ نام جیسے سونی، پینا سونک، ہٹاچی وغیرہ کے بورڈ انگلش میں تھے مگر زیادہ تر نام اور بورڈ جاپانی میں تھے۔ اسٹیشن کے نام انگلش میں تھے مگر چھوٹے سے۔اب یہ آپ کا کام ہے کہ اسے ڈھونڈ کر پڑھ لیں!

وینو اسٹیشن پر ہم لوگ اتر گئے، بڑی گہما گہمی تھی ــــ معلوم ہوا یہ جنکشن ہے اور تقریباً ہر جگہ کے لیے گاڑی یہاں سے مل جاتی ہے۔باہر نکلے' سامنے ایک بہت بڑا پارک تھا''وینو پارک''انور نے کہا کل ہم لوگ یہاں آئیں گے۔ویسے آج آپ نے کہاں چلنے کو کہا تھا؟ ابھی میں نے بتایا کہاں ــــ بھئی آپ تو رہے رہے کہیں گم ہو جاتے ہیں،انور میاں نے شکایت کی۔ہاں یار میں تمہارے جاپان کے ماضی اور حال میں الجھا ہوا تھا۔خیر خوب پہنچے بھائی ٹوکیو!

میں نے ٹوکیو یونیورسٹی چلنے کو کہا۔انور نے ٹیکسی روکی اور ہم چل پڑے۔یہ سب سے پہلے یونیورسٹی کی کیا سوجھی آپ کو ــــ چلو تو سہی جگر' تمہیں کچھ گریٹ لوگوں سے ملواتے ہیں۔جیسے؟ انور نے فوراً پوچھا۔اردو کے جاپانی پروفیسر حضرات سے۔کیا' اردو کے پروفیسر اور وہ بھی جاپانی؟ بھائی مجھے یہاں رہتے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا۔آج پہلی بار آپ سے سن رہا ہوں کہ...... تمہیں واقعی نہیں معلوم کہ یہاں اردو پڑھائی جاتی ہے ــــ بالکل نہیں ــــ خیر آج دیکھ لینا!

ٹیکسی ایک قدیم محل نما عمارت کے سامنے صدر دروازے پر رکی۔مجھ سے پہلے انور نے بل ادا کیا۔ہم اپنا کیمرہ سنبھالتے ہوئے اترے۔مطلع صاف تھا مگر سردی بہت تھی۔بھیگی ہوا چہرے پر کھل رہی تھی' تو یہ ہے جناب ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان کی سب سے پرانی اور معروف درس گاہ صدر دروازے سے کچھ پرے ایک پرانا طرز کا چوبی گیٹ تھا جسے آکامن یا لال دروازہ کہتے ہیں۔یہی اس درس گاہ کا نشان بھی ہے۔اس کی تعمیر معلوم ہوا ایڈو عہد میں ہوئی تھی۔ایک پتھر پر جاپانی میں کچھ تحریریں کندہ ہیں تھیں جن میں صرف ۱۸۷۷ء کا سن پڑھا جا سکتا تھا۔یعنی یہ اس کی سنِ تعمیر ٹھہری ــــ مجھے بے اختیار مادرِ درس گاہ علی گڑھ کی یاد آ گئی۔اس کی طرح یہاں بھی لان کے سبزے اور پھولوں کے تختے قرینے سے بچھے تھے اور

دور دور تک ہرے بھرے درخت ایستادہ تھے۔ سامنے سے کچھ طلباء اپنی فائلیں سنبھالے چلے آ رہے تھے۔ انور نے پہلے جھکتے ہوئے انھیں صبح کا سلام پیش کیا اور پھر لگے فر فر جاپانی بولنے ـــــ طلباء کے تاثر سے پتہ چلتا تھا کہ انھیں نہیں معلوم ـــــ دوبارہ سارے لوگ جھکے اور وہ لوگ آگے چلے گئے۔ انور نے کہا کہ بھائی یہاں کوئی اردو کا شعبہ نہیں ہے۔ ہم لوگوں نے کئی لوگوں کو روک کر معلوم کیا مگر ہر کوئی ''سیما سین'' یعنی معذرت چاہتا' اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ اچھا یہاں کوئی اور یونیورسٹی بھی تو ہوگی۔ میں نے پوچھا! جی ہاں' ٹوکیو میں صرف ۲۵۰/ یونیورسٹیاں ہیں جن میں چھ بڑی اور مشہور ہیں۔ میں نے دوبارہ مسکراتے ہوئے پوچھا' یار یہ لوگ تکلف اور علم دوستی میں مدرسے اور اسکولوں کو بھی یونیورسٹی تو نہیں کہتے؟ انور ہنسنے لگے۔ نہیں بھائی صاحب' خالص یونیورسٹی کو ہی یہ لوگ یونیورسٹی کہتے ہیں۔ اگر واقعی اتنی یونیورسٹیاں اس شہر میں موجود ہیں تو پھر انگلش بولنے میں کیا قباحت ہے یار' یا پیرس کی طرح یہاں بھی انگلش سے لوگ بیزار ہیں ـــــ نہیں یہ خود کفیل قوم ہے۔ دنیا بھر کے ادب، ثقافت و سائنس کا انھوں نے جاپانی میں ترجمہ کر رکھا ہے۔ جب انگلش کے بغیر کام چل سکتا ہے تو اس کی محتاجی کیوں؟ ساتھ ہی یہ انگریزی زبان و کلچر کے شوقین بھی بہت ہیں' مگر دیسی کی طرح بولنے میں تکلفاً گھبراتے ہیں، لکھنے پڑھنے میں ٹھیک ٹھاک ہیں

اچھا ایک کام کرو' لائبریری کا پتہ معلوم کرو۔ وہاں کوئی کتاب اردو کی ضرور ہوگی۔ بہت ڈھونڈنے کے بعد لائبریری ملی۔ گیٹ پر ایک اسٹینڈ میں چھتری رکھنے کا اہتمام تھا۔ اپنی چھتری کھڑی کر کے انور نے تالا لگایا اور چابی مجھے دے دی۔ اس طرح غلطی سے کوئی ایک دوسرے کی چھتری نہیں لے جاتا۔ مجھے یاد آیا جاپانی کیلنڈر میں لڑکی ہمیشہ روایتی کیمونو لباس اور چھتری میں نظر آتی ہے۔ ویسے چھتری ہمارے بنگالی بابو بھی خوب استعمال کرتے ہیں مگر اسے رکھنے کا ایسا قرینہ کوئی جاپانیوں سے سیکھے۔

عام طور سے ریسیپشن پر بیٹھی لڑکیوں کو فون کے علاوہ کسی اور چیز کا پتہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں کی دوشیزہ کو بھی اپنے مطلب کی بات کے سوا کچھ پتہ نہیں تھا۔ امریکہ ہوتا تو لونڈیا کندھے اچکا کر کہہ دیتی "I don't know" قصہ ختم۔ مگر اس جاپانی بچی نے کم از کم اتنا کیا کہ فون کر کے اپنے لائبریرین صاحب کو بلا لیا کہ جلدی آؤ۔ کسی اور سیارے کی مخلوق عجیب و غریب سوال کر رہی ہے۔ حضرتِ لائبریرین سہمے سہمے سے وارد ہوئے۔ انور نے پہلے جھک کر آداب کہا۔ جواب میں وہ بھی جھکے اور ان کے جواب میں مجھے بھی رکوع میں جانا پڑا۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے ہماری بات سنی' پھر کچھ سوچ کر گردن نفی میں ہلانے لگے' پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تین منٹ کے بعد پوچھا پروفیسر کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا سوزوکی ـــــ وہ مسکرا کر انور سے بولے سوزوکی تو خاندانی نام ہے۔ ان کا پہلا نام کیا ہے' مجھے

پہلا نام یاد نہ تھا اور قطعی اندازہ نہ تھا کہ معاملہ اتنا طول پکڑ لے گا۔ میں نے کہا انور! سوزوکی گاڑی والوں کے خاندان کا کوئی مردِ مومن ہوسکتا ہے۔ خاندانی دولت اور گاڑیوں سے بیزار ہوکر نکل پڑا اور آخر میں اردو کی مالا جپ کر نروان کی تلاش میں ہو —— یار ایسے شخص کی خبر تو ہر خاص وعام کو ہونی چاہیے۔ آفرین ہے کہ مسٹر ہارادا ہمیں چھوڑنے پر بھی رضامند نہ تھے۔ انھوں نے پھر پوچھا اور شعبہ کیا بتایا تھا —— میں نے کہا ''اردو'' —— ایسا لگا وہ پہلی بار سن رہے ہوں۔ میں نے وضاحت کی۔ انڈین پاکستانی لینگوئج اردو —— وہ فوراً اٹھے اور اپنے کمپیوٹر پر کچھ ٹائپ کیا۔ کچھ ہی دیر میں پروفیسر سوزوکی اسکرین پر چمک رہے تھے اور مسٹر ہارادا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پتہ چلا کہ شعبۂ اردو تو ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں ہے جو انور کے علاقے کیٹا کو میں ہی ہے اور ہم اسے یہاں تلاش کر رہے تھے۔ مسٹر ہارادا نے ایک پرچی پر پتہ اور فون نمبر لکھا اور اس کی پشت پر نقشہ بنا کر انور کو جاپانی میں سمجھانے لگے۔ اب تک ہم لائبریرین کا کوئی گھنٹہ برباد کر چکے تھے۔ اس دوران کئی لوگ آ کر دروازے سے واپس ہوئے' مگر جوان ہماری مشکل آسان کرنے میں ایسے لگے رہے گویا خضرِ راہ کا کنٹراکٹ لے رکھا ہو! ہم لوگوں نے رکوع تک جھک کر شکریہ ادا کیا۔ انور نے ''دوموآری گاتو گزائی ماس'' کہا۔ جاپان کا یہ شکریہ اتنا لمبا تھا کہ اب تک مجھے یاد نہ ہوسکا تھا۔ میں نے جھکتے ہوئے تھینک یو کہہ دیا —— میں جاپانیوں کی شرافت کا قائل ہوگیا تھا —— مگر میں سوچ رہا تھا کہ دن میں میری طرح دوتین ان کے پاس آگئے تو یہ اپنا کام کرب کرتے ہوں گے —— شاید جاپانیوں نے اخلاقیات کو بھی اپنے روزانہ کے معمول میں شامل کرلیا ہے!

ہاں تو پیارے وہ سیکڑہ کے حساب سے کون سی یونیورسٹیاں تم بتا رہے تھے' میں نے انور کو ٹہوکا دیا۔ بھئی سب کے نام تو ہمیں یاد نہیں۔ ہاں چھ یونیورسٹیاں اس لیے معلوم ہیں کہ ان کے ناموں سے یہاں کے چھ مشہور بیس بال گروپ بھی ہیں۔ جیسے رکویو، واسیدا، ٹوکیو، ہوسی، میجی اور کی او یونیورسٹی۔ ان کا مقابلہ سال میں دوبار آوایاما کے مقام پر ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا یہ لوگ جوڈو، کراٹے اور کُشتی چھوڑ کر بیس بال کیسے کھیلنے لگے۔ یہ تو امریکہ کی نچ ہے —— درآمد شدہ کھیلوں میں یہ بہت مقبول ہے۔ کشتی دیکھیے گا؟ جی ٹی وی پر دیکھا تھا وہی کافی ہے —— نہیں صاحب یہاں آکر کشتی نہ دیکھی تو......اچھا بھائی موقع ملا تو دیکھ لیں گے۔ اب ذرا سوزوکی صاحب کو فون کرو!

فون کی بات پر انور صاحب سمجھانے لگے کہ یہاں عموماً دو طرح کے پبلک فون ہوتے ہیں۔ ایک میں سکہ ڈال کر بات ہوتی ہے' دوسرے میں کریڈٹ کارڈ استعمال ہوتا ہے اور یہ کریڈٹ کارڈ ۵۰۰ ین

سے لے کر ۱۰۰۰ ین تک کا کسی بھی اسٹوڑ سے مل جاتا ہے۔ سکے والا فون سرخ، پیلا اور نیلا ہوتا ہے جب کہ کارڈ والا سبز رنگ کا ہوتا ہے۔لوکل کال کے لیے صرف دس ین کا سکہ کافی ہے اور جیب سے کارڈ نکال کر دکھایا کہ یہ کریڈٹ کارڈ ہے۔ میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا شکریہ' ویسے مجھے یہ باتیں معلوم تھیں' میرے ٹوکیو کے نقشے میں درج ہیں ___ پھر آپ نے بتایا کیوں نہیں؟ تمہاری تقریر اچھی لگ رہی تھی ___ پھر ہم دونوں اپنی اپنی طرح سے ہنس پڑے!

انور کے کارڈ کے طفیل' یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کا نمبر 611-917-03 ملایا۔آپریٹر سے معلوم ہوا سوزوکی صاحب چھٹی پر ہیں۔ میں نے انور کو فون دیا اور کہا پوچھو سوزوکی صاحب تنہا اس شعبے کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں یا کوئی اور بھلا مانس بھی ان کے ساتھ ہے ___ مدعا جاپانی میں پیش کیا گیا اور لائن پروفیسر اسادا سے ملا دی گئی۔انور نے فون واپس مجھے تھما دیا۔''موشی موشی'' دوسری طرف سے ایک رعب دار آواز آئی۔ میں نے ہیلو کہتے ہوئے بات اردو میں شروع کی ___ حضور خاکسار کو جاوید دانش کہتے ہیں ___ حضور آداب، مزاجِ گرامی۔اسادا صاحب شستہ اور دھلی دھلائی اردو میں ہم کلام ہوئے۔اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو میں آپ کو جانتا ہوں۔ زہے نصیب! شاید آپ نے کہیں تلاشِ گم شدہ میں میرا نام پڑھا ہوگا ___ نہیں صاحب آپ کی کتاب پڑھی ہے' کیا نام تھا؟ بھئی وہی ڈراموں کا مجموعہ ___ میں نے جلدی سے کہا ''پرومیتھیس''۔جی وہی۔ ہماری لائبریری میں بھی موجود ہے۔(رائٹر چاہے مجھ جیسا گیا گزرا ہو مگر اپنی کتاب کے ذکر سے پھولے نہیں سماتا۔ میرا بھی استادوں کا سا حال ہوا چاہتا تھا مگر میں نے خود کو سنبھالا) آپ نیویارک سے تشریف لا رہے ہیں نا؟ نہیں جناب ابھی تو اِنڈیا سے واپس آ رہا ہوں اور نیویارک نے مجھے تین سال پہلے چھوڑ دیا۔اب میں ٹورانٹو میں ڈیرہ ڈالے ہوا ہوں ___ اچھا تو پھر ہمارے یہاں کب تشریف لا رہے ہیں؟ حضرت میں تو آپ لوگوں سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔ دیکھیے نا اس خراب موسم میں بھی آپ کو ڈھونڈنے نکل پڑے ___ ویسے سوزوکی صاحب کیا چھٹی پر ہیں ___ جی ہاں' آپ وقت دیں تو میں سوزوکی صاحب اور ہمارے مہمان پروفیسر رئیس صاحب سے آپ کو ملواتا ہوں ___ اچھا' میری ملاقات رئیس صاحب سے نہیں ہے مگر ان کا نام سنا سا ہے' کراچی سے تعلق ہے نا ان کا ___ جی ہاں۔ٹھیک ہے اسادا صاحب پرسوں دوپہر ملاقات ہوگی' بہتر حضور ہم سب چشم براہ ہیں!

انور نہ صرف بڑے صبر سے فون کے میٹر کو دیکھ رہا تھا جس میں ۲۰۰ ین جھلملا رہے تھے' بلکہ بڑی حیرت سے ہماری باتیں بھی سن رہا تھا —— کمال ہے' جاپانی اور اتنی بامحاورہ اردو —— کیوں بھئی میری بامحاورہ انگلش پر آپ نے کبھی حیرت نہیں کی —— ہم لوگ پھر ہنسے —— ویسے میاں سال ڈیڑھ سال میں تم نے ماشاءاللہ بڑی اچھی جاپانی سیکھ لی ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے —— ہاں بول تو لیتا ہوں مگر ابھی بھی لکھنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ بھائی آپ اس زبان کی پیچیدگی کا اندازہ نہیں کر سکتے!'' چلئے کل آپ کو اپنے اسکول لے چلتے ہیں اور اپنے دوستوں سے ملواتے ہیں۔

میں نے پہلے آسمان پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ موسم قدرے سنبھل چکا تھا۔ دوپہر کے دو بج چکے تھے۔ میں نے انور سے کہا چلو کچھ جل پان کر لیا جائے' مگر جاپانی —— انور بیچ میں بول پڑے' لنچ نہیں —— آپ کیا اچھے اچھے یہاں کے کھانے کو جلد نہیں اپناتے۔ میں نے تمہارے ''سوشی'' کو ایک بار چکھا تھا' پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی! مگر آپ کے امریکن آج کل یہاں کے پکوان کو خوب سراہ رہے ہیں' انور نے بتایا —— یار امریکیوں کو تجربہ کرنے کا خبط ہے' بس —— وہ کم بخت دیسی دال کو بھی اتنے ہی چاؤ سے کھاتے ہیں جیسے مرغن قلیہ شاہی —— مگر امریکن فاسٹ فوڈ نے ان دنوں پورے جاپان میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ تھوڑے عرصے میں ''میک ڈانلڈ'' کے ہیمبرگر کی وبا پھیلی پھر شکی پیزا ہر کسی کی زبان پر تھا۔ اب تو طرح طرح کے جنک فوڈ جاپانیوں کے نیشنل ڈائیٹ میں اپنی جڑیں جما چکے ہیں۔ پچھلے دنوں شاہ راہ گنزا والے میک ڈانلڈ نے دعویٰ کیا کہ وہ لوگ نیویارک بلکہ ساری دنیا سے زیادہ ''بگ میک'' اپنے ٹھیے سے بیچ رہے ہیں —— اچھا اب تقریر ہی کیے جاؤ گے یا کچھ کھانے کا ارادہ بھی ہے! چلیے حضور میں تو آپ کو کام کی باتیں بتا رہا تھا۔ آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ کچھ لکھنا ہے —— وہ ہے تو مگر پہلے کھانا یعنی فاسٹ فوڈ لیتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا ''ایم'' میک ڈانلڈ کا پتہ بتا رہا تھا۔ ہم لوگ خراماں خراماں اس کی طرف چل پڑے۔ ایک لمبی قطار لگی تھی۔ ہم بھی اس میں شامل ہو گئے۔ میاں انور پتہ ہے یہ قطار یا کیو لگانے کا چلن انگریزوں نے تہذیبی آرٹ فارم بنا کر ہم لوگوں پر لاد دیا' پھر روس نے دیکھا دیکھی اس کی نقل کی اور یہ ان کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ آخری سرے پر کیا ہے سوچے بغیر وہاں لوگ کیو میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈسپلن کی اس سے عمدہ مثال کیا ہو سکتی ہے —— مگر تمام ڈسپلن کے باوجود دیسی لوگ اس چلن کو اپناتے ہوئے اب بھی جھجکتے ہیں۔ یار آزادی کی بھی اس سے بڑی مثال

نہیں ملے گی ـــــ ہم لوگ آزاد جو ٹھہرے!

ٹوکیو میں بھی اس فیشن کو عام ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ انور بتانے لگے اور شاید اس کی ذمہ داری ہابسن آئس کریم پارلر کو جاتی ہے۔ جاپانیوں کو آئس کریم کھانے میں اتنا مزہ نہیں آتا جتنا کیو میں کھڑے رہنے میں آتا ہوگا۔ اب تو یہ ایک طرح کا ''سیمی پرمانٹ انسٹی ٹیوشن'' کے طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ گرمی، برسات، سردی، رین کورٹ اور چھتریوں میں لوگ کیو میں کھڑے ہیں، بلکہ گھنٹوں کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آتے جاتے راہ گیر بھی قطار میں شامل ہوجاتے ہیں ـــــ میں نے لقمہ دیا یعنی ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'' والا معاملہ ـــــ حضور اب تو لفظ ''کیو'' کا ایک الگ چارم ہے۔ نئی نسل کے جوان لڑکے لڑکیاں اسی طرح سے اپنی ''ڈیٹ'' تلاش کر لیتے ہیں۔ کئی تو بغیر خرچ کے گھنٹہ بھر گفت وشنید کا بہترین بہانہ نکال لیتے ہیں۔ کئی جوانوں نے اسے میٹنگ پلیس بھی بنا رکھا ہے۔ اس طرح آئس کریم والوں اور امیدوار جوڑوں کا ملا جلا فائدہ ہو رہا ہے اور کیو کے فوائد روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں!

''موشی موشی'' سے ہم لوگ چونکے۔ ہمارا نمبر آچکا تھا۔ کاؤنٹر کی لڑکی نے ایک فوٹو والا کارڈ آگے بڑھا دیا جس پر تصویر اور قیمتیں درج تھیں۔ شاید ٹورسٹ کی آسانی کے لیے یہ سب اہتمام تھا۔ ویسے دیوار پر مینو لگا تھا مگر جاپانی میں ـــــ میں نے چیز برگر، فرنچ فرائز، کوک اور کافی کا آرڈر دیا۔ انور نے بھی ''سیم'' کہہ دیا۔ ۱۲۰۰ رین لڑکی نے لکھ کر بتایا۔ میں نے ہزار کے دو نوٹ دیے۔ چینج لیا، ٹرے اٹھائے اور جگہ ڈھونڈنے لگا ـــــ بہت بھیڑ تھی۔ ہمیں دوسری منزل پر جگہ ملی۔ برگر کا مزا بالکل امریکی تھا۔ ساری دنیا میں میک ڈانلڈ والے ایک طرح کا سامان بناتے ہیں۔ مگر یہاں قیمتیں بہت تھیں۔ صرف کافی ۱۸۰ رین کی۔ تقریباً ڈیڑھ ڈالر جب کہ شمالی امریکہ میں آج بھی کافی ۶۰ سینٹ کی ہوتی ہے۔ سنا یہ سب سے سستی کافی ہے۔ جاپانی کیفے میں تقریباً ۳۰۰ رین سے کم کافی کا کپ نہیں۔ یعنی سوا دو ڈالر۔ مطلب صرف چالیس روپے!

میں نے انور سے پوچھا، یار اس قدر مہنگائی ہے۔ لوگوں کی تنخواہیں کیا ہوں گی؟ پتہ چلا ایک عام مزدور کوئی بیس پچیس ہزار روپے مہینے میں کما لیتا ہے، مگر آخیر ماہ تک اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ویسے بھی یہ قوم کچھ شاہ خرچ ہے۔ بس ان کے گرو امریکہ نے یہی تو سکھایا ہے کہ خوب کماؤ اور جی بھر کے خرچ کرو۔ آج کے لیے زندہ رہو۔ کل کس نے دیکھا ہے ـــــ میں نے کہا بھائی میرے، ہم لوگ کل کے چکر میں کچھ زیادہ ہی فکر مند رہتے ہیں۔ کل جو گزر گیا اس کی پریشانیوں کو بھولنے کی کوشش نہیں کرتے اور کل

جوآنے والا ہے‘اس کی الجھنوں کے خوف سے متفکر رہتے ہیں۔اسی شش پنج میں آج کا مزا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ہمیں کل کی فکر کرنی چاہیے مگر آج کو قربان کر کے نہیں۔ مجھے تو آج بھی بھرپور زندہ رہنا ہے اور کل کی تیاری بھی کرنی ہے۔باقی جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا!

بھائی آپ سمجھتے ہیں۔آج خوش رہ کر یہ قوم امریکنوں کی طرح فکر مند نہیں۔شاید ان کی خودکشی کی سالانہ رپورٹ آپ نے پڑھی ہی نہیں —— اچھا مگر یہ قصہ پھر کبھی —— میں مزید بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ہم لوگوں نے فاسٹ فوڈ خوب دیر تک کھایا‘ ٹرے اٹھا کر ویسٹ باکس میں ڈالا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے باہر نکل آئے!!

☆☆☆

جاپانی آموختہ اوراس کی بھول بھلیّاں

اینتھر وپولوجسٹ کہتے ہیں کہ جاپانی ابھرتے ہوئے سورج والے مقدس جزیروں کی قدیم یاماٹو قوم ہے! شاید بحرالکاہل کی بھولی بھٹکی پولی نیزین نسل سے بھی ان کا تعلق ہے۔ چند ماہر لسانیات کا خیال ہے کہ جاپانی زبان کا دنیا کی کسی بھی زبان سے تعلق نہیں، مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ جس طرح اردو نے فارسی سے شیرینی اور عربی سے کچھ قواعد نیز سنسکرت سے تھوڑی گمبھیرتا حاصل کی ہے اسی طرح جاپانی زبان نے چینی حروف اور کردار سے خود کو مرصع کیا ہے۔ چوتھی صدی میں ہی جاپانیوں نے چینی زبان سے صوتی کردار اور نشان مستعار لیا تھا۔ اسے ''کانجی'' کہتے ہیں۔ اکثر ایک کانجی کے ایک سے زیادہ معنی اور تلفظ بھی ہوتے ہیں۔ روایتی جاپانی اوپر سے نیچے یا داہنے سے بائیں لکھتے ہیں مگر اسے انگریزی کی طرح بائیں سے داہنے طرف بھی لکھا جا سکتا ہے۔ لکھائی میں تین طرح کے حروف یا کردار استعمال میں آتے ہیں۔ جیسے 'ہیراکانا' جس کی تعداد ۵۱ رہے' پھر 'کاتاکانا' جس کی تعداد بھی ۵۱ رہے اور 'کانجی' جس کی تعداد کم از کم دو ہزار ہوتی ہے۔ ہر جاپانی طالب علم کو ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے کم از کم دو ہزار کانجی از بر کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر روز مرہ کی زندگی کے لیے اتنا جاننا کافی ہوتا ہے مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے کئی ہزار کانجی کا جاننا ضروری ہے! اس کی تعداد ۴۸۰۰۰ر ہزار تک پہنچتی ہے۔ کانجی یوں تو آسان تصویریں یا عکسی کردار کا نام ہے جس میں ایک خط یا کئی خطوط سے ایک کردار یا نشان سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے تین لائنیں اگر اوپر کو اٹھ رہی ہوں جیسے ''山'' تو یہ ''یاما'' یعنی پہاڑ کا نشان مقصود ہوگا۔ اسی طرح تین لائنیں نیچے جا رہی ہوں جیسے ''川'' تو یہ ''کاوا'' یعنی دریا کا کردار بن جائے گا۔ اسی کو اگر ملا دیں تو یہ جاپانی خاندانی نام ''یاما کاوا'' بن جائے گا۔

اس کا اندازہ تو ہو گیا کہ ''نی ہونگو'' یعنی جاپانی زبان بہت پیچیدہ ہے' خاص طور پر لکھنا بہت مشکل ہے کیوں کہ ایک خط کے چھوٹا بڑا ہونے پر پورے کردار کا مطلب بدل جاتا ہے —— یوں تو اردو میں بھی نقطے کی غلطی سے خدا' جدا ہو جاتا ہے (جو اکثر ہم لوگوں سے ہوا کرتا ہے) مگر کانجی وہ بھول بھلیّاں لگی جس سے نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے!

میں انور کی نی ہونگو کی کتاب لیے دو گھنٹے سے اس کی بھول بھلیّوں میں گم تھا اور زبان کی تہ داریاں اور پیچیدگیاں تو کسی عشقِ پیچاں کی طرح میرے ذہن سے لپٹتی جا رہی تھیں۔ میں جاپانی زبان کے طالب علموں کو بددل نہیں کر رہا بلکہ میں تو ان کی ہمت کی داد دے رہا ہوں کہ کیا صبر آزما زبان کا انھوں نے

انتخاب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت نہیں کہ منزل تک کتنا فاصلہ رہ گیا ہے' اہم بات یہ ہے کہ فاصلہ کتنا طے ہو چکا ہے! آج میں نے اس مقدس جزیرے والی بابرکت زبان کا تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا ۔ویسے ہر ملک میں داخل ہوتے ہی میں اس کی شیریں زبان کا ذائقہ ضرور چکھتا ہوں۔ پیرس گئے کئی سال ہو گئے مگر آج تک فرنچ کا آموختہ نہیں بھولا ــــ ''وی.وی. بوژؤ مرسی بکواور پاغدوں'' ــــ جرمن پر بھی قدرت حاصل ہونے والی تھی کہ میرا ویزا ختم ہو گیا۔اور میں نے رختِ سفر باندھا مگر ''دانکے شرن'' اور ''ناخ لینک اور بی تے'' آج تک نہیں بھولا! تھائی زبان کا سبق تو ابھی پچھلے مہینے لیا تھا۔کون کم بخت اسے بھولا ہے ۔ہانگ کانگ والے میری طرح کنٹونیز کم اور انگلش زیادہ بولتے ہیں' اس لیے اس زبان کو ہم دونوں نے اپنی عافیت کی زبان بنالی ہے۔ رات دن بولتے ہیں مگر دل سے نہیں بولتے ۔کیا کریں ــــ ہم حالاں کہ ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں مادری زبان صرف عید' بقرعید اور مشاعروں میں بولی اور سنی جاتی ہے!

اب ہمارے چند استاد نما ساتھیوں اور سچ مچ کے استاد لوگوں کو شکایت ہے کہ ہم زبان کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔خاک استعمال کریں۔ارے صحیح استعمال تو کسی چیز کا بھی ہم لوگ نہیں کرتے بلکہ کر نہیں پاتے ۔ ہر چیز اپنے بس میں ہوتی کہاں ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ خود کو خوش رکھنے کے لیے بولتے انگریزی اور سوچتے اردو میں ہیں ۔حضور ہمارے اچھے قادر الکلام ساتھی اب سوچتے اردو میں مگر لکھتے انگریزی میں ہیں۔ کچھ اعلیٰ پائے کے ڈاکٹر حضرات صرف نسخے نہیں اب شاعری بھی انگریزی میں کرتے ہیں کہ اردو کا مستقبل تابناک نہیں۔ارے ہمارا مستقبل کون سا تابناک ہے کہ صرف انگلش سے دلدر ہو جائیں گے۔بس لکھ لیتے ہیں۔ بقول غالب :

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

میں خود سے الجھا ہوا تھا کہ انور آ گئے ــــ ہاں صاحب' تیار ہیں آپ؟ جی جناب' بس چلیے' پہلے اسکول چلتے ہیں ۔ میں تیار بیٹھا تھا۔فوراً ہم لوگ نکل پڑے ۔ٹیکسی لی اور پندرہ منٹ میں نی ہونگو انسٹی ٹیوٹ پہنچ گئے ــــ راستے میں انور نے بتایا کہ ان کی ٹیچر ایک مخلص خاتون ہیں۔ وہ مل کر خوش ہوں گی۔ ویسے ٹیچر یا بزرگ کو ''سین سے'' کہتے ہیں۔

تین منزلہ انسٹی ٹیوٹ بھی کمرشیل کالج کی طرح تھا۔ جیسے ہمارے شہر کے ہر محلے میں انگلش بول چال کے اسکول ہوتے ہیں۔ ''سین سے فیوجی کو'' بہت ہی اسمارٹ جوان خاتون تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنے اسکول کی اینگلو انڈین میڈم سوئٹی یاد آ گئیں۔ میں رکوع میں جاتا ہوا کورنش بجالایا۔محترمہ بہت احترام سے ملیں۔ مجھے اسٹاف روم میں لے جا کر مسٹر ہارورڈ جان سے ملوایا اور خود ۱۴ منٹ کی معذرت

کر کے کوئی کلاس لینے چلی گئیں —— میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پتہ چلا کہ مسٹر جان آسٹریلین ہیں اور پچھلے پندرہ سالوں سے ٹوکیو میں مقیم ہیں۔ وہ اس انسٹی ٹیوٹ کے مینیجر اور پارٹنر ہیں۔ میں نے پوچھا آپ تو بہت اچھی جاپانی جانتے ہوں گے۔ مسٹر جان مسکرائے۔ جاپانی بڑی عجیب زبان ہے۔ بولنے میں تو کوئی پرابلم نہیں مگر اب بھی لکھتے وقت الجھ جاتا ہوں۔ پھر اب روایتی یا ماٹو ڈائلکٹ بھی تو نہیں رہے۔ اس میں دنیا بھر کے امپورٹیڈ الفاظ شامل کر لیے گئے ہیں جسے ''گیراگو'' کہتے ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا کیا مطلب؟ مجھے سمجھانے کے انداز یں مسٹر جان بولے ''اس میں چینی کے علاوہ اب انگریزی، فرنچ، ہسپانوی، ڈچ، جرمن اور روسی الفاظ بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر روٹی کو ''پان'' کہتے ہیں (میں نے دل میں سوچا ظالم پان کو کیا کہتے ہوں گے) دراصل یہ پرتگالی لفظ ہے۔ اسی طرح ٹوباکو یعنی تمبا کو بھی پرتگالی ہے۔ ڈچ سے لفظ بیئر لے کر بیورو بنا۔ جرمن سے لفظ'' آربیٹ'' لیا گیا جس کا مطلب کام ہے۔ درآمد شدہ لفظوں میں انگریزی کی بھر مار ہے۔ گو کہیں کہیں اس کی شکل بگڑی ہوئی ہے جیسے ''ورڈ پروسیسر'' (Word Processor) بگڑ کر ''واپورو'' بن گیا۔ پرسنل کمپیوٹر ہو گیا ''پاساکوم'' —— جنرل اسٹرائیک بنا ''زینے سوٹو''۔ اسی طرح پینٹی ہوز بن گیا ''پین سوٹو'' —— مگر اس سے زیادہ مزیدار تبدیلی تلفظ اور معنی میں آئی۔ ''مائی کار'' کی جگہ ''مائی کا'' نے لے لیا۔ سب سے بے تکا مگر کمال کا لفظ ہے رون پاری —— یہ ایک پرانا سلینگ ہے جسے بھٹکے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہ لفظ کہاں سے کہاں جوڑ دیا گیا —— ''رون'' لندن لفظ کا مخفف ہے اور پیرس کے لیے ''پاری''۔ یعنی ایک آنکھ لندن اور ایک پیرس۔ میں نے لقمہ دیا کہ جناب ہمارے یہاں اسے کہتے ہیں ''کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ'' ہم دونوں ہنس پڑے۔ مسٹر جان اپنی عمر سے بہت کم لگے۔ زندگی سے بھر پور بلکہ لگتا ہے کہ وہ ان لفظوں سے بھی بھرے پرے بیٹھے تھے اور میرے اشارے پر ابل پڑے۔

میں نے پوچھا کیا جاپانیوں کے لیے درآمد شدہ لفظوں کا مقروض ہونا ضروری ہے۔ کیا ان لفظوں کا بدل ان کی اپنی زبان میں نہیں؟ کچھ کا بدل تو ہے مگر بیشتر کا نہیں، ساتھ ہی یہ استعمال اب فیشن میں شامل ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہر زبان میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ میں نے ان سے اتفاق کیا اور بتایا کہ ہماری زبان میں بھی درآمد شدہ لفظوں کی کمی نہیں مگر اتفاق کہیے یا ہماری بد قسمتی کہ جاپانی کا کوئی لفظ اب تک ہم درآمد کرنے سے غافل رہے۔ ہم لوگ جاپانی زبان کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے کہ ''میڈم فیوجی کو'' کلاس ختم کر کے آ گئیں۔ آتے ہی انھوں نے کافی یا چائے کے لیے پوچھا۔ مسٹر جان نے فوراً معذرت چاہی کہ آتے ہی مسٹر دانش نے ایسی بات چھیڑ دی کہ بس میں اسی میں مصروف رہا اور کافی کا پوچھنا ہی بھول

گیا۔ میں نے کہا ہماری گفتگو چائے سے زیادہ دلچسپ تھی۔ خیر میں کافی لے لوں گا۔ میڈم نے کافی بنائی ۔ہم لوگوں نے کافی کے دوران اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ کچھ ہی دیر میں انور بھی اپنے کلاس سے واپس آ گئے۔ پھر مجھے اسکول کا ٹور کرایا گیا۔ میں نے سین سے فیوجی کو صاحبہ کو کینیڈا آنے کی دعوت دی اور رخصت چاہی۔ انھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ میں تو نہیں ہاں میری بیٹی کو کینیڈا جانے کا بہت ارمان ہے۔ آج کل پیرس میں وہ کمرشیل آرٹ میں ایم.اے.کر رہی ہے۔ پھر میں نے مسٹر جان کا شکریہ ادا کیا اور کئی سوالات لیے باہر آ گیا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے انور سے پوچھا ''یار تمہاری سین سے کی لڑکی ماسٹرس کر رہی ہے۔ محترمہ کی عمر کیا ہوگی؟ انور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ زیادہ نہیں یہی کوئی ۶۴ ؍سال کی مگر خیریت؟ سنا تھا جاپانیوں کی عمر کا پتہ نہیں چلتا' مگر پھر بھی حد ہوگئی۔ میں تو محترمہ کو ۵۲ ؍سال کا سمجھ رہا تھا۔ بھئی کیا ''مینٹیننس'' ہے' واہ! ویسے یہ الجھن ایک بار بنکاک میں بھی ہوئی تھی —— اچھا اب یہ بتاؤ کہ جاپانی کورس اور نی ہونگو انسٹی ٹیوٹ اور ایسے بے شمار اسکولوں کا کیا ڈراما ہے؟ تمہارے یہاں مشکل سے ۵۰ ؍طلبا نظر آئے۔ اس میں سے دس فیصد بھی سنجیدہ نہیں لگے۔ مجھے اس لینگویج کورس کے پیچھے کچھ اور ہی لگتا ہے ——

مجھے پتہ تھا آپ یہ سوال ضرور کریں گے۔ مگر پہلے یہ بتایئے میں آپ کو سنجیدہ لگ رہا ہوں یا نہیں' انور نے پوچھا۔ جگر میں تمہاری یا تمہارے اسکول کی بات نہیں کر رہا۔ میں عام طور پر کیا ہو رہا ہے وہ جاننا چاہتا ہوں۔ تو بس سمجھ لیجیے کہ یہ بھی ایک طرح کا کاروبار ہے۔ اگر آپ چاہیں کل آپ کا نام لکھوا دیتے ہیں۔ فیس ادا کیجیے اور قانونی طور پر یہاں رہنے لگئے۔ کام کاج بھی کیجیے۔ آپ کی امیگریشن کا دردِ سر اسکول والے سنبھالیں گے —— یعنی سب ملی بھگت ہے' میں نے کہا —— میرے خیال میں اتنا کافی ہے 'انور پیچھا چھڑانے کے انداز میں بولے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا سے کچھ ایجنٹ لڑکوں کو ایک طے شدہ کنٹراکٹ پر لاتے ہیں اور اسکول میں داخلہ دلوانے کے ساتھ فیکٹریوں میں کام بھی دلاتے ہیں۔ اس میں خوب نوچ کھسوٹ اور سیاہ سفید ہو رہا ہے۔ تو جو کچھ سنا تھا وہ سچ تھا —— حیرت اس پر ہوئی کہ غیر قانونی طور پر ہر ملک' خاص کر امریکہ میں بہت سے مہاجر رہ رہے ہیں مگر یہ پڑھائی کا ''اورگنائزڈ'' ڈراما صرف ٹوکیو میں نظر آیا۔ میرے خیال میں جتنے قصوروار ایجنٹ ہیں اتنے ہی ایسے ادارے جوان سب کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ دیسی لڑکوں کے علاوہ فلپینی، انڈونیشین، ایرانی، افریقی اور مصری بھی بہت ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہے ین۔ آج کل ین کافی اسٹرانگ ہے

اور عام طور پر لوگ بیس پچیس ہزار روپئے مہینے کا بنا لیتے ہیں۔ مگر مہنگائی بھی بے پناہ ہے اس لیے ایک کمرے میں کم از کم ۸ لڑکے رہتے ہیں۔

گیہوں کے ساتھ ہمیشہ گھن پستا آیا ہے۔ اس رسّہ کشی میں سنجیدہ طالب علم یا وہ اسٹوڈنٹس جو ایکسچینج پروگرام کے تحت آئے ہیں، انھیں پریشانی بھی ہوتی ہے اور شک کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی مسٹر جان اور فیوجی کو سین سے بھی مخلص ہونے کے باوجود اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

گیسوئے اردو اور گیسو دراز جاپانی گرو

ہم اور انور پروگرام کے مطابق ٹھیک تین بجے ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز پہنچ گئے۔ گیٹ پر ہی استقبالیہ روم میں بیٹھی لڑکی سے میں نے پروفیسر سوزوکی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ابھی وہ فون پر نمبر ہی ملا رہی تھی کہ پیچھے سے کوئی دانش صاحب کہہ کر مخاطب ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ایک شریف النفس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا مجھے سوزوکی کہتے ہیں'' ــــ اور ہم لوگ بغل گیر ہو گئے۔ حضور آپ نے یہ کیسے جانا میں ہی دانش ہوں۔ بھئی مجھے اتنا تو اندازہ تھا کہ شمالی امریکہ میں رہنے سے کم از کم آپ وقت کے پابند ہوں گے۔ بس ٹھیک تین بجے میں لان میں نکل آیا۔ آپ کو آتا دیکھا اور سمجھ گیا ــــ اور سنائیں سب خیریت؟ آپ کی دعائیں شاملِ حال ہیں۔ سوزوکی صاحب نفیس اور شستہ اردو بول رہے تھے۔ میں نے پہلے کسی جاپانی کو اردو بولتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں' اسادہ صاحب کو فون پر سن رکھا تھا ــــ ہمارے کچھ چینی دوست اردو بلکہ ہندی ضرور بولتے ہیں مگر آدھی انگلش بقیہ کھڑی بولی ــــ میں نے انور سے جناب کو ملوایا۔ انور جاپانی میں شروع ہو گئے۔ سوزوکی صاحب بہت خوش ہوئے' کہنے لگے اچھا آپ انٹرپریٹر ساتھ لیے گھوم رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو لیے سوزوکی صاحب اپنے آفس میں آئے۔ پھر ہمیں بٹھا کر ساتھ والے کمرے سے دو حضرات کو لیے داخل ہوئے۔ آپ پروفیسر محمد رئیس علوی اور آپ اسادا یوتاکا۔ ہم لوگوں نے آداب ایکسچینج کیے اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ رئیس صاحب کے آداب میں لکھنوی پن صاف جھلک رہا تھا۔ ہمیں چھوڑ کر سوزوکی صاحب چائے تیار کرنے لگے۔ کہنے لگے آپ نے اپنی چائے کتنے دنوں سے نہیں پی۔ چلیے آج آپ کو الا ئچی والی دیسی چائے پلاتے ہیں۔

میں نے رئیس صاحب سے کہا کہ عجیب اتفاق ہے۔ پچھلے ماہ میں کراچی گیا تو ڈاکٹر حنیف فوق صاحب سے اور پھر شفیع عقیل صاحب سے جاپانی شاعری کے تراجم کی بات ہو رہی تھی جس میں آپ کا ذکرِ خیر بھی رہا۔ مگر مجھے قطعی علم نہ تھا کہ آپ سے اس طرح ملاقات ہو گی۔ رئیس صاحب دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے' مسکرائے اور کہا زہے نصیب کہ ملاقات ہو گئی! حالاں کہ آج کل یونیورسٹی کی چھٹی چل رہی ہے۔ مگر اسادا صاحب نے سب کو ایک وقت جمع کر لیا۔ اسادا صاحب نے کہا دانش صاحب' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کی کتاب والی تصویر میں داڑھی بہت گھنی سرسیّد والی ہوا کرتی تھی ــــ میں نے فوراً کہا حضور کینیڈا میں سردی کم بخت اس قدر پڑتی ہے کہ کچھ شرنک کر گئی ہے۔ ویسے میں ہوں وہی جس

کی آپ نے تصویر دیکھی تھی —— ہاں یاد آیا۔ کتاب کے ساتھ میں نے ایک تفصیلی خط بھی روانہ کیا تھا، مگر سوزوکی صاحب نے چار سال ہوئے جواب نہیں بھیجا! سوزوکی صاحب چائے بنا کر کپ میں ڈال رہے تھے۔ میرے اچانک سوال پر کچھ گھبرائے، بھئی سچ یہ ہے کہ آپ کے خط کو بڑا سنبھال کے رکھا کہ جواب دیں گے مگر وہ کہیں گم ہوگیا۔ اسی طرح کتاب کئی لوگوں نے مانگی جن میں ہمارے اسادہ صاحب بھی شامل ہیں مگر......اسادہ صاحب فوراً بول پڑے، میں نے پڑھ کر واپس کردی تھی حضور۔ رئیس صاحب نے کہا شاید میں نے بھی دیکھی تھی! سوزوکی صاحب بولے، اسی لیے میں نے دوسری کتاب نہیں بھیجی —— سبھوں نے ایک ساتھ میری طرف دیکھا —— ایک لمحہ خاموشی کا گزرا، پھر میں نے کہا، میں کتاب ساتھ لے کر آیا ہوں اور سب ہنس پڑے!

سوزوکی صاحب کی چائے لاجواب تھی۔ اس میں اپنائیت کی شیرینی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ساتھ ہی انھوں نے طشت میں تھوڑے سوکھے میوے بھی لاکر رکھے۔ پھر کہنے لگے۔ آپ کے لیے ایک خاص چیز رکھی ہے اور الماری سے ایک پلیٹ نکال کر میز پر رکھی، کہنے لگے یہ سیو ہے۔ گڑ کی بنی وہ مٹھائی نما چیز جو بھی تھی اچھی تھی اور خاص دیسی تھی۔ پتہ نہیں چائے کی طرح اسے بھی جناب نے دہلی یا کراچی سے منگوایا ہو۔

میں نے اپنے بیگ سے ''آوارگی'' کی تین کاپیاں نکالیں۔ ان پر تینوں حضرات کے نام لکھے اور حضور میں جھک کر جاپانی انداز میں پیش کیا۔ ہر ایک نے اتنی ہی انکساری سے جھک کر اسے قبول کیا۔ پھر میں نے شعبۂ اردو کے لیے بولتی کتابیں سیریز کے تین آڈیو کیسٹ ''چنگاریاں''، ''تازہ ہوا کا جھونکا'' اور ایک انگریزی کا کیسٹ ''فرام ون کلچر ٹو انادر'' پیش کیا۔ پہلا کیسٹ سہیل کے افسانوں اور دوسرا اس کی نظموں کا تھا جسے میں نے اپنی آواز میں پیش کیا تھا۔ انگریزی کیسٹ میں سہیل کی اور چند دوستوں کی آوازیں تھیں۔ میں نے کیسٹ کا مقصد بتایا کہ جو لوگ اردو اسکرپٹ نہیں جانتے ان کے لیے ایسی بولتی کتابیں کتنی مفید اور دلچسپ ہیں۔ پچھلے دنوں بی۔بی۔سی لندن نے بھی اس کوشش کو بڑا سراہا تھا۔

ان لوگوں نے پوچھا! آج کل کیا مصروفیات ہیں —— میں نے بتایا کچھ خاص نہیں بس مزید آوارگی ہو رہی ہے۔ بچوں کے لیے خالد سہیل اور میری کتاب ''ورثہ'' (عالمی لوک کہانیوں کا مجموعہ) لاہور میں شائع ہو رہی ہے۔ اس کا کیسٹ بھی میں نے کلکتے میں ریکارڈ کرایا ہے۔ جلد ہی آپ لوگوں کو روانہ کروں گا۔ ساتھ ہی سہیل کے ساتھ کچھ ''لٹریچر آف بلیکس'' پر کام کر رہا ہوں۔ اگلے سال تک اس کتاب کو آجانا چاہیے!

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

انور جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے اور اپنے صبر کا زبردست مظاہرہ کر رہے تھے' چپکے سے اٹھے اور ہم لوگوں کی مختلف پوز بنا کر تصویریں کھینچ لیں اور ان لمحوں کو یادگار بنالیا!

بھئی میں نے اپنی ڈوکومنٹری خوب دکھادی۔ اب آپ حضرات کچھ بتائیں کہ یہاں کیا کیا حشر بپا ہے۔ سوزوکی صاحب کے تراجم کی بڑی خبریں گرم ہیں۔ حضور آپ نے کیا کچھ ترجمہ کر ڈالا۔ جناب سوزوکی فطرتاً گمبھیر مگر خوش مزاج اور عادتاً روایتی انداز کے شرمیلے جاپانی۔ بڑی انکساری سے کہنے لگے'' ارے وہ تھوڑے سے ترجمے سے کیا ہوتا ہے۔ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہاں کوئی خاص کام نہیں ہو رہا ہے۔ پھر اٹھے اور شیلف سے تین خوبصورت جلدوں والی کتابیں مجھے تھما دیں۔ یہ کتابیں جاپانی میں تھیں مگر سرورق پر اردو میں بھی ٹائٹل تھا۔'' کالی شلوار''، ''پرمیشور سنگھ'' اور ''سناٹا''۔ بھئی واہ طبیعت خوش ہوگئی ۔کاش میں جاپانی جانتا۔ میں نے شکریہ ادا کیا ــــ اسے کہتے ہیں کام۔ منٹو اور احمد ندیم قاسمی جاپانی میں!

مجھے اب تک صرف مجتبیٰ حسین صاحب کے سفرنامے ''جاپان چلو'' کے جاپانی ترجمے کا علم تھا۔ مگر یہ بھی بڑا کام ہے صاحب! اچھا آپ مجتبیٰ صاحب کو جانتے ہیں۔ اسادا صاحب نے پوچھا ــــ یہ پوچھیے کون انھیں نہیں جانتا۔ انڈیا میں ایک ہی تو مجتبیٰ حسین ہیں اور یہ سب انہی کے سفرنامہ جاپان کا کرشمہ ہے کہ میں آج ٹوکیو میں بھٹک رہا ہوں۔ اللہ ان سے اپنے طور پر سمجھے' حالاں کہ انھوں نے استعاروں میں کچھ بتایا تو تھا۔ مگر طبیعت سے مجبور ہو کر نکل پڑا۔ اب آؤں گا تو انھیں ساتھ لے کر آؤں گا ــــ میں نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میری'' آوارگی'' پڑھ کر انھیں اپنی بہت ساری آوارگیوں کا آموختہ یاد آ گیا تھا۔ ویسے مجتبیٰ صاحب میرے ظرافتی پیر ہیں۔ میں ان کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں اور وہ میری قدر کی قدر کرتے ہیں۔ سبھوں نے مجتبیٰ صاحب کو توصیفی ووٹ دے کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا!

رئیس صاحب کو کہیں جانا تھا۔ انھوں نے معذرت چاہی اور دو روز بعد ملاقات کا وعدہ لے لیا۔ انور کو انھوں نے ''شی بویا'' اسٹیشن کے باہر شام ۷ بجے ملنے کو کہا اور جھک کر آداب کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ رئیس صاحب بھلے مانس اور سرزمینِ اودھ کے سفیر لگے۔ میں ان سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چلو دو روز بعد سہی۔ کچھ ہی دیر میں رئیس صاحب ہاتھ میں چند کتابیں لیے ہوئے دوبارہ داخل ہوئے۔ بڑی محبت سے اپنی دو کتابیں پیش کیں۔ میں نے خوش ہو کر شکریہ ادا کیا ــــ ''صدا ابھرتی ہے'' رئیس صاحب کا شعری مجموعہ تھا۔ سرورق پر سفید فاختہ امن کا پیغام لیے رئیس صاحب کی طبیعت اور کلام کی غمازی کر رہی تھی۔ دوسری کتاب ''چاند کے چار رنگ'' جاپانی شاعری کا ترجمہ تھی۔ پہلی کتاب مجھے رئیس

صاحب کے کلام کی وجہ سے عزیز تھی اور دوسری میرے سفر کے لیے نہایت مفید اور قیمتی —— میں نے ایک بار پھر رئیس بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے جاتے جاتے پرسوں ملنے کو یاد دلایا اور مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے!

اسادا صاحب اپنی فیملی کو کہیں چھوڑنے جانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے بھی گھنٹہ بھر کی اجازت چاہی اور مجھ سے کہا کہ انتظار کروں، وہ واپس آ رہے ہیں۔ ہم لوگ پچھلے چار گھنٹوں سے گفتگو میں لگے تھے اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شام ہو چلی تھی، سوزوکی صاحب نے دوبارہ چائے کی تیاری شروع کی۔ انور اپنی بوریت کم کرنے کی غرض سے دوبارہ کیمرے کا فوکس ٹھیک کرنے لگا۔ اس نے کچھ پوز بنائے —— اور میں اٹھ کر سوزوکی صاحب کے شیلف پر سجی کتابیں دیکھنے لگا۔ اردو کی خاصی پرانی اور نئی کتابیں، ڈکشنری، رسالے، اخبار مگر زیادہ تر پاکستانی کتابیں قرینے سے رکھی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک کونے میں چپکی کتاب پر رک گئی —— 'پرومیتھیئس' میں نے بڑے پیار سے اپنی کتاب کو شیلف سے باہر نکالا اور سوزوکی صاحب سے مخاطب ہوا —— حضرت میری کھوئی ہوئی اولاد مل گئی۔ سوزوکی صاحب کچھ خفّت کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولے، میں بوڑھا ہو چلا ہوں یار —— یادداشت بھی کمزور پڑ گئی ہے۔ اب درگزر بھی کرو —— میں کہہ رہا تھا کتاب یہیں ہے، آخر تم نے ڈھونڈ کر نکال لیا —— میں نے کہا، خاکسار کو اپنی قسمت پر رشک ہے کہ حضور نے میری ادنیٰ کاوش کو اتنا سنبھال کر رکھا۔ سوزوکی صاحب چائے لے آئے اور ہم لوگ دوبارہ بلکہ تیسری بار چائے مزا لے کر پینے لگے۔ حضرتِ سوزوکی جتنی شیریں اردو بول رہے تھے چائے میں شکر بھی ٹھیک اتنی ہی تھی۔

میں نے پوچھا، جناب آپ اردو کی زلفِ گرہ گیر میں کس طرح الجھ گئے؟ سوزوکی صاحب کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے۔ ''بس الجھا اور الجھتا چلا گیا—— اب وہ باتیں کہاں یاد رہتی ہیں —— مجھے حکومتِ پاکستان کی طرف سے پہلا وظیفہ ۱۹۶۰ء میں ملا۔ میں میں نے جامعہ کراچی سے اردو میں ایم .اے. کیا اور پھر ماڈرن اردو لٹریچر میں ریسرچ کیا —— پھر یہاں آ کر درس و تدریس میں لگ گیا۔ تھوڑا بہت ترجمے کا کام بھی کرتا رہتا ہوں۔ میری تین کتابیں جو ایک ناشر نے شائع کی ہیں، یہاں بہت مقبول ہوئی ہیں —— لوگ منٹو اور قاسمی دونوں کو پسند کر رہے ہیں مگر ابھی بھی جاپانیوں کو بہت کچھ بتانا ہے، بہت کام پڑا ہے —— کچھ کام رئیس صاحب کے ساتھ مل کر بھی کر

رہا ہوں''!

ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کی تاریخ سو سال سے زیادہ ہے۔۱۸۷۳ء میں یہ اسکول آف فارن لینگویج ہوا کرتا تھا۔مگر پچھلی دس دہائیوں میں اس میں کافی تبدیلیاں آئیں۔دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں یہ ادارہ یونیورسٹی کی شکل میں آیا۔اس وقت یہاں بارہ عالمی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بنیادی طور پر یہ قومی انسٹی ٹیوشن عالمی زبان وادب کا گہوارہ ہے۔اب یہاں سترہ زبانوں کے شعبے ہیں۔ گریجویشن، ماسٹرس اور ریسرچ کا خاص انتظام واہتمام ہے۔پتہ چلا ہے کہ ۱۹۶۴ء سے شعبۂ اردو کے ہیڈ پروفیسر سوزوکی تاکیشی ہیں —— اس سال بی.اے. میں ۶۰ طلبا اور ایم.اے. میں تین طلباء اردو سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔جاپان میں اردو ٹوکیو کے علاوہ اوساکا میں بھی پڑھائی جاتی ہے اور ان دنوں پروفیسر تبسم کاشمیری وہاں براجمان ہیں۔وہیں پروفیسر ''ماٹسومولا'' ہیں جو اقبالیات پر کام کر رہے ہیں۔

میں نے دوبارہ پوچھا کہ آپ کے یہاں شعبۂ اردو کب وجود میں آیا؟ سوزوکی صاحب فرمانے لگے تقریباً ۱۹۰۳ء میں اردو کا شعبہ یہاں قائم ہوا اور تراجم کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران کچھ دستاویز اور ہینڈ بل کا ترجمہ بھی اردو میں ہوا تھا مگر ہندستان کی آزادی کے بعد اردو کے سلسلے سے رابطہ پاکستان سے زیادہ رہا ہے۔اردو اور ہندی ہمارے یہاں ''انڈو پاکستانی ڈیپارٹمنٹ'' کے تحت آتی ہیں۔اردو میں دو پروفیسر، ایک گیسٹ پروفیسر اور ایک انسٹرکٹر موجود ہیں جب کہ ہندی میں ایک پروفیسر، ایک لکچرار اور ایک گیسٹ پروفیسر موجود ہیں۔آج کل انڈیا کے بدری ناتھ کپور صاحب ہندی کے گیسٹ پروفیسر ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ اس زبانِ اردو کی قسمت بھی عجیب ہے' شاید میری طرح! ملک میں اس کی بقا کے لیے کیا کچھ وعدے سیاسی لیڈر نہیں کرتے۔مگر ساتھ ہی اس کی بربادی کے لیے بھی کیا کیا حربے استعمال نہیں کیے جاتے' وہی زبان وطن سے کوسوں دور امر بیل کی طرح پھیلتی جا رہی ہے' نہ کسی سایے کی ضرورت نہ دھوپ کا خوف —— یہ زبان کبھی ختم نہیں ہوگی! اسے کہاں کہاں ختم کرسکیں گے؟ ساری دنیا اب اس کا مسکن ہے۔

اسادا صاحب اپنے وعدے کے مطابق وقت سے پہلے آگئے۔آتے ہی انھوں نے کہا چلئے صاحب کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔ہم لوگ بھی پانچ گھنٹوں کی گفت وشنید سے تھک گئے تھے۔انور بڑی شرافت سے اپنی بوریت پر پردہ ڈالے مسکراتے رہے تھے۔خود سوزوکی صاحب مہمان نوازی، چائے بنانے اور میرے الٹے سیدھے سوالات سے تھک گئے تھے مگر بول نہیں رہے تھے نہ ہی ہمیں چھوڑنے کے

موڈ میں تھے —— اساداصاحب نے کسی ریستوران کا پتہ بتایا اور کہا آپ فرصت کر کے وہاں آجائیں! سوزوکی صاحب نے کہا واہ بھئی! آپ نے میرے مہمان اُچک لیے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ انھیں ڈنر پر لے جائیں۔ جب تک آئندہ ڈنر کا وعدہ میں نے نہ کیا ہمیں فرصت نہ ملی —— پھر ۶۰ کا زاویہ بنا کر میں نے جاپانی آداب کیا اور کتابوں کا شکریہ ادا کرتے باہر نکل آیا —— شام بھیگ چلی تھی —— اسادا صاحب بھی بڑے جوش میں تھے —— آج کی ملاقات اوران لوگوں کا خلوص مجھے تاعمر یاد رہے گا!

☆☆☆

ہاں! میں نے کچی مچھلی کھائی

''اسادا دیوتا کا'' صاحب عام جاپانیوں سے قدرے مختلف تھے۔ایک تو اردو کے گیسو دراز گرو، پھر چہرے پر عینک کے ساتھ صحت مند مونچھیں (جو عموماً بہت کم جاپانیوں کو نصیب ہوتی ہیں) رعب دار شخصیت کے مالک یہ شخص اندر سے بہت نرم اور بہت جلد گھل مل جانے والے، کم گو اور شرمیلے جاپانیوں کے برعکس میری طرح باتونی اور یار باش نکلے!

یونیورسٹی سے نکلتے ہی انھوں نے مجھے سگریٹ آفر کیا اور خود ایک لمبا کش لیتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''ہاں بھائی دانش صاحب بہت ادبی باتیں ہوگئیں۔اب بتایئے ڈنر کہاں لیں گے۔ میں نے کہا کہ حضور اول تو یہ تکلف نہ کریں اور اگر آپ مصر ہیں تو کہیں بھی چلیں۔ میں ٹھہرا بنجارہ مجھے کیا پتہ کون سا لنگر خانہ بہتر ہے —— اچھا تو پھر میں آپ کو ایک روایتی جاپانی نعمت کدے میں لے چلتا ہوں۔ ویسے آپ کو جاپانی پکوان پسند بھی ہے یا نہیں؟ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا —— اور ہم سب ہنسنے لگے۔ اسادا صاحب نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔ میں ایک فیملی ریستوران میں آپ کو لے جا رہا ہوں۔آپ بے فکر رہیں۔ہم لوگ آج کئی طرح کے پکوان آزمائیں گے۔

انور میرے پیچھے ہم لوگوں کی باتیں سنتے چلے آرہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری حالت پر اسے رحم آرہا ہوگا، مگر اسادا صاحب کا خلوص دیکھ کر میں خاموش رہا —— یونیورسٹی سے کچھ دور ہی ہم لوگ ایک ریستوران میں داخل ہوئے۔ سامنے کاؤنٹر کے پیچھے ایک مرد اور دو عورتوں نے مسکرا کر ''اراسہائے ماسے'' کہا۔انداز بتا رہا تھا کہ اس کا مطلب یقیناً خوش آمدید ہوگا —— کاؤنٹر کے آگے اونچے اسٹول لگے تھے۔ساتھ ہی چھوٹے ہال میں تتامی یعنی چٹائی بچھی تھی —— آرامدہ فرشی انتظام تھا۔چھوٹی میزیں کھانے کے لیے لگی تھیں۔ دیوار پر ایک گیشا لڑکی پنکھا جھلتی فریم میں مقید تھی۔ ماحول سادہ، صاف ستھرا اور پُرسکون تھا۔ایک فیملی کھانا کھا رہی تھی۔ان لوگوں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی —— یہاں کی سادگی اور خاموشی، جوتا اتار کر دوزانو چٹائی پر بیٹھنا —— غرض یہ جگہ ریستوران سے زیادہ مسجد لگ رہی تھی۔

اسادا صاحب نے کاؤنٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔آپ نے کون سی جاپانی ڈش کھائی ہے۔میں نے کہا ایک بار نیویارک میں ایک محترمہ کے اصرار پر ''سوشی'' کھانے کی جسارت کی تھی

۔آپ اسے چھوڑ کر کچھ منگالیں ـــــ جاپانی میں آرڈر دے کر وہ دوبارہ مجھ سے ہم کلام ہوئے ـــــ ’’سوشی‘‘ کوتو آپ نے ریجیکٹ کر دیا مگر وہ محترمہ؟ میں نے کہا محترمہ نے دوبارہ مجھے دعوت پر نہیں بلایا۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے پکوان میں مگن ہیں ـــــ میں آج یہاں دیکھنا چاہ رہا ہوں کہ کون سا کھانا آپ کو زیادہ پسند آتا ہے۔پھر وہی پکوان صحیح ڈھنگ سے اپنے گھر پر تیار کرا کے آپ کو کھلاؤں گا ـــــ گویا آج میری دعوت کی ڈریس ریہرسل ہے‘ میں نے کہا ـــــ بس یہی سمجھ لیجیے۔ویسے بھی آج میری فیملی گھر پر نہیں!

ہمارے سامنے چھری کانٹے کی جگہ چاپ اسٹک رکھی گئی۔پھر چھوٹے سے فنجان نما کپ میں کوئی سفید گرم مشروب دیا گیا۔ پتہ چلا یہ ’’ساکی‘‘ ہے چاول سے بنا مشروب۔پھر ایک خوبصورت کیتلی میں سادہ چائے پیش کی گئی۔ابھی ہم بے مزا چائے کو جھیل ہی رہے تھے کہ چھوٹے پیالوں میں ابلی ہوئی ترکاری‘ مرغی کا قیمہ اور ساتھ میں مولی ـــــ نام اس کا تھا ’’موشی مونو‘‘ ـــــ اسے چاپ اسٹک سے میں نے کیسے اٹھایا اور کھایا ہم ہی جانتے ہیں۔میں نے اسادا صاحب کو مصروف رکھنے کے لیے دوبارہ اردو کے مسائل کا ذکر چھیڑا ـــــ حضرت نے صاف انکار کر دیا کہ یہاں کوئی ادبی بات نہیں چلے گی۔ہاں کلچر کی باتیں کریں‘ کچھ کینیڈا کی باتیں ہوں ـــــ مگر پہلے آپ یہ بتائیں کہ اس چاپ اسٹک کا صحیح استعمال کیسے ہو‘ میں نے پوچھا؟ ان چاپ اسٹک یا لکڑی کی تیلیوں کو ’’واری باشی‘‘ کہتے ہیں اور اسے (اوپر والی کو) انگوٹھے اور شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کے بیچ رکھا جاتا ہے‘ نیچے والی کو انگوٹھے اور ـــــ بھائی آپ اس طرح کوشش کریں تو خود بخود آجائے گا‘ اسادا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ چلئے صاحب کھانے کا صحیح ڈھنگ تو پتہ چلا! میں نے دیکھا انور بڑے آرام سے ان چاپ اسٹک کا صحیح استعمال کر رہے تھے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ واقعی رنگ پکڑتا ہے۔جب ہم اپنے سبق کی مشق کر رہے تھے‘ اسی دوران کاؤنٹر والی عورت سے اسادا صاحب نے کچھ کہا ـــــ محترمہ نے اپنے پیچھے ایک بڑے سے ایکواریئم میں تیرتی مچھلی، جھینگے، چھوٹے سائز کے کچھوے اور پتہ نہیں کیا کیا سمندری بلاؤں سے ایک خوبصورت نارنجی رنگ کی مچھلی کو ایک چھوٹے سے جال میں آنکھ مچولی کرتے ہوئے گھیر کر اٹھالیا۔اسادا صاحب کہنے لگے‘ بھئی آپ کو تازہ مچھلی کھلاتے ہیں‘ مزا آجائے گا ـــــ انور یہاں بھی میری چاپ اسٹک والی بے بسی کو کیمرے میں محفوظ کرنے سے نہیں چوکے۔ میں نے کہا یار کچھ تصویریں باہر بھی لیں گے‘ اب رہنے بھی دو! میں اسادا صاحب کی طرف مخاطب ہوا۔ یہ بتایئے آپ کو انڈین کھانے‘ میرا مطلب ہے مغل پکوان پسند ہے یا

نہیں؟ اوہ جب بھی ان پکوانوں کا ذکر آتا ہے کراچی بہت یاد آتا ہے اور دہلی کا تو پوچھئے مت ۔ پچھلی بار میں نئی دہلی میں رکا تھا مگر کھانا کھانے جامع مسجد کے علاقے میں جاتا تھا۔ کیا نام ہے اس کا ـــــ میں نے فوراً کہا کریم نعمت کدہ ـــــ ہاں بھئی کیا بات ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سیخ کباب اور برف پر لگی فرنی اور گرما گرم حلیم ـــــ ہم لوگ پرانی دہلی کی گلیوں میں بھٹک رہے تھے کہ کاؤنٹر والی محترمہ نے کچھ کہتے ہوئے ایک ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی ۔ لیجیے صاحب اسے کہتے ہیں ''ساشی ما''۔ اسادا صاحب اس کے فوائد پر روشنی ڈال رہے تھے مگر میں تھال کی سجاوٹ میں محو تھا۔ کمال ہے صاحب مچھلی کے قتلے بڑے قرینے سے سبز سلاد کے پتے پر سجے تھے۔ آگے پیچھے مولی' گاجر اور ٹماٹر سے خوبصورت گارنش کی گئی تھی ۔ جاپانی کھانا جیسا بھی بناتے ہوں مگر اسے سجاتے غضب کا ہیں۔ اسی خوبصورت پیش کش پر تو میں سوشی بار میں پھنس گیا تھا۔ بقول شاعر :

دیتے ہیں سرور اول لاتے ہیں شراب آخر

اسادا صاحب نے کہا بسم اللہ کیجیے جناب ۔ میں نے بڑی سعادت مندی سے چاپ اسٹک سنبھالتے ہوئے ایک قتلہ اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا جلدی سے اسے منہ میں ڈال لیا۔ ابھی پوری طرح چبایا بھی نہ تھا کہ اندازہ ہو گیا کہ آج پھر سیرت کے بجائے صورت کے چکر میں پھنسا ہوں ۔ وہ مچھلی تازہ ضرور تھی مگر تھی کچی' یعنی ٹینک سے نکال کر صاف کر کے سیدھے میز پر آ گئی تھی ـــــ میں سانس روکے ہوئے تھا۔ انور کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ تھی ۔ اسادا صاحب حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ کہہ تو دیا تھا کہ تازہ مچھلی کھلاتے ہیں! مگر ہمارے یہاں تازہ سے مراد بغیر برف لگی ہوتی ہے' یہ تو کم بخت کچی تھی ۔ میرے پیٹ میں ایک طوفان اُمڈا آ رہا تھا' مگر میں تکلّف میں مرا جا رہا تھا۔ جسم پر چیونٹی سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ۔ اس سے پہلے کہ میں سارا کھایا پیا میز پر واپس کر دیتا انور نے فوراً پانی کا گلاس اپنی ہنسی روکتے ہوئے مجھے بڑھایا۔ میں ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔ پتہ نہیں کب اور کیسے وہ آدھی زندہ مچھلی کا قتلہ میرے پیٹ میں اتر گیا۔ مجھے سردی میں پسینے آ گئے ۔ اپنے پیٹ پر ایسا جبر میں نے پہلے نہیں کیا تھا۔ خفت مٹانے کے لیے ہم انور پھر اسادا صاحب کے ساتھ ہنس رہے تھے ۔ مگر ابھی تک لگ رہا تھا کہ وہ مچھلی پیٹ ہی میں پھڑ پھڑا رہی ہے اور باہر نکلنے کے لیے بیتاب ہے ۔ میں نے دیکھا بات ہی بات میں انور میاں نے اس ڈش کو گول کر دیا تھا اور ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا ـــــ کاؤنٹر والی عورت اور مرد پریشان تھے کہ ان سے کیا غلطی ہو گئی ۔ اسادا صاحب نے ان سے کچھ اور مانگا۔ میری طبیعت بے چین تھی ۔ ایک پیالے میں شوربہ قسم کی کوئی چیز آئی ۔ اسادا صاحب نے کہا یہ ''سویا سوس'' ہے اور یہ ہے مولی ۔ آپ پہلے مولی

کھائیں پھر اس سرکے والی سوس میں مچھلی کے قتلے کو ڈبو کر کھائیں —— نہیں اب معاملہ بگڑ جائے گا۔

میں نے انکار کرنا چاہا مگر اسادا صاحب نے کہا بھئی آپ تو اب چکھ چکے' ایک میرے کہنے پر کھائیں! میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے دوبارہ خوب ساری مولی چبائی اور ایک چھوٹے سے قتلے کو اچھی طرح سرکے میں ڈبویا پھر سانس روک کر اسے منہ میں ڈال لیا۔ سرکہ اتنا تیز تھا کہ مچھلی کا کچاپن اس میں ڈوب گیا تھا مگر پھر بھی میں اسے چبانے میں ہچکچا رہا تھا۔ کسی طرح اسے نگل کر میں نے دوسرا گلاس پانی کا اتارا اور فوراً جیب سے چیونگ گم نکال کر چبانے لگا —— اب جاپانی نعمت کدے میں چھوٹی الائچی یا سونف کہاں؟

اس امتحان میں کسی طرح میں پاس ہو ہی گیا' پتہ نہیں کس طرح! پھر اسادا صاحب کے حکم پر کاؤنٹر والی کچھ اور تیزی سے پکانے لگی —— اتنے میں ایک ٹرے ہمارے سامنے سے لے جائی جا رہی تھی۔ اسے روک کر اسادا صاحب نے مجھے دکھایا۔ اسے ''ایکی زوکوری'' کہتے ہیں۔ ایک طشت پر سالم مچھلی رکھی تھی۔ گاجر، کھیرا، مولی اور ٹماٹر اور سبز پتیوں سے پھول پتیاں بنائی گئی تھیں۔ ساتھ ہی کچھ جھینگے، کچھ سمندری سیپیاں اور پتہ نہیں کیا کیا —— مزے کی بات یہ تھی کہ جھینگے حرکت کر رہے تھے۔ یعنی پوری طرح ہوش وحواس میں تھے اور اس سمندر کی شہزادی کی ڈریسنگ اتنے پیار سے کی گئی تھی کہ اس میں جان پوری طرح باقی تھی۔ اس پر قتلے کے نشان بھی داغ دئے گئے تھے۔ غور سے دیکھا' مچھلی مجھے غور سے تاک رہی تھی۔ پتہ چلا کہ زندہ جھینگے کو دم اور سر سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے الگ کر کے کھانے والے بڑے سلیقے سے چبا جاتے ہیں اور اس نیم بے ہوش مچھلی کی تازگی کا مزا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

اسادا صاحب نے مجھے حواس باختہ دیکھ کر کہا۔ ایک مچھلی ہوتی ہے ''ماگورو' وہی جسے ٹونا فش کہتے ہیں اور ایک ''کوی''۔ آپ ایک بار اسے میرے کہنے پر کھائیں۔ یاد رکھیں گے —— میں نے کہا حضور آپ نے چودہ طبق روشن کرا دیے، بس نوازش! مگر یہ کوی اور ماگر تو ہمارے بنگال کی مچھلیوں کے نام ہیں —— اچھا —— اسادا صاحب کو حیرت ہوئی۔ مگر صاحب میں اس تو خوش فہمی میں تھا کہ بنگالیوں سے بڑھ کر کوئی مچھلیوں کا عاشق نہیں۔ کاش بنگالی بابو آپ لوگوں کی قدردانی دیکھیں۔ بس مان گئے سرکار آپ کو اور آپ کی قدردانی کو۔ اور کیا کہنا آپ کی کچی ''ساشی می'' کا!

ایک اور ٹرے ہمارے سامنے سجی سجائی آئی۔ میں نے کہا بس! مگر اسادا صاحب کے ساتھ انور بھی بول پڑے۔ ارے اصل چیز تو آپ چھوڑے دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا یہ ''ٹمپورا'' پکوان ہے۔ اس میں ہر چیز تلی ہوئی ہے۔ خیر یہ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھی اور اس کی خوشبو بھی اچھی لگی —— تلے ہوئے جھینگے،

مچھلی کے قتلے، پیاز کے لچھے، کیکڑے کی ٹانگ، آلو، بینگن اور شکر قند غرض ہر چیز تلی ہوئی۔ اس کے ساتھ ''یاکومی''، یعنی چٹنی اور ''اوشنکو'' یعنی اچار ـــــ یہ مالِ غنیمت اچھا بلکہ بہت اچھا لگا اور ہم ـــــ کچی تازہ مچھلیوں کو بھول کر چہک چہک کر ''ٹمپورا'' کھا رہے تھے۔ میری رفتار دیکھ کر اسادا صاحب نے کہا'' شکر خدا کا آپ کو کچھ اچھا تو لگا۔ میں نے کہا حضور آپ پہلے ہی یہ مال منگا لیتے ـــــ نہیں، اب آپ خود کو جاپانی پکوان کا ماہر کہہ سکتے ہیں۔ کیا غضب کا تجربہ کیا آپ نے ـــــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اللہ قسم بڑا مزا آیا ـــــ اسی بات پر کچھ میٹھا کھاتے ہیں۔ اسادا صاحب نے بڑے چاؤ سے کہا ـــــ نہیں حضور اب میں مزید تجربہ نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی کھانا بہت ہوگیا۔ اب اٹھا جائے!

اس کے ساتھ ہی ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسادا صاحب نے اپنے گھر کا فون نمبر دیا اور بتایا کہ وہ دو روز کے لیے کہیں جا رہے ہیں۔ آتے ہی مجھے فون کریں گے۔ ہم لوگوں نے تین چار بار جھک جھک کر (مچھلی ہضم کرتے ہوئے) ان کا شکریہ ادا کیا۔ اسادا صاحب کی مہمان نوازی ختم ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ انھوں نے اشارے سے ٹیکسی روکی اور ہمیں گھر چھوڑنے پر اصرار کرنے لگے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم سب انور میاں کے دولت کدے کی طرف روانہ ہوئے۔ میری طرح اسادا صاحب بھی خوش نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے یقین مانئے کافی عرصے بعد ایسی جم کر نشست ہوئی ہے۔ آج مجھے کراچی اور دلّی بہت یاد آ رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں انور کا مکان آ گیا۔ ہم دونوں کار سے اترے۔ اسادا صاحب کو شب بخیر کہتے ہوئے رخصت کیا۔

آج میرے اچھے اور پُر لطف دوستوں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

شنتو کاہن اور نروان کی دھند

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے پانچ سو سال بعد سرزمینِ ہند سے ایک عظیم لہر اُٹھی اور چین و کوریا ہوتے ہوئے یاماٹو کے مقدس جزیروں تک پہنچی۔ تقریباً ۵۷۴ء میں چین کے رسم الخط اور ہند کے مہایان فلسفے نے اس ملک کی موجودہ تہذیب کی داغ بیل ڈالی اور نروان کا احساس بخشا کہ ''وجود کا کسی روشن خلا میں سما جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ زمان و مکان سب ایک ہیں''!

آج میں صبح سویرے کافی پی کر تنہا جاپانی زیارت گاہوں کی کھوج میں نکل پڑا تھا —— فیوڈل عہد کے ایک شاعر کی ہائیکو اس وقت مجھے یاد آ رہی تھی :

دنیا جس میں ہم سے گزرتے ہیں
بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے ایک سائبان ہے
اور پھر —— خدا حافظ

جے آر لائن کے اسٹیشن پر کھڑا میں بورڈ پر ''ہاراجوکو'' اسٹاپ تلاش کر رہا تھا مگر معمول کے مطابق سارے نام جاپانی میں لکھے تھے۔ پھر انور کے بتائے ہوئے طریقے سے ۱۲۰ ین کا ٹکٹ لیا اور گیٹ میں داخل ہوا۔ مجھے اپنے اسٹاپ پر ٹکٹ درست کرانا تھا۔ بہترین ٹرین سروس کے باوجود یہ معاملہ مجھے بہت کھٹکتا تھا۔ یورپ اور امریکہ کی طرح یا پھر ہمارے اسٹیشنوں کی طرح ہر بورڈ انگلش میں لکھ کر یہ بار بار ٹکٹ ٹھیک کرانے کا مسئلہ حل کیا جا سکتا تھا —— مگر یہ لوگ انگریزی کا احسان اٹھائیں کیوں —— جب کہ مغربی تہذیب کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ خیر ان کی سرکار نے اس بہانے کچھ بے کار لوگوں کو کام سے لگا رکھا ہے —— کیا برا ہے' سیاح کے آرام کو دیکھا جائے یا ملک کی بے روزگاری؟

''ہاراجوکو'' اسٹیشن پر مزید ۱۶۰ ین دے کر میں باہر نکلا۔ موسم خوش گوار تھا۔ پولس چوکی سے معلوم ہوا کہ تقریباً تین فرلانگ پر ایک شنتو معبد ہے جس کا نام ہے ''میجی جنجو شرائن'' —— میں بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا —— جاپانی بودھ مذہب اور زین فلسفے کے ساتھ شنتو عقیدے کو بھی مانتے ہیں۔ شنتو عقیدے کو بھی مانتے ہیں۔ شنتو عقیدے کو ''پیگن'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ زمانۂ قدیم کے لوگ انجانی اور پُر اسرار قوتوں اور ارواح سے ڈر کر ان کی پوجا کرتے اور جنگل کے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے قربانیاں کرتے۔ اس خوف اور عقیدے نے شنتو مذہب کو جنم دیا۔ اس میں نہ کوئی صحیفہ ہے نہ ہی کوئی مخصوص

طریقۂ کارمگر یہ عجیب وغریب مذہب جاپانیوں کی روزمرہ کی زندگی میں شامل ہے۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قدیم مصر، میکسیکو اور عراق کے ہیکلوں سے بھی اس کا تعلق ہے، یا شاید یہ بحرالکاہل کے اجنبی جزیروں کا مذہب ہے۔ جو روحوں یا کہرے سے نکلا ہے اور اسی کہرے میں موجود ہے۔آج بیشتر جاپانی خود کو بودھ مذہب اور ساتھ میں شنتو عقیدے کا ماننے والا کہتے ہیں۔اس میں کوئی اختلاف نہیں۔بودھی اشلوک انھیں نروان کی سیڑھیوں تک لے جاتے ہیں تو شنتو انھیں قدرت سے عقیدت سکھاتا ہے۔شنتو معبد قدرتی مناظر کے بہترین عکاس ہوتے ہیں۔

بودھ یا شنتو زیارت گاہوں کے علاوہ ٹوکیو میں مسیحی، یہودی اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں بھی موجود ہیں۔معلوم ہوا کہ ۱۹۴۵ء میں مسیحیت جاپان میں پھیلی مگر ۱۶۰۳ء میں ''ٹوکوواگا'' عہد میں اس پر پابندی لگا دی گئی جو تقریباً ۲۵۰ سالوں تک قائم رہی۔ اس دوران چھپ کر مسیح کی عبادت کرنے والوں نے بدھا کے مجسّموں کی پیٹھ پر چھوٹی چھوٹی صلیب بنا رکھی تھی —— اپنے عقیدے کی پرورش کے لیے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔

''شہنشاہ میجی اور ملکہ ڈواگر شوکین'' کی یاد میں اس شنتو معبد کا نام ''میجی جنجو'' تھا۔شہر ٹوکیو کے بیچ ایک ہرا بھرا جنگل کھڑا تھا جس کے اندر یہ معبد تھا۔اس زیارت گاہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور ''ہتسو موڈے'' یا نئے سال کی خوشی میں یہاں جتنے زائرین حاضری دیتے ہیں۔ پورے جاپان میں کسی اور معبد میں نہ دیتے ہوں گے۔اس عظیم الشان تاریخی زیارت گاہ میں صبح گیارہ بجے پہنچ گیا تھا۔منگل کا دن، بھیڑ زیادہ نہ تھی۔ پھر بھی اس وقت کافی مقامی لوگ حاضری اور عقیدت کے نذرانے چڑھانے آئے ہوئے تھے۔شنتو زیارت گاہوں کا صدر دروازہ یا گیٹ ''ٹوری'' کہلاتا ہے۔اسی گیٹ یا نشان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کوئی معبد ہے۔روزمرہ کی زندگی کو روحانی دنیا سے بھی یہی گیٹ تقسیم کرتا ہے۔''میجی جنجو'' کے صدر پر بھی ایک ''ٹوری'' بنا تھا جو سترہ سو سال پرانے درخت سے بنا تھا۔سنگریزے بچھی ایک سڑک بائیں طرف آئرس باغ کو جا رہی تھی۔ جون کے مہینے میں سنا تھا یہاں سو اقسام کے پھول کھلے رہتے ہیں۔معبد کے دونوں طرف دو دیوزاد پتھر کے کتوں کے مجسّمے ہیں جو معبد کی حفاظت کرتے ہیں۔انھیں ''کومینو'' کہتے ہیں۔ان کی شکل شیر کی طرح تھی —— شاید جاپانیوں کو شیر کی درندگی کا علم نہ تھا۔ورنہ وہ اسے کتا بنا کر نہ بٹھا دیتے۔گیٹ سے پرے ایک چھوٹا سا حوض تھا۔اس پر سایہ بھی تھا۔اسے ''چوزویا'' کہتے ہیں۔ اس پر لکڑی کے ڈونگے رکھے تھے جسے ''ہیشاکو'' کہتے ہیں۔حاضری سے پہلے لوگ یہاں ہاتھ دھو کر کلی کر رہے تھے۔گویا یہ ایک طرح کا وضو تھا —— چاروں طرف سرخ پتھر کے ستون کھڑے تھے۔دراصل

یہ پتھر کے چراغ تھے جن میں دیے جھلملا رہے تھے۔ پوری فضا لوبان کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ یہاں ایک عجیب سناٹا تھا۔ معبد جسے ''ہونڈن'' کہتے ہیں پرانا چوبی مندر ہے۔لوگ باہر جوتے اتار کر اندر داخل ہونے سے پہلے تین بار تالی بجا رہے تھے' پھر گھنٹہ بجا کر آنکھیں موندے کچھ اشلوک پڑھ رہے تھے۔ میں بھی کچھ ہچکچاتے ہوئے جوتا اتار کر اندر داخل ہوا۔ ماحول پُر اسرار تھا۔شاید ان کے پُرکھوں کی ارواح آس پاس بھٹک رہی تھی۔معبد کے اندر کوئی مورتی نظر نہیں آئی۔ بازو میں ایک چق پڑی تھی۔اندر ایک بوڑھا کاہن کالی ٹوپی اور کالے چغے میں ملبوس ایک عورت کو کچھ پڑھ کر بتا رہا تھا۔عورت کی گود میں نوزائیدہ بچہ ہمک رہا تھا۔قریب ہی بچے کا باپ بڑے اشتیاق سے بچے کی اقبال مندی کی دعا میں مصروف تھا۔

معبد کے اندر دوسری کچھ عورتیں موم بتیاں جلا رہی تھیں ۔ایک تخت پر مختلف اقسام کی گڑیاں سجی تھیں۔ پتہ چلا کہ اکثر کسی بچے کی موت کے بعد اس کی یاد میں ایک گڑیا یہاں لگادی جاتی ہے۔ یہاں کے سجادہ نشین یا بڑے کاہن کو'' کانوشی'' کہتے ہیں۔ان معبدوں میں عورتیں بھی چھوٹے درجے کی راہبہ کے طور پر کام کرتی ہیں۔انھیں ''میکو'' کہتے ہیں۔ان کا کام روزمرہ کی حاضری میں کاہن کی مدد کرنا ہے۔خاص معبد سے نکل کر میں پچھواڑے کے مکان میں داخل ہوا۔اس کا نام ''ہوموتسو'' تھا۔یہاں شہنشاہ میجی اور ملکہ شوکین کی کچھ چیزیں یادگار کے طور پر رکھی ہیں۔ان میں شہنشاہ کی ایک کتاب بھی ہے جو اس نے جاپانیوں کی اخلاقیات پر لکھی ہے۔عہد میجی میں لوگ مغرب کی تقلید میں اپنی انفرادیت کھو رہے تھے۔اس سے متفکر ہو کر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔(آج یہ کتاب طاقِ نسیاں بن چکی ہے اور مغرب کی تقلید اب کھل کر کی جارہی ہے) یہیں بانس کی ڈبیا میں بند' ہند سے درآمد شدہ کالی روشنائی رکھی ہے جو اس دور میں کتابت اور عکس دونوں کے لیے استعمال میں آتی تھی۔ یہ بھی چین کے راستے یہاں لائی گئی ـــــ اسے ''سوئی بوکوگا'' کہتے ہیں ـــــ ایک وکٹوریہ (بگھی) بھی کھڑی ہے جسے ۱۸۸۹ء میں چھ گھوڑے کھینچا کرتے تھے۔

ایک بات قابلِ غور یہ تھی کہ اس معبد میں ہماری زیارت گاہوں یا مندروں کی طرح نہ فقیروں کی ٹولیاں بھیک مانگ رہی تھیں نہ ہی بھیڑ میں جیب کترے ہاتھ صاف کر رہے تھے اور نہ کاہن ہاتھ پھیلا کر زائرین سے چندے وصول کر رہے تھے۔اس مقصد کے لیے صندوق رکھے تھے اور لوگ اپنی مرضی سے اس میں نذرانے ڈال رہے تھے۔

ایک کونے پر نظر پڑی۔ایک جوان جوڑا ایک ڈبے کو ہلا ہلا کر کچھ بدبدا رہا تھا۔پھر انھوں نے اس

میں ایک کاغذ کی پرچی نکالی۔اسے کھول کر پڑھا اور خوشی سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ پتہ چلا اس ڈبے میں قسمت کا حال بند ہے۔اسے ''اومی کوجی'' کہتے ہیں اور وہیں ایک عورت ایک چوبی تختے کو معبد کے کھمبے میں باندھ رہی تھی۔اس پر اس کی مراد لکھی تھی۔اسے یہاں ''ایما'' کہتے ہیں۔ پھر ایک عمر دراز جوڑے کو دیکھا جو ایک لڑکے کے ساتھ ایک تعویذ نما پرچی خرید رہے تھے۔اسے ''اوماموری'' کہتے ہیں۔ سنا یہ دافعِ بلا ہے۔ ہر شر سے بچنے اور اچھی قسمت کے لیے لوگ اسے اپنے گھروں میں لگاتے ہیں۔یعنی پورا سین ہمارے گنڈے،تعویزوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔میں سوچ رہا تھا کہ اس کی شروعات کہاں سے ہوئی تھی۔ یہ منت اور دعاؤں کا سلسلہ مزار،مندر،معبد اور گرجا ہر جگہ دیکھا تھا۔انسان سکون اور تحفظ کے کیا کیا طریقے ڈھونڈ نکالتا ہے :

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ سکون اور تحفظ کی تلاش ملک و مذہب سے پرے شاید انسان کی سرشت میں شامل ہے۔کیا پتہ میں خود کس سکون کی تلاش میں شہر در شہر بھٹک رہا تھا۔شاید وقت ہی یہ بتا سکے!

میں فلسفہ تحفظ کے ادھیڑ بن میں الجھا ہوا تھا کہ کسی مترنم آواز نے سکوت توڑا۔ پلٹ کر دیکھا ایک سفید فام لڑکی اپنی تصویر کی فرمائش کر رہی تھی۔ میں نے اس کا کیمرہ لیا۔عقب میں مندر کو فوکس کرتے ہوئے اس کی تصویر کھینچ دی۔اس نے شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا شکریہ کی ضرورت نہیں۔اسی بہانے میرے کیمرے سے ایک تصویر میری کھینچ دو۔اس نے میری مدد کی۔ پتہ چلا ٹریسی کینیڈا سے آئی ہوئی طالب علم ہے اور ایکسچینج پروگرام کے تحت ٹوکیو یونیورسٹی میں جاپانی ادب و زبان کا ڈپلوما کر رہی ہے۔ میں نے اپنا نام بتایا ـــــ وہ پوچھنے لگی کینیڈا میں کہاں رہتے ہو۔ میں نے حیرت سے پوچھا تمھیں کیسے......اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ تمہارے کورٹ کے کالر پر میپل لیف (چنار کے پتے کا کینیڈین نشان) کا بروچ دیکھ کر میں سمجھ گئی۔اسی لیے میں نے تم سے تصویر کی گزارش کی ـــــ میں یہاں نئی ہوں۔حالاں کہ مقامی لوگ گوروں کی خاص طور پر مدد کرتے ہیں۔پھر بھی میں محتاط ہوں۔میں نے کہا اس میں شک نہیں کہ جاپانی راستہ بتانے اور تصویریں کھینچ دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں اور بڑی خندہ پیشانی سے ٹورسٹ کی مدد کرتے ہیں۔پھر بھی عزت افزائی کا شکریہ!

میں نے گھڑی دیکھی ۔ دوپہر کے سوا بج رہے تھے۔ میں نے کہا میں کافی کے موڈ میں ہوں۔تمھیں چلنا ہے۔اس نے کہا ڈچ اسٹائیل (یعنی اپنے خرچ پر) میں نے کہا جو تمہاری مرضی ـــــ ہم لوگ بوڑھے کاہن کے سحر زدہ آنگن سے باہر نکل آئے۔''ہاراجوکو'' اسٹیشن کے ساتھ ایک کنٹا کی فرائڈ

چکن کیفے میں داخل ہوئے۔ میں ایک لائن میں لگ گیا اور ٹریسی دوسری قطار میں۔ میں نے اپنا مخصوص چیز برگر کوک اور کافی لی۔اس نے اپنے مطلب کی چیزیں لیں۔ پھر ہم ایک ٹیبل پر یکجا ہوئے —— تو پھر ٹوکیو کیسا لگا تمھیں۔ میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا —— بہت اچھا اور بے حد پیچیدہ۔ ہر قدم پر ایک نیا کلچرل شاک۔اور جاپانی زبان —— میں نے دوبارہ پوچھا —— اوہ مت پوچھو۔ایک جنگل میں جیسے بھٹکتے رہو، راستہ کھوج نکالنا بہت مشکل ہے۔مگر مجھے بہت مزا آرہا ہے۔دراصل مغرب کی یکسانیت سے کچھ اوب گئی تھی۔ یہاں کی ہر چیز میں ایک نیا پن ہے۔ایک زبردست تجربہ!

مجھے ٹریسی بھولی بھالی کینیڈین لگی۔ایک ایسی طالب علم جسے تجربے اور مشاہدے عزیز ہوں۔ بقول خالد سہیل (میرے ماہرِ نفسیات دوست) کینیڈین بڑے سادہ ہوتے ہیں۔واقعی یہ بڑی سادہ تھی۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں اپنی آوارگی قلم بند کر رہا ہوں تو وہ نہ صرف خوش ہوئی بلکہ بہت متاثر بھی ہوئی۔ (آخر سادگی کہتے کس کو ہیں) اس نے برگر کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ جینز پر صاف کیے اور ایک پرچی پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر مجھے بڑھا دیا۔ میں نے اپنا کارڈ اسے دیا۔ وہ کنگسٹن سے آئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہارے علاقے میں میری ایک شناسا نسیم سیّد رہتی ہیں۔ بڑی اچھی شاعرہ اور بڑی نفیس خاتون ہیں۔اچھا —— اس نے حیرت سے کہا، ہمیں خبر نہیں —— ارے مجھے بھی بڑی مشکلوں سے خبر ملی ہے!

میں نے کافی ختم کر کے اٹھتے ہوئے اس کا پروگرام پوچھا۔اس نے کہا آج میری چھٹی ہے اور میں تو ایسے ہی گھوم رہی تھی۔ ویسے تم کہاں جاؤ گے؟ میں نے میز پر نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا میں ''سین سوجی مندر'' دیکھنے جارہا ہوں۔ ''آساکوسا'' کے علاقے میں چلنا ہے تو چلو —— وہ کچھ سوچ کر تیار ہوگئی۔اس بار میں نے کہا —— ''وی وِل گوڈچ'' وہ مسکرادی اور ہم لوگ چل پڑے۔

ہاراجوکو اسٹیشن پر ٹریسی کی ٹوٹی پھوٹی مگر کارآمد جاپانی سے ٹکٹ کا مسئلہ حل ہوا اور ہم لوگ ''آساکوسا'' کے لیے ٹرین پر سوار ہوئے۔تھوڑی دیر بعد پتہ چلا سب وے سے گنزا والی لائن جلدی پہنچادے گی۔راستے میں ٹرین بدل کر ہم لوگ آساکوسا پہنچے۔ دور سے ایک بہت بڑا لالٹین نظر آرہا تھا جس پر جاپانی میں بہت کچھ لکھا تھا۔ ''سین سوجی مندر'' کا صدر دروازہ ''کامی ناری مون'' کہلاتا ہے۔اسی دروازے پر ایک دیوقامت لال رنگ کے کاغذ کا لالٹین آویزاں تھا۔ پتہ چلا اس کا وزن کوئی سو کیلو ہے۔ کچھ یقین نہ آیا۔خیر —— چوبی دروازے کے ایک طرف ہوا کے دیوتا ''فوجن'' اور دوسری طرف بجلی کے دیوتا ''راجن'' ایستادہ تھے جن کا کام مندر کے اندر بیٹھی رحم کی دیوی ''کانن'' کی حفاظت کرنا تھا۔ میں

ابھی گیٹ پر ہی کھڑا تھا کہ اچانک ٹریسی نے پوچھا کہ کیا تم دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہو —— میں نے کہا یقین رکھنا تو بعد کی بات ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں ایک خدا کو اب تک پوری طرح خوش نہیں کر پایا، لوگ اتنے سارے دیوی دیوتاؤں یا خداؤں کو کیسے خوش کر پاتے ہوں گے۔ بے چاری نے بڑی معصومیت سے اپنے کاندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا —— میں نے وہی سوال اس سے اس لیے نہیں پوچھا کہ مجھے معلوم تھا وہ کہے گی ''آئی ڈونٹ نو'' جو کہ شمالی امریکہ کا تکیہ کلام ہے!

''آسا کوسا'' کے علاقے میں آباد یہ مندر ٹوکیو کا سب سے قدیم معبد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۸۲۶ء میں اس علاقے کے دو مچھیروں کو اپنے جال میں ''کانن دیوی'' کی مورت ملی۔ اس طرح اس دیوی کو یہاں بٹھا دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ مندر وجود میں آ گیا۔ مندر کے باہر دورویہ دکانیں عہدِ قدیم سے یہاں آباد ہیں اور اس دور کے ماحول کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہر ملک کے سیاح یہاں موجود تھے۔ مندر کے صحن میں ایک بہت بڑا لوبان دان جل رہا تھا۔ میں نے اتنا بڑا لوبان دان پہلی بار دیکھا تھا۔ لوگ اس میں اگربتیوں کا چڑھاوا پیش کر رہے تھے۔ ماحول دھواں دھواں تھا اور ایک عجیب سی خوشبو فضا پر مسلط تھی۔ لوگ باگ لوبان کے دھوئیں میں ہاتھ لگا کر اپنے بدن اور چہرے پر پھیر رہے تھے۔ سنا یہ بیماروں کو شفا اور کمزوروں کو طاقت بخشتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں اس مندر کا مین ہال جسے ''ہونڈو'' کہتے ہیں برباد ہو گیا تھا۔ اسے ۱۹۵۸ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ کانن دیوی اس ہال کے تہہ خانے میں حفاظت سے آرام کر رہی ہے۔ یہیں سونے کی چھ دیگر مورتیاں بھی محفوظ ہیں جن کی زیارت عوام کے لیے ممکن نہیں۔ روایت ہے کہ جب کانن دیوی کو اس مندر میں بٹھا دیا گیا تو اس رات آسمان سے ایک عظیم الشان سنہرا ڈراگون ناچتا ہوا دیوی کی زیارت کو نازل ہوا۔ اس کی یاد میں ہر سال ایک دیوقامت ڈراگون کا رقص بہار کے موسم میں ہوتا ہے۔ یہ پندرہ گز لمبا اور اس کا وزن تقریباً پچھتّر کیلو ہوتا ہے اور اسے آٹھ مرد اٹھائے ناچتے ہیں۔ میں نے کلکتہ اور کیلی فورنیا میں چائنیز نیو ایئر پر ایسا رقص دیکھا ہوا تھا مگر عموماً دو یا تین لڑکے ایسا رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کا پچھتّر کیلو والا رقص یقیناً دلفریب ہوگا۔ میں نے گھڑی دیکھی، سہ پہر کے چار بجا چاہتا تھا اور مجھے ساڑھے سات بجے رئیس بھائی سے ملنا تھا۔ ٹریسی کیمرہ سنبھالے تصویریں اتارنے میں مگن تھی۔ میں نے اجازت چاہی —— اس نے کہا یہاں ایک چیز رہ گئی ہے۔ ''پانچ منزلہ پگوڈا''۔ اس سے بھی آج ہی نپٹ لیں، پھر واپس چلتے ہیں —— مندر کے عقب میں کچھ ہی فاصلے پر تقریباً ۵۶ ر میٹر اونچا ایک خوبصورت پگوڈا اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے پہلے اپنے کیمرے میں اسے اتارا۔ پھر ٹریسی نے اپنے

فوٹو کی فرمائش کی ۔ میں نے پگوڈا کے ساتھ اس کی تصویر لی ۔اس نے جاپانی میں قریب کھڑی ایک لڑکی سے کچھ کہا اور کیمرہ اسے دیا۔لڑکی نے ہم دونوں کی ساتھ تصویر کھینچ کر کیمرہ واپس کر دیا۔ٹریسی نے جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

ہندستان میں گوتم بدھ کی آخری آرام گاہ کو ''اسٹوپا'' کہتے ہیں ۔ یہی سمادھی یا معبد چین ہوتے ہوئے جاپان پہنچ کر پگوڈا کی شکل اختیار کر گیا تھا! بودھی مندر یا پگوڈا تین یا پانچ منزلہ ہوتا ہے۔اسی شکل کے پانچ منزلہ پتھر کے کتبے بھی قبرستان میں لگے ہوتے ہیں جنھیں ''گورنتو'' کہتے ہیں جو بودھی کائنات یعنی پانی ،زمین ،آگ ، ہوا اور آسمان کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

''گوجونوتو'' یا پانچ منزلہ پگوڈا کے صحن میں لوگ آنکھ موندے اشلوک پڑھ رہے تھے۔اندرا گرمہ مہ کر رہی تھی' مسند پر بدھا کی پرسکون مورت گیان دھیان میں گم تھی ۔ایک گوشے میں لوگ قندیلیں خرید کر جلا رہے تھے ۔ پیچھے دیوار پر دس ہاتھ والے دیوتاؤں کا عکس لگا تھا۔ کچھ بودھ فلسفے کی کتابیں رکھی تھیں ۔ وہیں ایک کتاب کے سرِ ورق پر ''اوم'' لکھا تھا۔ میرے خیال میں مہایان فلسفے کے ساتھ بنگال سے تانترک بودھ ازم بھی یہاں پہنچا تھا ـــــ اس پگوڈے میں ایک اور مورت ایستادہ تھی جیسے ''مایو'' کہتے ہیں اور اسے بدھا کا نائب تصور کیا جاتا ہے ۔اس کے چھ ہاتھ تھے اور چہرہ خوفناک تھا۔اس کا کام شر کا مقابلہ کرنا ہے۔صحن میں ایک گھنٹا لگا تھا اسے ''بوشو'' کہتے ہیں ۔ نئے سال کی آمد پر اسے ۱۰۸ بار بجایا جاتا ہے۔جس سے مراد ہے کہ ۱۰۸ سفلی خواہشات کو انسان خود سے دور بھگائے ۔ گھنٹے پر ایک کنول کا پھول منقش تھا۔ یہ ماحول میرے لیے اجنبی نہ تھا۔اس سے خاص مشرق کی بو آرہی تھی ـــــ ہاں ٹریسی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ تصویریں بھی اتارتی جارہی تھی ۔ میں دن بھر کے تاریخی حوالوں سے کچھ بیزار سا ہو چکا تھا۔ساتھ ہی مجھے دیر بھی ہو رہی تھی ۔ٹریسی میری بے چینی کو محسوس کر رہی تھی ۔اس نے آہستہ سے پوچھا' کیا شام کوئی ڈیٹ ہے؟نہیں ـــــ میں نے کہا۔ایک شریف آدمی سے ڈنر پر ملاقات کرنی ہے ـــــ اوہ۔اس نے کچھ اور نہ پوچھا ـــــ ہم لوگ باہر نکل رہے تھے۔ صحن کے کونے میں ایک عورت ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے کسی خیال میں مگن تھی ۔ٹریسی نے خاموشی سے اس عورت کی تصویر اتاری اور مجھ سے ہم کلام ہوئی ـــــ یہاں کی روحانیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔تمام ٹیکنیکل ترقی کے باوجود اور ماڈرن ازم کے ساتھ یہ لوگ بڑے روایتی اور مذہبی ہیں ـــــ میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا' ٹریسی ڈیئر جس کو جہاں سکون مل جائے' وہی بہت ہے!

ٹریسی نے اپنا فون نمبر دیا اور ساتھ ہی انٹرنیشنل یوتھ کلب کا پتہ دیا اور بتایا کہ اگلے ہفتے کی شام اسٹوڈنٹس کی ایک پارٹی ہے۔ آنا تمھیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گی —— میں نے کہا' کوشش ضرور کروں گا۔ میرا انتظار نہ کرنا —— میں اپنے دن بھر کی ہم سفر سے رخصت ہو رہا تھا۔ ایسے اچھے لوگ سفر میں کم ملتے ہیں —— مگر کس کس کو یاد رکھا جائے؟

میں ٹریسی میک لین کی یاد ذہن سے جھٹک کر فون بوتھ تلاش کرنے لگا۔ انور کو فون کیا۔ وہ میرے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے ''شی بویا'' اسٹیشن کا راستہ سمجھایا اور کہا کہ اسٹیشن کے باہر صحن میں ایک کتے کا مجسمہ ہے وہیں گھنٹہ بھر میں ملتے ہیں ——

میں بتائے ہوئے منزل کی طرف چل پڑا!

''ہر روز یوں ہی ملنا ہر روز بچھڑنا ہے''

☆☆☆

لکھنؤ والے پاکستانی رئیس

''شی بویا'' اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی۔ سات بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے! میں جنوبی گیٹ سے باہر نکلا۔ بڑا رونق افراز علاقہ تھا۔ انور کے بتائے ہوئے ٹھکانے یعنی کتے کا مجسمہ میں ڈھونڈ رہا تھا مگر نظر نہ آیا ـــــ اسٹیشن کے باہر کوئی دو سو جوان لڑکے اور لڑکیاں کسی کے منتظر تھے۔ میں نے اسٹیشن کا دو چکر لگایا مگر مجسمہ کہیں بھی نظر نہ آیا ـــــ میں نے ایک بھلے مانس سے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ جو بھیڑ کھڑی ہے، وہیں درمیان میں مجسمہ ہے۔ اندازہ ہوا میری طرح بھانت بھانت کی بولی بولنے والے ہر عمر رنگ اور نسل کے لوگ کسی سے ملاقات کرنے یہاں جمع تھے اور اس بھیڑ میں بے چارے کتے کا مجسمہ چھپ گیا تھا۔ میں بھی وہیں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر خیال آیا ایسی کیا خاص بات ہے اس مجسّمے کی کہ ایک عالم مجمع لگائے ہوئے ہے۔ قریب ہی ایک جاپانی محترمہ سے میں نے معاملہ پوچھ ہی لیا۔ (مجھے عام طور پر جاپانی مرد شرمیلے لگے، ان کے برعکس عورتیں کچھ زیادہ اسمارٹ اور فرینک نظر آئیں۔)

ایک عجیب کہانی سننے کو ملی ـــــ اس کتے کا نام ''ہاچیکو'' تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس علاقے کے ایک پروفیسر کا یہ وفادار کتا تھا۔ ہر صبح وہ اپنے مالک کو چھوڑنے اور ہر شام مالک کو لینے اسٹیشن آتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اچانک مالک کی وفات کے بعد بھی ''ہاچیکو'' اپنے مالک کے انتظار میں گیارہ سال تک صبح و شام اسٹیشن آتا رہا۔ اسی انتظار میں وہ مر گیا۔ اس کی یاد میں اسٹیشن کے صحن میں محبت اور وفاداری کا مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ پروفیسر اور اس کا ہاچیکو اس دنیا میں نہیں رہے مگر وفاداری کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے یہ جگہ ایک مشہور میٹنگ پلیس بن گئی۔ صبح و شام سینکڑوں اسی جگہ اپنے چاہنے والوں کا انتظار کرتے ہیں۔ مجھے کہانی اور روایت دونوں نے متاثر کیا۔

دور سے انور میاں ہاتھ ہلاتے چلے آ رہے تھے۔ سات بج کر ۲۰ منٹ ہو چلے تھے۔ رئیس صاحب نہیں آئے، انور نے آتے ہی دریافت کیا۔ میں نے انور کو دن بھر کی رپورٹ دی۔ انور بھیڑ کو جانچنے لگا اور میں رئیس بھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کا خیال آتے ہیں وکیل اختر مرحوم کا ایک شعر بے ساختہ یاد آ گیا :

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا
اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا

رئیس بھائی کے ساتھ لکھنؤ کی یاد بھی آئی۔ ساتھ ہی ان کا شعر ذہن میں مچلنے لگا :

یہ لکھنؤ یہ گلِ چاندنی کا گلشنِ ناز
یہ سرزمیں یہ حسینانِ مہ جبیں کا وطن

رئیس بھائی کی شاعری ان کی شخصیت ہی کی طرح قد آور اور محدود سے لامحدود کی طرف سفر کا اعلان ہے اور اس اعلان میں ان کی ذات کا آہنگ بھی شامل ہے ـــــ ''صدا ابھرتی ہے'' ابھی میں نے پوری نہیں پڑھی۔ نہ ہی مجھے اس پر تبصرہ کرنے کا ارادہ ہے۔ مگر ورق گردانی میں جو اشعار نظروں سے گزرے دل پر نقش ہوتے چلے گئے۔ ان کے چند اشعار نہ صرف مجھے یاد رہ گئے تھے بلکہ میرے دل کی ترجمانی بھی کرتے تھے :

سوچتا ہوں کبھی دریا ہوتا
میں کسی شہر نہ ٹھہرا ہوتا
کاش اس عمرِ گریزاں سے الگ
کوئی لمحہ مرا اپنا ہوتا

انور کے کچھ کہنے پر میں رئیس بھائی کی جوگ بجوگ والی شاعری کے سحر سے باہر نکلا ـــــ لیجیے حضور خراماں خراماں نیوی بلیو لانگ کوٹ میں چلے آ رہے تھے۔ گھڑی ٹھیک ساڑھے سات بجا رہی تھی۔ ایک مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جناب نے آداب کیا۔ جاپانی کورنش بجالانا اور ساتھ ہی لکھنوی آداب، رئیس بھائی کا دوآتشہ انداز بڑے غضب کا تھا۔ انھیں دیکھ اور پرکھ کر جاپانی بھی سر دھنتے ہوں گے۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی انور کا خیال تھا کہ رئیس بھائی کا آداب جاپانیوں کو لوٹ لیتا ہوگا۔

آپ لوگ دیر سے تو نہیں کھڑے ـــــ ؟ رئیس بھائی نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے جگہ اتنی پر بہار بتائی کہ ہم لوگ یہاں ساری رات آپ کا انتظار کر سکتے تھے۔ انور نے چہکتے ہوئے کہا! حضور آپ دونوں کی عمر کا خیال رکھتے ہوئے میں نے جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ ہم سب ہنس پڑے۔ جیسے جیسے شام بھیگ رہی تھی، بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے پیرس کی شاہراہ شانزے لیزے اور نیویارک کی براڈوے یاد آ گئی۔ بھانت بھانت کے لوگ۔ زرق برق ملبوسات میں فیشن پریڈ کرتے گزر رہے تھے۔ بجلی برساتی جاپانی بچیاں، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے دلبروں کے ساتھ علاقے کو گل و گلزار بنائے کسی اچھے ریستوران یا شبینہ کلب کی تلاش میں سرگرداں تھیں!

''سمراٹ'' انڈین ریستوراں، رئیس بھائی کا محبوب نعمت کدہ تھا! خاص کر جب بلقیس بھابھی کراچی میں ہوتی ہیں حضور کی حاضری یہاں بڑھ جاتی ہے۔ ریستوراں کے پنجابی مینیجر نے بڑھ کر ہم

لوگوں کا استقبال کیا۔اس نے ٹھیٹ پنجابی میں خیریت معلوم کی۔رئیس بھائی نے خالص اردو میں جواب دیا اور ہم لوگوں کو ایک اچھا کارنر ٹیبل مل گیا۔ویٹرس نے سلام کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ لڑکی جاپانی تھی—— پتہ چلا انڈونیشین ویٹرس ہے اور رئیس بھائی کی باقاعدہ حاضریوں نے اسے ٹوٹی پھوٹی اردو سکھا دی تھی۔ ہم لوگ مینو میں الجھے ہوئے تھے کہ وہ آرڈر لینے آ گئی —— رئیس بھائی نے ہم لوگوں سے پوچھا —— ہم نے تکلّفاً کہہ دیا کچھ بھی منگوا لیجیے۔ویٹرس کو حضرت کی پسند کا خود اندازہ تھا۔چکن پالک، لیمب ونڈالو، دال مکھنی اور نان —— چلئے صاحب مسئلہ حل ہوا۔ہاں ساتھ میں کوک اور اورینج جوس!

میں نے کہا رئیس بھائی یہ کھانا پینا تو چلتا رہے گا۔آپ شعر سنائیں۔ پہلے جناب نے ٹالا' پھر سگریٹ سلگائی۔ایک مجھے بڑھایا۔ایک لمبا کش لیا۔کچھ سوچا پھر مسکرائے۔میں نے کہا حضور عطا ہو۔ان کا ذہن کہیں خلا میں بھٹک رہا تھا :

سارے موسم اسی کے موسم تھے
فصلِ گل سے ملے خزاں سے ملے

واہ —— سبحان اللہ! ٹوکیو کی حشر سامانیاں' جاپانی بچیوں کی دلگیر مسکراہٹ' مغلیہ پکوان کی روح افزا خوشبو اور ریستوراں کی رومان پرور سرگوشیاں —— سب بھول کر میں واہ واہ کر رہا تھا مگر حضور! عرصہ بعد بھرپور غزل کا شعر سنا تھا۔رئیس بھائی نے بڑی مسحور کن آواز میں شعر دوبارہ پڑھا۔ویٹرس کولڈ ڈرنک لے کر آ گئی تھی۔ہمیں کہیں اور گم دیکھ کر خاموشی سے گلاس رکھ کر چلی گئی۔ ہر ایک نے اپنا گلاس سنبھالا۔ پھر دوسرے شعر کی فرمائش ہوئی —— رئیس بھائی نے کہا۔میں کلاسیکل جاپانی شاعری جسے ''تنکا'' کہتے ہیں' سناتا ہوں۔ یہ پانچ مصرعوں والی نظم ہوتی ہے۔ بصد شوق سنائیں۔میں تو یہاں کی شاعری کے تعلق سے صرف ''ہائیکو'' کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے کہا —— آپ کیا ہر اردو والے کے تصرف میں ''ہائیکو'' پہلے سے موجود ہے۔ بلکہ اب تو ہمارے محترم شعراء اور شاعرات نے اسے اردو شاعری کی ایک صنف بنا دیا ہے۔ میں نے اسی لیے ایک نئی صنف ''تنکا'' کا انتخاب کیا ہے۔ بارہویں صدی کے عظیم شاعر ''سٹی گیو'' کی ایک مشہور ''تنکا'' ملاحظہ فرمائیں! ارشاد! میں نے اور انور نے ایک زبان ہو کر کہا اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''میرا دل اب دشتِ فلک ہے
جیسے

موسمِ گل کی کہر

اس دنیا میں اب کیا رہنا

عزمِ سفر ہے جانِ جاناں!''

اب دیکھئے زندگی کی بے ثباتی کا یہ رنگ دیکھ کر اردو غزل کی روایتی ادائیں ذہن میں آتی ہیں یا نہیں ۔رئیس بھائی نے پوچھا۔گویا حضرتِ ''سٹی گیو' جاپان کے میؔر نکلے ۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا—— بالکل' بھئی جاپان کی شاعری خالص مشرق کی شاعری ہے ۔ یہ اپنی کلاسیکل صفات میں ہماری اردو کی روایتی شاعری سے بہت قریب ہے ۔ رموزِ عشق ،ان کی لطافتیں —— اظہار کی علامتیں اردو غزل کی طرح یہاں کے مزاج میں بھی رچی بسی ہیں ۔رئیس بھائی بڑے جذباتی انداز میں جاپانی سخنوری پر روشنی ڈال رہے تھے کہ دال مکھنی ،چکن پالک وغیرہ لے کر ویٹرس آ گئی ۔میز پر کھانا چن دیا گیا۔ پہلے خوشبو' پھر کھانا اچھا لگا۔ ہال میں ہمارے علاوہ بیشتر جاپانی بیٹھے تھے اور مغل پکوان کی پسندیدگی کا ثبوت دے رہے تھے ۔ایک کنارے کچھ امریکن لڑکے بھی جاپانی لڑکیوں کو قورمے کے متعلق اتنی تفصیل سے بتا رہے تھے کہ گویا یہ مصالحے دار قورمہ ان کی خاص ایجاد ہو! ویسے مغلیہ پکوان اب عالمی ڈش بنتا جا رہا ہے ۔ہم لوگ چٹخارے لے لے کر کھا رہے تھے ۔ ہمارے بازو کے ٹیبل پر ایک جاپانی جوڑا شرمایا سا بیٹھا سبھوں کو تک رہا تھا۔شاید وہ پہلی بار انڈین ریستوران آئے تھے ۔محترمہ بھنے ہوئے زعفرانی مرغ مسلّم کو اتنی ہی حیرت سے دیکھ رہی تھیں جتنی حیرت سے میں نے اسادا صاحب کی دعوتِ خاص پر باہوش کچی مچھلی کو دیکھا تھا۔ میں خواہ مخواہ مسکرا پڑا۔رئیس بھائی نے میری چوری پکڑتے ہوئے اشاروں سے پوچھا معاملہ کیا ہے؟ پہلے میں ہنسا پھر قصہ کچی مچھلی کا سنا دیا —— اب وہ ہنسنے لگے ۔ مجھے احساس ہوا کہ ہماری ہنسی کا کچھ اور مطلب ہمارے پڑوسی نہ لے لیں ۔ میں نے فوراً موضوع بدلا اور کہا —— صاحب مجھے بھی چند جاپانی اشعار یاد ہیں ۔ پتہ نہیں کس کے ہیں' مگر مجھے پسند ہیں!

گویا دنیا ایک شبنم کے قطرے کی مانند ہے

مگر ہماری دنیا تو ہے —— !

یا پھر وہ شعر کہ

دوستو مجھ سے دور رہو

تا کہ میں تنہائی میں دن بھر پھولوں کی عبادت کر سکوں!

جاپان کی زیادہ تر شاعری اور مصوری امپریشنسٹ تھی اور آج تک ہے ۔ان کے یہاں نہ خودی کے فلسفے

کی گہرائی ہے نہ کسی دیگر فلسفے کا جھگڑا! ہاں بودھ ازم کے زیر اثر دنیا کے فانی ہونے کا احساس گہرا ہے ۔مختصر یہ کہ جاپان کا شاعر مناظرِ فطرت کا عاشق ہے۔ ''سٹی گیو'' اگر میرؔ صاحب ہیں تو ''ہائیکو'' کا معروف شاعر ''باشوؔ'' کو غالبؔ کا مقام حاصل ہے۔ساتھ ہی جدید شاعری میں ''سانتوکا'' ہمارے ن.م.راشد کے عقیدے کو اپنائے ہوئے ہیں' مگر کمال یہ ہے کہ بیشتر شاعری کا کلام قدیم کلاسیکی بازگشت لیے ہوئے ہے۔

ویٹرس کے ٹوکنے پر احساس ہوا کہ کھانا ہم بہت پہلے ختم کر چکے ہیں۔رئیس بھائی نے رس ملائی اور مسالے والی چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے پوچھنے لگے کھانا ٹھیک تھا یا آپ وضع داری نبھا رہے تھے — میں نے کہا سچ پوچھیے تو مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میں تو آپ کی باتوں سے سرشار ہوتا رہا۔میرے لیے یہی بہت ہے۔انور نے یقین دلایا کہ ''واقعی کھانا اتنا ہی مزیدار تھا جتنی آپ لوگوں کی باتیں'' خوش ذائقہ رس ملائی اور مسالے والی گرما گرم چائے نے ساری باتوں کا نشہ دوبالا کر دیا۔

رات گیارہ بجے تک بیٹھے ہم لوگ دیگر بہت سی باتیں کرتے رہے۔اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر ریستوراں والوں پر رحم آیا۔رئیس بھائی نے کہا یہاں ریڈیو پر آپ کا ایک انٹرویو ہوگا۔ پرسوں صبح اسادا صاحب آپ کو اس کی تفصیل بتا دیں گے۔ مجھے فون کر لیجیے گا میں آپ کو لے چلوں گا — میں نے کہا ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''

رئیس صاحب نے پتہ نہیں کتنے ہزار ین کا بل چکایا اور ہم سب سونف و مصری چباتے باہر آگئے۔ راستے کی بھیڑ اور رونق دونوں بانہیں پھیلائے ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھیں مگر میں دن بھر کی تھکن سے چُور تھا۔رئیس بھائی سے شکریہ کے ساتھ اجازت چاہی اور انور کے ساتھ ڈولتا ہوا ان کے دولت کدے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

کانکریٹ کے جنگل میں منگل

اسکول کے دنوں میں جاپان کے متعلق کچھ سنہرے تصور ذہن کے اسکرین پر ناچا کرتے تھے—— کیمونو زیب تن کیے، پنکھا جھلتی، ناچتی ہوئی گیشا گرلز —— چیری کے دلکش شگوفے، ہیرا تراشے جوہری اور سر اٹھائے فیوجی یاما —— ہاں یاد آیا میرا ایک دوست عباسی، ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتا تھا (اب اس کے بچے جمع کرتے ہیں) اور جاپانی ٹکٹوں پر فیوجی یاما کے عکس کو وہ اکثر فیوجی یاما کا پہاڑ کہا کرتا تھا (اس کے بیوی بچے آج بھی کہتے ہوں گے)۔ اسے بلکہ مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ یاما کے معنی پہاڑ اور فیوجی اس کا نام تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے بہت سے لڑکے کوہِ ہمالہ کا پہاڑ —— سنگِ مرمر کا پتھر اور آبِ زمزم کا پانی کہتے تھے! ان ہی دنوں گھر میں بتائے بغیر ایک فلم ''پرل ہاربر'' دیکھی تھی۔ تب ہی تاریخ کے کچھ نافراموش صفحات سامنے آئے تھے —— چیری کے شگوفے خون میں تربتر ہو رہے تھے۔ ہیرا تراشنے والے اور پھولوں سے پیار کرنے والے لوگ فاشسٹ وحشی ہو چکے تھے۔ انھیں پیلے وحشی پکارا جانے لگا اور پھر پورا جنوبی ایشیا خون کی ہولی کھیل رہا تھا! پھر ایک دلدوز دھماکہ —— لرزہ خیز سانحہ، ہیروشیما پر ایٹم بم کا بھیانک تجربہ! ساری دنیا ان کی وحشت کو بھول کر ان کی خیر خواہ بن گئی۔ ہیروشیما اور ناگاسا کی عالمی امن کے لیے ایک استعارہ بن گیا۔ مگر یہ لوگ تمام ہمدردی کو طاق پر رکھ کر اپنی شکست کا رونا رونے کی بجائے ملک کی تعمیرِ نو میں مصروف ہو گئے۔ اسے ایک زبردست تجارتی اور صنعتی طاقت میں ایسا تبدیل کیا کہ فری ورلڈ کی ریس میں سب سے آگے نکل گئے۔

۱۰/ مارچ ۱۹۸۹ء کی ایک خوش گوار صبح میں ٹوکیو کے کانکریٹ جنگل میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی شہرِ دل گداز ہے جسے امریکی بمباروں نے تباہ کر دیا تھا۔ یقین نہیں آتا۔ ملبے کے ڈھیر کو دلکش اسکائی لائن میں برسوں کے اندر تبدیل کر دینا اسی قوم کا یارا ہے۔ سچ ہے جاپانی جو کام کرتے ہیں تن من دھن سے کرتے ہیں۔ ہر پراجیکٹ کو مکمل ترین کرنے میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ انھیں Perfectionist کہلانے کا مالی خولیہ ہے۔ ان کی خوش حالی اور ترقی میں ایک زرّیں لفظ کارفرما ہے ''حلیمی''۔ پہلے زمانے میں یہ لوگ رومانٹک حد تک خوش مزاج اور حلیم ہوا کرتے تھے۔ آج کمرشیل یا پروفیشنل حد تک کم گو مگر وضع دار ہیں۔ ہم شاذ و نادر ہی جان پر کھیلا کرتے ہیں مگر یہ لوگ پاسداری میں خود کشی کرنے سے بھی نہیں چوکتے —— میں نے بہت کم کسی جاپانی کو بحث کرتے سنا۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ان

کے یہاں اسکولوں میں بحث مباحثے کے لیے کلاس ہوتے ہی نہیں —— ایک تو یہ شرمیلے بھی ہوتے ہیں مگر شام ڈھلے بار کی مدھم روشنی میں یار لوگ بحث بھی کر لیتے اور بیباک بھی ہوجاتے ہیں۔ مگر سورج کی روشنی میں یہی کام کے بندے محنت کش اور جفا کش' بے حد ماڈرن مگر اندر سے بے پناہ روایتی اور وطن پرست!

''شنجوکو'' اسٹیشن کے مغربی حصے میں پندرہ برسوں کے اندر تیرہ فلک بوس عمارتیں کھڑی ہوگئی تھیں۔ آج یہ علاقہ نہ صرف تجارتی مراکز کے لیے مشہور ہے بلکہ ٹورسٹ بھی یہاں بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ بارہویں صدی سے آباد اس شہر کو پرانے زمانے میں ''ایڈو'' کہتے تھے۔ اسے ۱۸۶۸ء سے ابتک ملک کی راجدھانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میں تاریخ کے تانے جوڑ رہا تھا کہ خیال آیا کہ اس فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں کچھ دیکھا جائے۔ میں جانتا تھا۔ یہاں کی عمارتیں نیویارک کے اسکائی اسکریپرس سے اونچی تو نہ ہوں گی —— اس کی وجہ جاپان کے زلزلے تھے۔ پھر بھی ان لوگوں نے جو عمارتیں بنائی تھیں' انھیں اتنا مضبوط اور جدید تکنیک سے آراستہ کر رکھا تھا کہ زلزلوں کا جھٹکا برداشت کر جائیں!

یہاں کی مشہور عمارتوں میں جاپانی ڈائٹ بلڈنگ کا بڑا ذکر سنا تھا۔ میں سمجھا یہاں بھی شمالی امریکہ کی طرح ڈائٹ کلب اور سلیمنگ سنٹر یعنی صحت کے مرکز اور دبلے ہونے کی وبا پھیل چکی ہے مگر معلوم ہوا کہ ڈائٹ بلڈنگ یہاں کی راجیہ سبھا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ تقریباً ۱۷ر سالوں میں ۷۷۸، ۲۴۵، ۲ مزدوروں نے اسے موجودہ شکل عطا کی۔ ان تفصیلات سے ہی میں خوش ہوگیا اور اسے دیکھنے کی خواہش نہ ہوئی! راستے میں کیو پلازا ہوٹل دیکھا جو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ فائیو اسٹار بھی تھا! پھر ورلڈ ٹریڈ سنٹر بلڈنگ دیکھی جو محض ۴۰ر منزلہ تھا۔ اس وقت نیویارک کا ۱۱۲ر منزلہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر یاد آ گیا۔ پھر میں نے نقشہ اپنے سامنے پھیلا۔ ''سومی ٹومو بلڈنگ ۵۲ر منزلہ''، ''شنجو کو مسوئی بلڈنگ ۵۵ر منزلہ''، ''سن شائن بلڈنگ ۶۰ر منزلہ''۔ تو گویا سن شائن ٹوکیو شہر کی سب سے اونچی عمارت تھی۔ میں نے قریب کے سب وے سے ٹرین پکڑی اور ''ایکو بوکورو'' روانہ ہوا۔

''سن شائن سٹی'' ایشیا کی سب سے اونچی عمارتوں میں سے ایک ہے۔ نیویارک کی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی طرح اس میں بھی سپر فاسٹ لفٹ لگی تھی۔ ایک لمبی قطار یہاں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ میں بھی اس قطار میں لگ گیا۔ جب لفٹ اوپر اٹھنے لگی تو اندازہ ہوا کہ یہ کچھ زیادہ ہی سپر فاسٹ ہے۔ ۶۰۰ر میٹر فی منٹ کی رفتار سے ہم بڑے ہی آرام کے ساتھ ۶۰ویں منزل پر صرف ۳۵ سیکنڈ میں پہنچ چکے تھے۔ سارے سیاح حیرت زدہ تھے۔ اوپر ایک منظر بینی کے لیے ڈیک بنا تھا' ساتھ ہی دوربین لگی تھی اور ۱۰۰ر

کیلومیٹر کی حد تک صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ نیچے زندگی پوری برق رفتاری کے ساتھ بھاگ رہی تھی مگر دور مضافات میں ماحول ہرا بھرا اور پرسکون لگتا تھا۔ چوبی کاٹج ، پانچ منزلہ پگوڈے، سبزے کے تختے اور چیری کے لدے پھندے شگوفے ۔مگر ان سب سے دور بہت دور''فیوجی یاما'' پر سورج کی کرنیں آنکھ مچولی کھول رہی تھیں۔تھوڑے تھوڑے وقفے سے کوئی آوارہ بادل کا ٹکڑا سامنے آجاتا اور منظر دھندلا جاتا۔ پھر وہی چاندنی پگھلتی محسوس ہورہی تھی۔اچانک ذہن میں استادِ محترم معین احسن جذبی کا شعر مچلنے لگا :

اس افق کو کیا کہیے ' نور بھی دھندلکا بھی

بارہا کرن پھوٹی ' بارہا غبار آیا

برف پوش اس پہاڑ پر ایک عجیب پراسرار کشش تھی کہ بس دیکھا کیجیے —— دوربین اس منظر سے ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فیوجی یاما کی قدم بوسی کو ضرور جاؤں گا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کی لائن بڑھتی جارہی ہے۔اس لیے وہاں سے ہٹ گیا کہ دیگر لوگ بھی فیوجی یاما کی زیارت کرلیں۔

اس بلڈنگ میں تجارتی دفاتر ،آرٹ گیلری و میوزیم ، پرفارمینس ہال، ہوٹل اور ریستوران، شاپنگ مال اور پارک کے علاوہ ایک عظیم الشان ایکویریم بھی تھا جس میں کوئی ۲۰،۰۰۰ مچھلیاں ،تقریباً ۴۰۰ر اقسام کی تیرتی پھر رہی تھیں ۔ باہر ایک بہت بڑا فوارہ تھا جس پر روشنی اور پانی کے دھاروں سے مختلف پیغام دیا جارہا تھا۔کبھی یہ خوش آمدید کہتا' کبھی کوئی اشتہار اور تھوڑے تھوڑے وقفے میں وقت اور موسم کا حال بتارہا تھا۔ یہ فوارہ مجھے بہت اچھا لگا۔ جاپانی کارستانی نے یہاں کمپیوٹر لگانے میں کوئی تکلف نہ کیا تھا ۔فوارے کی گھڑی بارہ بجا رہی تھی ۔دھوپ کھلی ہوئی تھی پھر بھی موسم کچھ خنک تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے اس فیشن زدہ علاقے میں لنچ لینے کی ٹھان لی اور سن شائن سٹی سے نکل پڑا۔

کچھ ہی دور چلا تھا کہ کچھ تنگ سی گلیاں نظر آئیں جہاں چھوٹی چھوٹی دورویہ دکانیں، دستکاری کے نمونے اور کھانے پینے کا سامان بیچ رہی تھیں ۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایسے ماڈرن علاقے میں ایسی تنگ گلیاں بھی موجود ہیں ۔ پتہ چلا کہ ۱۸۶۸ء کے عہدِ میجی کی یادگار ہیں ۔ جاپان میں ہر جگہ قدیم و جدید کا حسین سنگم نظر آتا ہے اور اس امتزاج کو ان لوگوں نے بڑے پیار سے اپنا رکھا ہے۔ ہر جاپانی مجھے مذہبی یا روحانی طور پر ایک دوسرے سے مختلف نظر آیا۔مگر وطن وقوم اور ثقافت کے معاملے میں ہر کوئی ایک دوسرے سے جڑا نظر آیا۔ ہمارے یہاں ہم زبان، ہم کلمہ اور ہم وطن سب ایک دوسرے سے بیزار نظر آتے ہیں۔جس کو جہاں موقع ملا اس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کردی۔خیر ہم کہاں کے دانا تھا؟

ہم لوگ اسی میں خوش ہیں' کیا کریں۔ آؤ یار پیٹ پوجا کریں' ہم نہیں سدھریں گے بس!

آج کل ٹوکیو میں امریکن فاسٹ فوڈ کے علاوہ ایک اور وبا پھیلی ہوئی ہے۔ جسے دیکھو''گورومے'' کے لیے پاگل ہوا جارہا ہے۔ پتہ چلا کہ فرنچ لفظ گورمیت کی جاپانی شکل گورومے ہے اور ہر فیشن ایبل علاقے میں فرنچ، اٹالین، جرمن، گریک اور انڈین ریستوران کی بھرمار ہے۔ ان کے علاوہ مختلف گورومے کلب بھی خوب چل رہے ہیں۔ اخباروں میں گورومے فوڈ پر نت نئے مضمون روز چھپ رہے ہیں۔ یعنی نئی نسل نے ابلے چاول اور کچی مچھلی کے علاوہ'' پیٹے ڈی فوئی گراس'' اور'' اسپاگھیٹی'' کو دل و جان سے اپنا لیا ہے۔

میں ہر ورائٹی کے گورومے ریستورانوں میں تانک جھانک کرتا علاقے کا معائنہ کررہا تھا کہ ایک اٹالین اسپاگھیٹی ہاؤس نظر آیا۔ میری بھوک بڑھ گئی اور میں بے اختیار اس میں داخل ہوگیا۔ ہوسٹس نے جھک کر جاپانی آداب عرض کیا اور ساتھ ہی ہیلو بھی کہا اور مجھے ایک قاعدے کا سائڈ ٹیبل مل گیا ——

ویٹرس نے بھی جھک کر کورنش بجایا اور مسکراتے ہوئے جاپانی میں شروع ہوگئی۔ میں نے فوراً جیب سے'' جاپانی سیکھو'' کتاب نکالی اور اپنی مدد کے جملے ڈھونڈنے لگا۔ کچھ گھبراہٹ بھی ہوئی کہ یہ گورومے گلے نہ پڑ جائے۔ ویٹرس'' استرے شی ماس'' کہتے ہوئے چلی گئی۔ یہ جملہ میں نے سن رکھا تھا۔ شاید اس کا مطلب'' معاف کیجیے'' تھا!

میں نے مینو میں اپنی پسند کی چیز تلاش کی۔ سوچا سیدھی طرح اسپاگھیٹی کھایا جائے۔ ویٹرس اس بار تیار ہو کر آئی تھی۔ (شاید اس نے بھی اندر جا کر'' انگلش بول چال'' کی کتاب کھول کر دیکھا ہو)۔ بڑی ادا سے اس نے'' یس پلیز'' کہتے ہوئے آرڈر بک نکالی۔ میں نے بھی بڑے جاپانی انداز میں (اس کتاب کی مدد سے) کہا'' سوپاگھیتی''۔ محترمہ نے کہا'' حیٔ''! (یعنی ہوں' ہاں' اچھا)۔ ویٹرس نے کچھ پوچھا۔ میں سمجھ گیا' پوچھ رہی کھاؤ گے کیسے' یعنی کس کے ساتھ —— میں اس وقت تک مطلب کی چیز کتاب میں ڈھونڈ چکا تھا۔ میں نے کہا'' شاہان پینی اوں'' یعنی مشروم اور'' نین نی کو'' یعنی لہسن —— لڑکی کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جاتی میں نے کوک کی فرمائش بھی کر دی۔ کچھ سوچ کر اس نے پوچھا'' کوہ کا کورا؟'' اس بار میں نے کہا'' حیٔ'' —— بندی لگی مسکرانے۔

جاپانی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جہاں'' کولا'' بولنا ہو'' کورا'' کہتے ہیں اور جہاں'' ربڑ'' بولنا ہو'' لبڑ'' بولتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹرس کوک کا گلاس لے آئی۔ پھر اس نے چاپ اسٹک میرے آگے رکھی اور بتایا'' واری باشی'' ٹھیک وقت پر میں شکریہ کا جاپانی لفظ بھول گیا۔ ہڑبڑا کر میں نے اٹالین میں'' موچو گریسیاس

’’یعنی بہت بہت شکریہ کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ کم بخت جاپانی شکریہ کوئی لمبا چوڑا جملہ تھا جو میں کوشش کے باوجود یاد نہ رکھ پا رہا تھا۔ ویٹرس ایک چھوٹی سی ٹوکری میں کچھ لائی اور ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہنے لگی ’’فورانسو پان‘‘ اور چلی گئی۔ اس میں روٹی اور مکھن کی ٹکیاں تھیں۔ مجھے تو یہ معلوم تھا کہ ’’پان‘‘ سے مراد روٹی ہے مگر اسے دیکھ کر اور چکھ کر معلوم ہوا کہ ’’فورانسو پان‘‘ سے مراد فرنچ بریڈ ہے۔ لڑکی نے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مسکرا مسکرا کر خاصا سبق پڑھا ڈالا تھا ـــــ کاش میرے بچپن کے استاد بھی مسکرا کر سبق دیتے ہوتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، آج بھی سبق کے نام پر وہ سرمہ لگی اپنے حلقوں سے ابلتی آنکھیں یاد آجاتیں ہیں۔ ہمارے استادوں کو کچھ نہیں تو جاپانیوں سے مسکراہٹ ضرور سیکھ لینا چاہیے۔ جاپانی آداب میں مسکراہٹ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

ابھی میں فرنچ بریڈ اور جاپانی تبسم پر غور کر رہا تھا کہ ’’اسپا گھیٹی‘‘ آ گئی۔ اس کے مزے میں چاپ اسٹک کا استعمال آڑے آ رہا تھا۔ پھر بھی سنبھل سنبھل کر میں کھاتا رہا اور باہر کے آواگون سے لطف انداز بھی ہوتا رہا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ویٹرس آدھمکی۔ اس نے دو خلال رکھتے ہوئے کہا ’’یوبی‘‘۔ میں نے کہا اچھا جی۔ وہ پلیٹ اٹھانے میں لگ گئی۔ اس بار ہم تمام باتیں پڑھ کر تیار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ’’استرے شی ماس‘‘۔ اس نے میری ترقی پر حیرانگی کے ساتھ ابرو اونچے کیے اور کہا ـــــ حیٔ! میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ـ’’کوہی‘ کریمو‘ ساتو‘‘ (کافی، کریم اور شکر) وہ گردن ہلاتی اور مسکراتی آرڈر لینے چلی گئی۔ مجھے مسکراتی ویٹرس بہت اچھی لگتی ہیں۔ کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ سنجیدہ اور اترے چہرے کی ویٹرس خواہ مخواہ اچھا کھانے کو بدمزہ کر دیتی ہیں۔ پھر گھر کے کھانے و ماحول اور ریستوران کی سروس میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ کافی آئی۔ میں ہولے ہولے کافی کی چسکی لیتے کتاب میں بل کا جاپانی لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ ویٹرس دوبارہ ایک چھوٹے سے طشت پر بل لیے حاضر ہوئی۔ جاپانی سبق اور اٹالین اسپا گھیٹی وغیرہ کی قیمت صرف تیرہ سو ین تھی، یعنی کوئی سوا دو سو روپے۔ میں نے اس میں ویٹرس کی مسکراہٹ اور ٹپ کے دو سو ین جوڑے اور ۱۵۰۰ ین ادا کر کے، بہت سنبھلے ہوئے ’’دوموآری گاتو گزائی ماس‘‘ یعنی شکریہ کہتا باہر نکلا ـــــ زندگی اسی رفتار سے بھاگ رہی تھی جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا!

میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکی اور ’’امپیریل پیلس‘‘ چلنے کو کہا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے نقشہ پھیلا کر شاہی محل کا ٹھکانہ دیکھا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم شاہی محل کے ایسٹ گارڈن کے سامنے اترے۔ سامنے مشہور ’’امپیریل ہوٹل‘‘ بھی تھا۔ اس نے وقت کے تھپیڑوں کو برداشت کیا تھا۔ کتنے زلزلوں اور بمباریوں سے بچتا چلا آ رہا تھا۔ یہ نیویارک کے والڈرآف ایسٹوریا کی

طرح لگا۔اس کی برساتی میں دولت مند سیاح اپنی انفرادیت کے ساتھ نظر آرہے تھے! میں شاہی محل کی طرف بڑھا۔ٹوکیوشہر کے قلب میں یہ محل کوئی ۲۵۰ءا ایکڑ باغات میں گھرا ہوا شاہی خاندان کا مسکن ہے۔ ۱۳۳۱ء سے ۱۸۶۸ء تک شاہی خاندان کیوٹو امپیریل پیلس میں رہتا تھا۔ پھر وہ سب یہاں منتقل ہو گئے ۔پہلے یہ ''ایڈو'' محل کہلاتا تھا اور یہ ''ٹوکوگاواشوگن'' کا ہیڈکوارٹر تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد ایسٹ گارڈن کا گیٹ آیا مگر وہاں کھڑے سنتری نے دور ہی سے ہاتھ ہلا کر منع کیا —— میں سمجھ گیا اندر آنا منع ہے۔ پتہ چلا صرف نئے سال کی خوشی میں اور بادشاہ کی سال گرہ پر جنتا اندر آسکتی ہے اور آج اتفاق سے نیا سال اور شہنشاہ دونوں گزر چکے تھے۔ ڈیڑھ ماہ پہلے ہی شہنشاہ ہیروہیٹو گزر گئے تھے اور ابھی تک محل میں سوگ کا سلسلہ جاری تھا۔ شاہی محل جو ایک قلعہ نما تھا کچھ زیادہ ہی حفاظت میں گھرا ہوا تھا۔ مجھے واشنگٹن کا وہائٹ ہاؤس یاد آیا۔ انکل سیم کے مکان میں کیسے دھڑلے سے میں دندناتا پھر رہا تھا' گو کہ بندوق تانے سنتری وہاں بھی کھڑے تھے مگر شخصی آزادی حاصل تھی۔ بھئی تمام اوچھی حرکتوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کے باوجود امریکہ میں جمہوریت کے فوائد اور شخصی آزادی حاصل ہے اور تمام تر ترقی و کارخنداری کے باوجود جاپانی فیوڈل نظام کو سینے سے لگائے خوش ہیں۔ ہائے کتنے سادہ ہیں یہ لوگ' قسم سے —— بیچارے جاپانی!

شاہی محل بلکہ محلات کے چاروں طرف پائن کے جھنڈ پھیلے ہیں۔ پھر اس سے پرے ایک فصیل کھڑی ہے۔ اس کے گرد ایک گہری خندق ہے جس میں راج ہنس اپنی اپنی صراحی دار گردن اٹھائے' جمہوریت اور فیوڈل نظام سے بے پرواہ بڑے سکون سے تیر رہے ہیں' شاید انھیں اپنی قید کا احساس بھی نہیں ہے —— کم بخت یہ احساس اور آگہی تو ہمیں مار ڈالتی ہے :

یہ آگہی بھی عجب ہے قیدِ بامشقت ہے
نہیں ہے جرم کوئی جرمِ آگہی کی طرح

میں شاہی محلات کو چھوڑ کر کچھ دیر ان سایہ دار پائن کی چھاؤں میں ستایا اور راج ہنس کے جوڑوں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہا' پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

محل سے کچھ فاصلے پر ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن تھا۔ یہ بھی جدید اور قدیم فنِ تعمیر کا شاندار سنگم لگا۔ ایک حصہ ''مارونوچی'' کہلاتا ہے جو سرخ اینٹوں سے ۱۹۱۴ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ امسٹرڈیم کے سنٹرل اسٹیشن کے ماڈل پر بنا ہوا ہے۔ اس نشاۃِ ثانیہ والے رخ سے دوسری طرف جدید طرز کی عمارت والا حصہ ''یاسو'' ہے۔ اس گرانڈ ٹرمینل اسٹیشن پر کچھ دیر میں بھٹکتا رہا۔ آمد و روانگی کے بورڈ پر دس پبلک ٹرین اور اتنے ہی سب

وے کے اوقات درج تھے۔ پتہ چلا کہ روزانہ سات لاکھ مسافر یہاں سے گزرتے ہیں۔ (جی میں آیا کہ ان لوگوں کے کش گزار کروں کہ بھیا اتنے مسافر ہمارے ریلوے اسٹیشن پر زندگی گزار رہے ہیں) یہاں بارہ پلیٹ فارم پانچ منزلہ زمین کے اندر اپنے میں ایک جہاں آباد کیے ہوئے ہیں۔

میں دو نمبر پلیٹ فارم سے ٹوکیو ٹاور کے لیے ''ہاما متسو چو'' اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ چار بج چکے تھے اور دفتر سے چھٹی کا وقت ہو چلا تھا۔ ٹرین میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ٹوکیو کی آبادی کلکتہ اور نیویارک سے کسی طرح کم نہ تھی مگر یہاں نہ کلکتے کی وحشت زدہ بھیڑ تھی نہ نیویارک کی دھکم پیل۔ یہاں کی بھیڑ کچھ مہذب سی تھی۔ ویسے بھی جاپانی بھاگ دوڑ کے باوجود سنجیدہ ''سویک سینس'' رکھتے ہیں۔ میں نے کسی کو راستے میں ایک دوسرے سے الجھتے نہ دیکھا۔ ایک سائیکل سوار کی کسی راہ گیر سے ٹکر ہو بھی جاتی تو ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آتی۔ دونوں کپڑا اجھاڑتے ہوئے ایک دوسرے سے معذرت کر کے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ میں نے سوچا عجیب ٹھنڈی قوم ہے۔ کوئی اپنے جذبات کا صحیح اظہار ہی نہیں کر پاتا۔ ''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'' یا شاید انھیں اس کا علم ہی نہیں کہ ایک دوسرے کا گریبان کھینچنے میں کیا مزہ آتا ہے؟

انور کے کہنے پر میں ٹوکیو ٹاور پہنچ تو گیا مگر دیکھا جاپانیوں نے پیرس کے ایفل ٹاور کی کاربن کاپی بنا رکھی ہے۔ یہ لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ان کا ٹاور پیرس والوں سے نہ صرف اونچا ہے بلکہ ہلکا بھی ہے۔ ایفل کوئی ۳۱۲ / میٹر اونچا ہے جب کہ ٹوکیو ٹاور کوئی ۳۳۳ / میٹر لمبا ہے۔ دراصل یہ ایک براڈ کاسٹنگ اینٹینا جس کے اوپر جا کر ٹوکیو کی اسکائی لائن کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس میں مومی عجائب گھر بھی ہے جو لندن کے میڈم ٹسا دکی نقل ہے۔ اس میں ۲۰۰ / مشاہیر عالم کے مجسّمے رکھے ہیں۔ ٹاور پر جانے کا ٹکٹ صرف ۱۲۰۰ / ین کا تھا۔ مجھے انور پر غصہ آیا ساتھ ہی بوریت ہوئی کہ یہ قوم خود کو دنیا کے کسی خطے سے جوڑنا پسند نہیں کرتی، اس کے باوجود ان میں اختراع کے جراثیم کم کیوں ہیں۔ یہاں کم و بیش ہر چیز کسی نہ کسی سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہے۔ چین و ہندستان سے مذہب، فلسفہ، سنگ تراشی زبان و ادب لے لیا اور یورپ و امریکہ سے جدید ٹکنالوجی اور فیشن، ساتھ میں تھوڑی سی عریانیت ــــ ان کا اپنا کیا ہے، میں نے جھلا کر سوچا ــــ محنت ان کی اپنی ہے۔ صرف محنت یا مسکراہٹ، پیارے یہ کیا کم ہے۔ میں نے خود کو سمجھایا۔

تقلید کی اچھائی برائی کو ذہن سے جھٹک کر میں نے ایک پولس مین کو روکا اور اس سے ''گنزا'' جانے کا راستہ پوچھا۔ شکر وہ انگریزی جانتا تھا۔ اس نے میری ہاتھوں سے نقشہ لیا اور بتایا کہ یہاں سے

ٹرین کی جگہ آپ ٹیکسی لے لیں۔ کوئی بیس منٹ کا راستہ ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک ٹیکسی روکی ۔اسے ''گنزا'' بتایا۔عموماً ٹوکیو کے ٹیکسی والے شریف لگے یا پھر مجھے شریف ملے۔شام بھیگ چلی تھی اور راستے کی رونق بڑھ رہی تھی۔

ڈرائیور نے پوچھا پہلی بار آئے ہو؟ میں نے کہا ''ہئی'' وہ مسکرایا' جاپانی آتی ہے آپ کو —— بس کام چلاؤ۔ میں نے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ عام ڈرائیوروں کی طرح باتونی تھا۔اس نے بھی تاریخ کے البم پلٹنے شروع کر دیے۔''گنزا'' کے معنی چاندی کا شہر ہے۔اسے لندن کے ریجنٹ اسٹریٹ کے ماڈل پر بنایا گیا ہے اور یہ جاپان کا پہلا مغربی فیشن کا علاقہ ہے۔ایک گھڑیال والے ٹاور کے سامنے اس نے اتار دیا۔ ۱۰۰۰ ین لیتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ ۱۹۳۲ء میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس عمارت کو ''واکو بلڈنگ'' کہتے ہیں۔یہی ''گنزا'' کا سمبل بھی ہے!

نیون سائن' مرکری اور قمقموں سے جگ مگ کرتا ''گنزا'' واقعی چاندی کا شہر لگا۔ میں نے راستہ پار کیا اور چواسٹریٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یہ ریجنٹ اسٹریٹ سے زیادہ پیرس کی شاہراہ شانزی لیزے یا نیویارک کا ٹائم اسکوائر لگا۔ یہاں بھی فیشن ایبل بوتیک، ڈیپارٹمنٹل اسٹور، ریستوران، بار اور نائٹ کلب کی بہتات دکھائی دی۔ جب یہ تمام لوازمات ایک ساتھ یکجا ہوں تو اسٹریٹ ہُکرس لڑکیاں کیسے نہ ہوں۔انواع واقسام کی جنس سرِ عام سیل پر دستیاب ہے۔سیکس شاپ اور اسٹرپ ٹیز کا بھی معقول انتظام ہے مگر تمام عاشقی فاسقی اور نیم عریانیت کے باوجود یورپ اور امریکہ کی طرح سرِ عام بوس و کنار نظر نہ آیا۔ سنا تعلیم بالغاں کے لیے نیلی پیلی فلمیں بھی کچھ سنسر شدہ ہوتی ہیں —— اب تو کچھ مشرق کا لحاظ آڑے آتا ہوگا —— مگر انڈر ورلڈ بوہیما طوائفیں ویسی ہی ہیں جیسے اس پیشے کی ضرورت اور نزاکت ہے۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ ٹوکیو کے شبینہ کلب کی ڈانسر لڑکیاں رات کے دھندے سے فارغ ہو کر دن میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں۔گھر والے اسے معیوب نہیں سمجھتے —— واہ بڑا دل گردہ ہے گھر والوں کا اور لڑکیاں بھی امراؤ جان کی طرح خالص ادبی ذوق اور تعلیم کا شوق رکھتی ہیں (پھر یہاں کی ڈھائی سو یونیورسٹیوں میں طلباء کی حاضری بھی تو چاہیے) جب ہی تو گیشا گرلز ان کے فنونِ لطیفہ کا خاص حصہ ہیں —— خیر ہر ملک اور ہر شہر کے گنزا کے پسِ پردہ ان کی تاریک راتیں کراہتی ہوئی ملتی ہیں۔مگر کس سیاح کو اتنی فرصت ہے کہ وہ ان روشنیوں کے پیچھے سہما ہوا چہرہ دیکھے۔

دنیا کی سب سے زیادہ آرٹ گیلریاں ''گنزا'' میں موجود ہیں۔تقریباً ۳۰۰ گیلریاں' گراں قدر

عالمی آرٹ کے فن پاروں سے آراستہ ہیں ــــ یہاں آرٹ اسکول کے طلباء اور کچھ قلاش مصور اپنے ایزل سنبھالے سیاحوں کے اسکیچ بنانے میں مگن ہیں۔ایک ہزار ین میں پورٹریٹ سیاحوں کے لیے کچھ زیادہ بھی نہیں،اس لیے بیشتر مصور کام سے لگے نظر آئے۔مگر مجھے اندازہ تھا کہ دن بھر دھوپ میں جلنے کے بعد شام کی ٹھنڈک میں مصوروں کو کتنے سیاح ملے ہوں گے۔مصور اور آرٹسٹ کہیں کا ہو، رہتا اکثر پریشان ہی ہے، کماتے تو اصل میں آرٹ گیلری والے ہیں۔اب ہمارے یہاں بھی کتنے مقبول فدا حسین تک پہنچتے ہیں۔خود حسین کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح اس بلندی پر پہنچ پائے ہیں۔سچ ہے کہ آرٹسٹوں کی برادری عالم گیر ہے۔

کچھ دور ''سونی بلڈنگ'' کا سائن چمک رہا تھا۔یہ سونی الیکٹرانک والوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔دور سے کچھ موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ایک عالم کو ایک عمارت کے سامنے کھڑا پایا۔ہر کوئی اوپر دیکھ رہا تھا۔میری گردن بھی اٹھی، عمارت کی پیشانی پر ''میری آن بلڈنگ'' لکھا تھا۔اس سے اوپر ایک گھنٹہ نصب تھا، موسیقی کی آواز اسی گھنٹے سے آرہی تھی۔تھوڑے وقفے سے وہ گھنٹہ حرکت کرتا اور اس میں سے میوزک کے ساتھ کوئی کھلونا باہر نکل کر لوگوں کو خوش آمدید کہہ جاتا تھا۔۴۱ رمنزلہ اس عمارت میں دو بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور پانچ سنیما ہاؤس مختلف فلمیں دکھا رہے تھے۔اشتہار میں ایک نام ہالیووڈ کی فلم 'رین مین'' کا تھا۔ڈسٹن ہافمین کی یہ فلم نہ صرف ان دنوں بہت مشہور ہو رہی تھی بلکہ اسے آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد بھی کیا گیا تھا۔بھیڑ بہت تھی۔شاید یہ پہلا ہی ہفتہ تھا۔میں نے قطار میں لگ کر ۱۵۰۰ ر ین کا ٹکٹ حاصل کیا اور اندر جا کر ایک کنارے بیٹھ گیا۔فلم شروع ہوئی۔تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ ہافمین صاحب جاپانی فر فر بول رہے ہیں۔پہلے حیرت ہوئی، پھر غصہ آیا اور پھر اپنے اوپر ہنستے ہوئے ہم فلم چھوڑ کر باہر آ گئے۔مگر فلم میں ڈسٹن ہافمین کی اداکاری چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ بہترین اداکار کا پُر وقار آسکر اس بندے کو ضرور ملے گا۔جاپانیوں کو ہالی ووڈ کی فلمیں جتنی پیاری تھیں اپنی زبان اس سے زیادہ عزیز تھی۔

دن بھر کھٹے میٹھے تجربوں کو ذہن نشین کرتے ہم واپسی کے لیے چل پڑے۔بقول حضرت سٹی گیو :

دن جو گزر رہے ہیں
وہ اک رات کے کچھ
خواب سے ہیں
آج کا وقت بھی
اصلی نہیں لگتا ہے مجھے!

☆☆☆

یہ ریڈیو جاپان ٹوکیو ہے

میں ''ہاراجوکو'' اسٹیشن کے گیٹ پر رئیس بھائی کا انتظار کررہا تھا۔ آج ہمیں ریڈیو جاپان کی دعوت پر ایک انٹرویو ریکارڈ کرانا تھا۔ اساداصاحب سے فون پر بات ہوچکی تھی اوران کی ہدایت کے مطابق مجھے ساڑھے تین بجے یہاں رئیس بھائی سے ملنا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا ــــــ ۱۹۲۴ء کا تعمیر کردہ اس اسٹیشن کا چوبی مکان مجھےلندن کے مضافات والے کاؤنٹی اسٹیشن کی یاددلا رہا تھا۔ مجھےلندن شہر سے زیادہ اس کے سرسبز اور پُرسکون مضافات بہت پسند تھے۔

اس اسٹیشن پر نہ صرف جاپانی بلکہ فارنر اسٹوڈنٹ اور سیاح کچھ زیادہ نظر آرہے تھے۔ ساتھ ہی اپنے قومی لباس کیمونو میں سمٹی سمٹائی جاپانی بچیاں بڑے انداز سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' آجارہی تھیں۔ آج پہلی بار اتنی تعداد میں ایک ساتھ ایک جگہ کیمونو میں لڑکیاں نظر آئی تھیں۔ ضرور کوئی خاص دن یا تہوار ہے آج! میں نے سوچا! حالاں کہ یہ لباس بڑا پُر وقار اور جاپانی ثقافت کا سمبل ہے' پھر بھی اسے عام طور پر عورتوں کو پہنے نہیں دیکھا۔ ہوسکتا ہے مغربی فیشن جینز پینٹ اور ٹی شرٹ نے عادتیں بگاڑ دی ہوں۔

ٹھیک وقت پر رئیس بھائی مسکراتے چلے آرہے تھے۔ میں نے بڑھ کر آداب کیا اور خیریت پوچھنے کے ساتھ یہ بھی پوچھا کہ آج کوئی جاپانی عیدوغیرہ تو نہیں ہے؟ رئیس بھائی نے سنبھلتے ہوئے پوچھا' آپ کو فکر کیوں ہے! میں نے کیمونو نواز دوشیزاؤں کی طرف اشارہ کیا ــــــ اچھا ــــــ یہ بہار کی آمد اور ''سکورا'' یعنی چیرے کے شگوفے دیکھنے کے موسم کا اعلان ہے ساتھ ہی آج یہاں ''ویلن ٹائن ڈے'' (Valentine Day) ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ امریکی تہوار یہاں بھی اس اہتمام سے منایا جاتا ہے' محبت کرنے والے جوڑوں کا یہ تہوار میں نیویارک میں دیکھ چکا تھا۔ رئیس بھائی نے کہا آج کل دینو پارک میں چیری کا شگوفہ پھوٹ پڑا ہوگا۔ وقت نکال کر اسے دیکھنے ضرور جایئے گا۔ ہم لوگ اسٹیشن سے باہر نکلے۔ قریب ہی ایک کیفے میں رئیس بھائی نے کافی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ ابھی ہم لوگ اونچے اسٹول پر بیٹھے ہی تھے کہ کاؤنٹر پر رکھی کافی کی کیتلی' شکردان' کپ غرض ہر چیز لرزنے لگی اور بھیڑ میں اچانک سبھوں کی خاموشی اور زمین کے رینگنے کا احساس ہوا ــــــ رئیس بھائی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا' زلزلہ ہے ــــــ میں متزلزل ہونے سے پہلے سنبھل چکا تھا۔ خاص نہیں بہت ہلکا سا جھٹکا ہے۔ رئیس بھائی نے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ہونہہ! میں نے کیفے کا جائزہ لیا۔ ایک لمحے کے لیے ہر کوئی ساکت ہوگیا تھا مگر اب سب نارمل ہوچکے تھے۔ ہفتے بھر میں آج دوسری بار

زمین نے انگڑائی لی تھی۔کوئی ہفتہ پہلے اچھاخاصا ساڑھے چار پوائنٹ کا جھٹکا لگا تھا۔رئیس بھائی بولے۔ جی حضور اسی شام میں وارد ہوا تھا' ہنستے ہوئے بتایا۔آج مجھے بھی زیادہ محسوس نہیں ہوا تھا۔مگر اس دن —— مجھے وہ لرزش یاد تھی۔ سنتے ہیں ۱۹۲۳ء میں ۹۷ کا زلزلہ ٹوکیو میں آیا تھا۔ نہ صرف پورا ٹوکیو زیروزبر ہوگیا تھا بلکہ اس کے ساتھ بھیانک قسم کی آگ نے بھی بہت نقصان پہنچایا تھا۔ پھر حکومت نے فوری اقدامات اٹھائے اور شہر کو نیا چہرہ عطا کیا۔رئیس بھائی بتا رہے تھے۔ پھر وہ بھی تو سات پوائنٹ کا بھیانک زلزلہ تھا۔ پورے میکسیکو شہر میں تقریباً پچیس ہزار لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے! ابھی چند ماہ پہلے روس میں بھی بڑا بھیانک زلزلہ آیا تھا۔ پورا آرمینیا شہر زندہ درگور ہوگیا تھا۔

ہم لوگوں نے کافی ختم کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔کچھ ہی فاصلہ پر ''نپوں ہوسو کیو کائی'' یا جاپان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کی ۳۲ منزلہ جدید طرز کی عمارت تھی۔ گیٹ پر بیٹھے سیکوریٹی والے نے ہمیں روکا نہیں کیوں کہ رئیس بھائی .N. H. K سے منسلک بھی ہیں۔لفٹ پر پانچویں منزل تک جاتے ہوئے پتہ چلا کہ ''این ایچ کے'' پانچ لوکل ریڈیو اور ایک ٹی وی سروس پر مشتمل ہے۔۱۲ زبانوں میں ۸۱ عالمی زون پر اکسٹرنل سروسز کے پروگرام نشر ہوتے ہیں —— یہ ایک قومی ادارہ ہے اور تھرڈ ورلڈ کی طرح یہاں بھی حکومت کے زیرِ سایہ سارا کاروبار چلتا ہے۔

مجھے شمالی امریکہ کے پبلک ریڈیو سروس اور ٹی وی بری طرح یاد آئے جہاں ۲۴ گھنٹے لاتعداد ریڈیو پروگرام ۸۴ ٹی وی چینل ایک سے بڑھ کر ایک پروگرام نشر کرتے ہیں اور پریس وتقریر کی آزادی وتفریح کا صحیح مظہر ہیں۔اس ملک کی تمام کج روی کے باوجود یہاں کی اچھائیوں اور کھلی فضا میں سانس لینے کی نعمتوں کو میں فراموش نہیں کرسکتا —— کسی بھی پر بہار باغ میں جنگلی پھول اور خاردار جھاڑیاں تو ضرور ہوتی ہیں مگر بندہ کیوں نہ کوئی مہکتا گلاب پسند کرے!

ایک بڑے سے ہال میں مختلف زبانوں کی میز لگی تھی۔ایک میز جس پر اردو کی تختی لگی تھی۔رئیس بھائی نے رک کر کہا —— ہستنو صاحب' آپ ہیں جاوید دانش' میں نے جاپانی انداز میں آداب عرض کیا۔ جواب بھی انھوں نے اسی طرح دیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ستھری اردو میں بولے ''دانش صاحب میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا —— خوش آمدید' تشریف رکھیں!'' میں نے شکریہ ادا کیا اور ان کے مقابل بیٹھ گیا۔کیا آپ کچھ ریہرسل کرنا چاہیں گے' پروڈیوسر صاحب نے پوچھا؟ میرے جواب دینے سے پہلے رئیس بھائی نے کہا' جناب یہ ریڈیو سے منسلک رہے ہیں۔آپ بے فکر رہیں۔اچھا تو چلئے اسٹوڈیو چلتے ہیں۔میں اٹھا اور رئیس بھائی سے کہا چلئے! مگر ہستنو صاحب نے انھیں یہ کہہ کر روک

دیا کہ آپ وہ ترجمے والا کام دیکھ لیں۔ہم لوگ آتے ہیں۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ میں سمجھ رہا تھا رئیس بھائی انٹرویو میں ساتھ رہیں گے —— خیر میں پروڈیوسر کے ساتھ ہولیا۔

اسٹوڈیو تک جاتے ہوئے وہ ''این ایچ کے'' کی تفصیل بتاتے جارہے تھے۔ پتہ چلا کہ پہلا اکسٹرنل سروسز کا ایک گھنٹے والا ٹرانسمیشن ۵۳۹۱ء میں شروع ہو چکا تھا۔آج ایکس زبانوں میں روزانہ ۴۲ر گھنٹے کی براڈ کاسٹنگ ہوتی ہے جس میں اردو کا پروگرام روزانہ آدھا گھنٹے کا ہوتا ہے۔انھوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ جنوبی ایشیا کے سامعین کی خدمت میں ہم لوگ دنیا بھر کی تازہ ترین خبریں' بےلاگ تبصرے' مختلف شعبۂ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کا تعارف' جاپان کے تازہ ترین حقائق' جاپان کے دورے پر آنے والی اہم شخصیات کے انٹرویو' دلکش موسیقی اور دوسرے دلچسپ پروگرام پیش کرتے ہیں ۔ ہمارے پروگرام شارٹ ویو کی مختلف فریکوئنسیوں پر نشر ہوتے ہیں ۔ بھارت کے وقت کے مطابق ساڑھے نو بجے سے دس بجے رات تک اور پاکستان کے رات نو بجے سے ساڑھے نو بجے تک یہ پروگرام نشر ہوتے ہیں اور اس وقت ہمارے یہاں سات اناؤنسر موجود ہیں۔ہستنو صاحب ہمارے دوست طارق کی طرح بےتکان اور بےلاگ بولے چلے جارہے تھے۔ میں نے ریڈیو جاپان کی نشریات سنی نہیں تھیں مگر لگتا ہے یہ لوگ غیر جانب دار پروگرام پیش کرتے ہوں گے۔ اگر نہیں تو اس کی وجہ پوچھنا اور سوچنا فضول ہے!

پروڈیوسر صاحب نے مجھے اسٹوڈیو میں مائک کے سامنے بٹھاتے ہی پوچھا۔آپ کے جاپان آنے کا مقصد کیا ہے؟ ایسے اچانک سوالات پر میں ہمیشہ غیر سنجیدہ ہوجاتا ہوں —— میں نے کہا حضور! میرے دنیا میں آنے کا مقصد اب تک پوری طرح معلوم نہ ہوسکا —— آپ...... میرا مطلب ہے' ہستنو صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا' آپ جاپان سیاحی کے لیے یا کسی اور کام کے لیے آئے ہی —— ؟ صاحب! میں ٹھہرا آوارہ گرد۔آوارگی مجھے جنوبی ایشیا میں بھٹکا رہی تھی ۔ یہاں بھی اپنے چاہنے والوں سے ملنے آگیا ۔ اور میں کوئی ریسرچ اسکالر یا سائنس داں تو ہوں نہیں کہ ہر کام کا مقصد نوٹ کرتا پھروں کہ ''ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے!''

پھر آدھے گھنٹے تک دل کھول کر باتیں ہوتی رہیں۔ جاپانی پکوان سے لے کر زبان وادب اور سیاست ہر موضوع پر میری پسند اور ناپسند ریکارڈ کی گئی۔ سیاسی سوالوں کا گول مول جواب دیتا رہا کیوں کہ سیاست میں نہ میری دلچسپی ہے نہ دخل۔ میرے ناک بھوں چڑھانے سے کون سا بڑا ریفارم ہوجائے گا۔مگر سوالوں سے ایک بات ظاہر ہوئی کہ انھیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ان کے سسٹم کو لوگ کیا سمجھتے ہیں :

کہتی ہے مجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

کوئی تیس منٹ کی ریکارڈنگ کے بعد ہستنو صاحب نے کہا ''بس' شکریہ۔ہم اس میں سے بیس منٹ نکال لیں گے۔اب پتہ نہیں انھوں نے کون سے بیس منٹ نکالے۔ان کے موڈ سے تو لگتا تھا کہ انٹرویو نے میری لاج رکھ لی ہے کیوں کہ دفتر میں آتے ہی انھوں نے دراز سے دو خوبصورت پیکنگ والے ڈبے مجھے تحفے کے طور پر پیش کئے' میں نے تعزیماً جھک کر شکریہ ادا کیا!

مجھے یاد آیا کہ ایسی مہربانیاں پچھلے چند برسوں سے آل انڈیا ریڈیو والے بھی کرتے آ رہے ہیں۔ جب جب میرا وطنِ عزیز جانا ہوتا ہے' ریڈیو ٹی وی والے بہت یاد کرتے ہیں (پھر بہت یاد بھی آتے ہیں) لوکل اخباروں کی حوصلہ افزائیاں اپنی جگہ۔ایک زمانہ تھا جب میرے ڈرامے ریڈیو والے کسی نہ کسی مجبوری کے تحت واپس کر دیتے تھے۔مگر جب میں نے انگریزی اور بنگلہ ڈراموں اور یوتھ پروگراموں میں قدم جمانا شروع کیا تو اردو کی چادر خود بخود سر پر سایہ فگن ہونے لگی' پھر کہا جانے لگا —— ''تمہاری آواز ناگزیر ہے''۔پھر میں آواز کی حرمت بچانے کے لیے ہجرت کر گیا کیوں کہ بیجا تعریف سے آواز کی رینج کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔بقولِ حضرت مجتبیٰ حسین ''ان دنوں زبان اور کلچر کی حفاظت کے لیے بیرونی ملکوں میں جانا ضروری ہو گیا ہے۔'' اسی لئے دانش بھی کینیڈا چلے گئے۔اب وہ بھی محفوظ ہیں اور ان کی زبان اور کلچر بھی۔ہماری طرح نہیں کہ اپنی زبان و کلچر کی حفاظت کے بارے میں سوچتے ہیں تو خود کو نہایت غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔'' اس وقت مجھے اپنے جگری دوست زاہد لودھی کی بات یاد آ رہی ہے کہ ''میاں کبھی کے دن تو کبھی کی راتیں بڑی'' —— شاید آج کا دن بڑا تھا!

اردو کے سامنے ہندی کے پروڈیوسر کا ٹیبل تھا۔ان کے پروڈیوسر سے بھائی رئیس نے میرا تعارف کرایا' وہ مہاشے صرف مسکرانے پر اکتفا کر گئے۔ان کے پاس ہندی سیکشن کی مسز جین بھی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے بڑی اپنائیت سے نمستے کہا اور خیریت پوچھی۔میں نے ان سے بنگلہ والوں کا پوچھا۔وہ اپنی ٹیبل پر نہیں تھے اور میری جاپان میں بنگلہ بولنے کی حسرت ادھوری رہ گئی!

''این ایچ کے'' جاپان کا واحد براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک ہے جس کے اسٹوڈیو عوام اور سیاحوں کے لئے کھلے ہیں۔یعنی آپ اندر کی ریکارڈنگ اور شوٹنگ تیسری منزل سے دیکھ سکتے ہیں۔پاس ہی ''این ایچ کے'' کا پرفارمنس ہال ہے جس میں چار ہزار نشستیں ہیں۔ایک ۷۶۴۰ر پائپوں والا آرگن بھی اسی ہال میں رکھا ہے' جو ساری دنیا میں مشہور ہے۔''این ایچ کے'' کا ایک براڈ کاسٹنگ میوزیم بھی ہے جس کو میں وقت کی تنگی کی وجہ سے دیکھ نہ پایا۔اس کے ساتھ ہی ہمارا آج کا رنگارنگ کاریکرم سماپت ہوا۔اور ہم اس

بچے کی طرح، جو میلا دشریف کی بالوشاہی والی پڑیا لے کر خوشی خوشی گھر لوٹتا ہے —— اپنے جاپان ریڈیو کے یادگار تحائف لئے ''این ایچ کے'' سے نکلے۔

۱۹۶۴ء کے ٹوکیو اولمپکس میں ''ہاراجوکو'' کے علاقے کو جدید فیشن اور فرینچ اور اٹالین ملبوسات اور ڈیزائن کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔ آج بھی یہاں بے پناہ ماڈرن بوتیک موجود ہیں۔ ایک تین سو کیلومیٹر لمبی شاہراہ ''تاکے شیٹا'' میجی اسٹریٹ تک پھیلی ہوئی ہے، ہزاروں کی تعداد میں جوان لڑکے لڑکیاں یہاں دکانوں میں تاک جھانک کر رہے تھے۔ اس گلی میں کوئی میک ڈانلڈ تھا جہاں انور میرا انتظار کر رہے تھے۔ بھیڑ ایسی کہ حشر کے میدان کا ریہرسل ہو رہا تھا۔ یہاں جوان زیادہ تر امریکن جینز، ڈیزائنر ٹی شرٹ اور رے بین چشمے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ اس کے برعکس نیویارک اور ٹورانٹو میں لوگ جاپانی لیبل کے لیے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ کسی کو کسی طرح چین نہیں —— ! ہم لوگ دونوں جگہ کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ بھیڑ میں سے کسی نے مجھے پکارا۔ دیکھا کہ آزاد صاحب انور کے ساتھ باسکن روبن آئس کریم پارلر سے آواز دے رہے تھے۔ پتہ چلا کہ میک ڈانلڈ میں تل رکھنے کی جگہ نہیں' یار اس بھیڑ سے فوراً نکلو' میرا دم گھٹ رہا ہے' میں نے کہا۔

کچھ فاصلے پر ''یویوگی'' اسپورٹس اسٹیڈیم تھا جو جاپانی کاٹج کی طرح ایک پتھر نما عمارت تھی۔ یہ بھی اولمپکس کی یادگار ہے۔ سامنے ایک پارک تھا اور ساتھ ہی ایک لمبی سڑک پر رقص و موسیقی کا میلہ لگا تھا۔ یہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں جوان جوڑے جن میں مقامی کے ساتھ امریکن، ایرانی، مصری، افریقی، انڈو پاک اور بنگلہ دیشی' غرض ہر رنگ و نسل اور زبان کے جواں دل کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ یہاں مقامی بینڈ اور میوزک گروپ چھٹی کے دن اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسا سڑکی آرکسٹرا میں نے یورپ اور امریکہ کے کئی شہروں میں دیکھا تھا مگر یہاں کی طرف نہیں۔ اس وقت پارک میں کم از کم ۲۵ / یا ۳۰ / مختلف گروپ اپنے آرکسٹرا کے ساتھ جاز کی تیز اور زوردار دھنیں بجا رہے تھے۔ ان کا لیڈ سنگر نہ صرف ناچ رہا تھا بلکہ تماش بین بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ زیادہ تر دھنیں راک میوزک کی تھیں۔ بیشتر موسیقار پنک (Punk) اسٹائل کے بال تراشے اور چست کالی پتلون اور زنجیریں پہنے اپنی وحشت کا اعلان کر رہے تھے۔ یہ جاپانی پنک نیلے، گلابی اور پیلے بالوں میں اور کالے ملبوسات میں بڑے عجیب لگ رہے تھے۔ کچھ نے سر کا صفایا بھی کر رکھا تھا۔ ہر دس قدم پر ایک الگ گروپ اپنی منڈلی سجائے رنگ جما رہا تھا۔ اس بھیڑ میں کچھ لڑکے سب سے نمایاں تھے۔ سنجیدہ چہرا، لال کپڑا، ملٹری بوٹ اور سر پر لال پٹی باندھے یہ جنونی' الٹرا نیشنلسٹ رائٹ ونگ کے پکے وطن پرست ''یاکوزا'' گروپ کے لڑکے تھے۔ ڈسپلن

،اتحاد اور پوشیدہ اصول کے لحاظ سے انھیں ''جاپانی مافیا'' کہا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا ان کی وطن پرستی کو ہم سلام کرتے ہیں مگر اس رقص و سرور کے میلے میں ان کا کیا کام۔ آزاد نے بتایا کہ یہ کہیں بھی کسی وقت نظر آسکتے ہیں اور انھیں نظر انداز کرنا بہتر ہے۔ مگر میں ایسی عنقا شئے کی تصویر لیے بغیر نہ رہ سکا! معلوم ہوا کہ جاپان کے انڈر ورلڈ اور باضابطہ جرائم کی تاریخ ۱۸۸۰ء تک جاتی ہے۔ آج ''یاکوزا'' گروپ کے کارکن خود کو جاپانی اقدار کے علم بردار کہلواتے ہیں اور خود کو شہنشاہ کے وفادار اور محافظ سمجھتے ہیں۔ اس باضابطہ جرائم اور وطن پرستی کا بے سر ارشتہ مجھے بڑا عجیب لگا۔ شاید دنیا میں اور کہیں حق و باطل کی اتنی شاندار ملی بھگت نہ ہو!

یہ تو وہی بات ہوئی کہ :

''چوری میرا پیشہ اور نماز میرا ایمان ہے۔''

☆☆☆

چیری کے شگوفوں تلے پھول والوں کی سیر

کسی نے ٹھیک کہا ہے :''اگر جاپان کی الوہی روح کو دیکھنا چاہتے ہو تو چیری کے شگوفوں پر نظر ڈالو'' ـــــ قرونِ وسطیٰ کے نمائندہ شاعر ''سٹی گیو'' کو بھی پھولوں سے خاص لگاؤ تھا۔ بھکشو بننے کے بعد تمام دنیاوی خواہشوں سے قطع تعلق کر لینے کے باوجود وہ آخری دم تک پھولوں سے اپنے والہانہ لگاؤ کا دامن نہ چھڑا سکے۔ ان کی ۲۳۰ر نظمیں ''ساکورا'' یعنی چیری کے شگوفوں سے متعلق ہیں۔ سٹی گیو کا مشہور ''تنکا'' ہے :

''ہر ایک سمت پہاڑوں پہ
پھول چیری کے کھلے
کھلے ہوئے ہیں کہ موسم بہار کا آیا
ہر اک پہاڑ پہ لمبی ڈھلان پر ہر سو
سفید ابر ہے حدِ نظر تلک چھایا!

موسمِ بہار کی آمد آمد ہے۔ فضا خاصی خنک ہے۔ مگر وینو پارک میں جوق در جوق لوگ چلے آرہے ہیں۔ ۲۱ر مارچ کی ایک دلفریب صبح ہے۔ ہم اور انور دیگر مقامی لوگوں اور سیاحوں کی طرح چیری کے شگوفوں کو پھوٹتا دیکھنے آئے ہیں۔ وینو اسٹیشن جس کی تعمیر ۱۸۸۳ء میں میجی عہد کے دوران ہوئی تھی' آج ہر عمر کے مرد و زن سے اٹا پڑا تھا۔ اسٹیشن کے مقابل وینو پارک ہے۔ یہاں سیاحوں کی دلچسپی کے لیے کافی کچھ موجود ہے۔ جس میں چھ آرٹ و سائنس کے میوزیم، چڑیا گھر، ایک پانچ منزلہ پگوڈا، ٹوکیو فائن آرٹ گیلری، ٹوگوشو کا معبد، ایک دیو قامت ایکویریم، بہترین باغیچہ، دلکش پھولوں کے تختے اور سبزہ زار پھر ایک دورویہ لانبی سڑک جس کے دونوں طرف سکورا کے درخت، ساتھ ہی کئی قسم کے کیفے' ریستوران اور گفٹ کارنر!

پارک میں داخل ہوتے ہی ایک قدِ آدم مجسمہ نظر آتا ہے' یہ ''سائیگو ٹاکاموری'' اپنے کتوں کے لیے ہمیشہ کے لیے کھڑے ہیں۔ ''ٹوکوگاواشوگن'' کا تختہ الٹنے میں سائیگو کا بڑا ہاتھ تھا مگر یوں لگا کہ سنگ تراش نے بے چارے کو سلیپنگ سوٹ میں ہی یہاں کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر نیشنل سائنس میوزیم تھا۔ میں نے انور کو روکا۔ یار پھول والوں کی سیر میں آئے ہیں۔ تم اس سائنس اور کمپیوٹر میں کہاں جارہے ہو۔ میں نے واشنگٹن کا اسمتھ سونین میوزیم دیکھا ہے۔ اسی قبیلے کی چیز ہوگی۔ مجھے تو تم خالص جاپانی چیز

دکھاؤ۔ انور ہنستے ہوئے آگے بڑھے اور کہنے لگے' پھر تو ساری دنیا میں ایک ہی طرح کی چیزیں ہیں۔ گھومنے کا فائدہ؟ ایک طرح کی چیزیں ضرور ہوتی ہیں مگر ہر جگہ کی اپنی انفرادیت بھی ہوتی ہے۔ جیسے واشنگٹن میں انور جگر کہاں تھے۔ ہم لوگ ہنس پڑے۔ چلو تم کہتے ہو تو میوزیم بھی دیکھ لیں گے مگر وہ پھول یعنی سکورا کی طرف پہلے چلا جائے۔

وینو پارک کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں ہم کافی دیر چلتے رہے۔ جسے دیکھو ایک جانب سر اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ ہم بھی اسی طرف چلنے لگے۔ تھوڑی دور چل کر راستہ ایک طرف دورویہ درختوں والی سڑک پر گھوم گیا۔ ہزاروں چیری کے درخت سینہ تانے کھڑے تھے اور دونوں جانب چیری کے شگوفے راستے پر سایہ فگن تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کے سکورا کے پھول ایک مقام پر اتنی تعداد میں اور اس قرینے سے تھے کہ آنکھوں کو بڑے بھلے لگے۔ یہ جاپان کا قومی پھول ہے۔ اس کی سادگی اور بھینی بھینی مہک بہت اچھی لگی۔ میں خیال و خواب کی رعنائیوں اور ان شگوفوں میں گم تھا اور میاں انور تصویریں اتارنے میں مگن۔ ہم لوگ کچھ اور آگے بڑھے۔ لوگوں کا غول اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے ان درختوں کے نیچے چٹائی بچھا رکھی تھی۔ وہ گھیرا ڈالے بیٹھے ''ساکی'' پی رہے تھے اور بڑے جوش و خروش سے بہار کا استقبال کر رہے تھے۔ کچھ اور لوگ بیٹھے ایک باذوق اور خوش گلو شاعر کے کلام پر سر دھن رہے تھے۔ انور نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا کہ اس سکورا دیدنی کو ''ہانامی تہوار'' کہتے ہیں۔ عہدِ ایڈو سے یہ رسم جاری ہے۔ جاپانی شاعروں نے ایسے ہی پھولوں سے والہانہ عشق نہیں کیا۔ یہ عشق و ستائش کے لائق ہے :

''پیارے پہاڑی چیری کے درخت
آؤ ہم دونوں خوش ہو لیں
کیوں کہ ہمارا کوئی دوست نہیں
میرے بھائی ـــــ !''

۱۶ فروری ۱۱۹۰ء کوسٹی گیو نے کیوٹو کے پہاڑ ''ہیگاشی جوجو'' کے دامن میں اپنی جھونپڑی میں ۷۳ر سال کی عمر میں وفات پائی۔ انھوں نے مہاتما بدھ کے انتقال کے دن اپنی رحلت کی تمنایوں پیش کی تھی :

''مجھ پہ سایہ فگن ہو تمنا یہی
شاخ چیری کی پھولوں بھری
موسمِ گل میں مرنے کی آئے گھڑی
پھر مہینہ بھی ہو سال کا دوسرا

چاند کی چودھویں!''

ہر مہذب اور حساس قوم پھولوں سے پیار کرتی آئی ہے۔ مغلوں نے پھول والوں کی سیر کی بنا ڈالی۔ گو اب وہ قصہ پارینہ ہوا مگر شمالی ہند میں بسنت کا تہوار آج بھی بڑی دھوم سے منایا جاتا ہے مگر جو عقیدت اور عشق سکورا سے جاپانیوں میں دیکھی، میں نے کہیں اور نہ دیکھی تھی۔ واقعی یہ تہوار الوہی تھا! انور شاید کافی تصویریں اتار چکے تھے اور بولنے ہی والے تھے کہ بھیا کتنا سر دھنو گے۔ ہو گیا نظارہ —— میں اس خواب ناک منظر کو آنکھوں میں لئے خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔ انور نے پھر ٹوکا' بھئی یہ رائٹر لوگ کچھ زیادہ ہی حساس ہو جاتے ہیں' میں نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا! پھر میں نے کہا چلو شہزادے تمھیں کافی پلائیں —— چیری والے دو رویہ درختوں سے پرے چھوٹے چھوٹے کیفے' سرخ' گلابی' سبز جھنڈیاں لہراتے' پھولوں کے زائرین کے لیے کافی بیچ رہے تھے۔ ایک اسٹال پر رک میں نے اشارے سے دو کافی مانگی۔ اس نے لکھ کر ۳۰۰ ین مانگا' اوہ ہو ۳۰۰ ین کی کافی تو نیویارک میں بھی نہیں ملتی! مگر میں اپنے موڈ کی تازگی کو حساب کتاب میں خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خاموشی سے قیمت ادا کی اور ایک کپ انور کو بڑھایا اور پھر قریب کے بنچ پر بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ یہاں سے بھی سکورا کے لدے پھندے شگوفے نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی جشن مناتے' بلانوش اپنی ترنگ میں گاتے اور تالیاں پیٹتے جاپانی بھی نظر آ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے اور پھولوں کی تصویریں اتارتے سیاح بھی نگاہوں کا مرکز تھے۔

ہمیں راستے میں ۱۵۶۱ء والا ''ٹوگوشو' معبد ملا جس کے چوبی دروازوں پر ''ڈراگون'' رقص کناں تھے۔ اس سے تھوڑی دور ''شی نوبازو'' تالاب تھا۔ لوگ اس میں کشتیاں چلا رہے تھے۔ تالاب کے بیچ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس پر لکشمی دیوی کا تکیہ تھا۔ سولھویں صدی کے اس معبد کو ''بیس ٹین'' بھی کہتے ہیں۔ میں مزید زیارت گاہیں دیکھنے کے موڈ میں نہ تھا اس لیے واپسی کا راستہ لیا۔ سامنے ایک پانچ منزلہ پگوڈا کھڑا تھا۔ اس کے بعد ''نیشنل میوزیم آف ویسٹرن آرٹ'' کی عمارت تھی جس کے صحن میں ہی عظیم مائیکل انجیلو کے تراشیدہ شاہ کار نظر آ رہے تھے۔ انور نے میری طرف دیکھا کہ ارادہ کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں میں پیرس کے ''لوو'' میوزیم میں اچھی طرح دیکھ چکا ہوں —— اچھا ٹوکیو نیشنل میوزیم چلتے ہیں' انور بولے —— اچھا صاحب آپ کی قدردانی سر آنکھوں پر' چلیے!

''ٹوکیو نیشنل میوزیم'' باہر سے کسی عالی شان محل سے کم نہ تھا۔ ہزار ین والے دو ٹکٹ لے کر ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ یہ Medieval Art اور قدیم جاپانی لوک ورثہ کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں تقریباً

۸،۰۰۵/۷ عدد قدیم مورتیاں، چینی مٹی کے ظروف، چوبی دستکاری کے نمونے، تانبا اور پیتل کے اوزار، مختلف دھات کی مورتیاں ایستادہ تھیں۔ یہ جاپان کا سب سے بڑا عجائب گھر تصور کیا جاتا ہے۔ ابھی ہم آثارِ قدیمہ کی جھلکیاں دیکھ رہے تھے۔ تقریباً سو لوگ ایک قطار میں کھڑے تھے۔ پہلے مجھے کوفت ہوئی پھر انور سے کہا ''معلوم کرو۔ لنگر بٹنے والا ہے! اتنی بھیڑ کیوں ہے یار؟'' نیناجی مندر کی گیارہ سو سالہ برسی کے مبارک موقع پر مندر کے گنجِ گراں مایہ کی مخصوص نمائش پہلی بار عوام کے لیے رکھی گئی ہے' انور نے خبر دی۔ نیناجی بدھ مذہب کی قدیم اور سب سے زیادہ متبرک زیارت گاہ ہے جس کی بنیاد ۸۸۸ء میں شہنشاہ ''اودا'' نے رکھی تھی۔ اس نمائش میں کوئی ۱۲۱/۶ معرکتہ الآرا و نادر شاہ کار موجود تھے جن میں گیارہ عدد کو قومی گنجینہ و سرمایہ کا درجہ حاصل تھا۔ اسی وجہ سے جدید ہتھیاروں سے لیس محافظ قدیم شاہ کاروں کی رکھوالی کر رہے تھے۔

ایک بڑے اسکرین پر سولہویں صدی کے مقدس درباریوں کا عکس بنا تھا جسے مصور ''کانوٹا کانوبو' نے ۱۶۱۴ء میں تخلیق کیا تھا۔ اس کے بعد ایک عکس لال' پیلے اور سنہرے رنگوں کے ساتھ'' کاجا کومایو' یا مہامایوری کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ اس میں بدھ نما ایک چھ ہاتھوں والا دیوتا ایک مور پر براجمان تھا۔ یہ گیارہویں صدی کی چینی سانگ سلطنت کے دور کی نقاشی تھی۔ اس سے آگے بھیڑ نہ صرف جامد و ساکت تھی بلکہ فضا میں اگر کی بتیاں بی گمک رہی تھیں اور سنتریوں کا پہرہ سخت تھا۔ تین بڑی نادر وانمول گوتم بدھا کی مورتیاں سجی تھیں۔ دو ایستادہ اور ایک گیان ودھیان میں گم آسن جمائے۔ ان چوبی مورتیوں پر سونے کے پتر منڈھے تھے! انھیں ''امیتا بھاٹرائیڈ'' کے نام سے لوگ پوج رہے تھے۔ یہ بھی نویں صدی کی چینی ہیئن عہد والی تھیں۔ شاید اسی لیے گوتم کی شباہت تھوڑی چینی بھی لگ رہی تھی۔ اب ہمارے یہاں بھی تو کرسمس میں بنگالی مسیحی بھائی مریم کی مورت کو ساری اور یسوع کو دھوتی پہنا دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دیسی اور علاقائی عقیدت ہے۔ اصل معاملہ دل کا ہوتا ہے۔ پاس ہی قلمی بودھی صحیفوں کی قطاریں سجی تھیں۔ پھر کسی چینی شہنشاہ کا دستخط شدہ خط، حکمت اور طب کے نمونے اور چینی مٹی کے گلدان جس پر بدھا کے ہاتھ کا نقش اور کنول پھول کندہ تھے۔ ساتھ ہی بے شمار چینی خطاطی کے نمونے پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے!

یہ خاص نمائش بڑی اچھی لگی۔ اتفاقاً ہم لوگ اس میں شامل ہو گئے۔ مگر پتہ نہیں انھیں انگریزی سے کیا بیر ہے کہ ساری تفصیلات مقامی زبان میں درج تھیں۔ یا تو انور اٹک اٹک کر لنگڑاتے ہوئے پڑھ کر بور کر رہے تھے یا میں ہر دوسرے منٹ کسی شریف زادے کو پوچھ رہا تھا کہ بھیا یہ کیا لکھا ہے؟ اب یہ بھیا کے موڈ اور انگلش دانی پر منحصر ہوتا کہ وہ ہمیں کچھ بتائے۔ ہماری حالت کچھ اس دیہاتی کی طرح تھی جو

شوق میں آکر انگریزی فلم دیکھنے چلا جائے اور ہر منٹ بازو کی نشست والے کو یہ پوچھ پوچھ کر بور کرے کہ ہیرو کیا کہہ رہا ہے؟

ہم لوگ عش عش کرتے اس عجائب گھر سے باہر نکلے کیوں کہ باقی چیزیں بھیڑ کی دلچسپی کے لیے تھیں جو ہر میوزیم میں ہوا کرتی ہیں یعنی چپٹا لوٹا اور لنگڑی مورتیاں۔ ابھی ہم کھلی فضا میں پوری طرح سانس بھی نہ لے پائے تھے کہ انور ایک عمارت کے سامنے اڑ گئے۔ بھائی ''یہ رائل میوزیم ہے'' ہے۔ یہاں شاہی چیزیں دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں —— داخلہ ٹکٹ تین سو ین تھا۔ میں نے دو ٹکٹ لیے۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ایک لڑکی کارڈ وغیرہ بیچ رہی تھی۔ اندر ایک بڑا سا ہال تھا اور کنارے ایک سیڑھی اوپر جا رہی تھی۔ نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ اس لیے ہم لوگ اوپر چلے گئے مگر اوپر جو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے! ایک وسیع وعریض ہال بالکل صاف ستھرا پڑا تھا۔ ہاں بڑے بڑے اسکرین پر جاپانی خطاطی کے نمونے دیوار سے لگے ہوئے تھے۔ لیجیے کر لیجیے جو کرنا ہے! میں نے انور کو چھیڑتے ہوئے کہا ''بھئی کیا شاہی دیواریں ہیں'' —— یہاں بھی مصیبت پرانی تھی! کم بختوں نے کہیں ایک لفظ بھی انگریزی کا غلطی سے بھی نہ لکھا تھا۔ میں نے انور کو پھر ٹہوکا دیا ''حضور! کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں''۔ انور پہلی بار بھڑک اٹھے اور ایک صحت مند گالی دیتے ہوئے کہنے لگے چلئے ٹکٹ کا پیسہ واپس لیتے ہیں، یہ تو سراسر لوٹ ہوئی —— میں نے کہا —— شانت، شہزادے شانت! بس نیچے چل کر یہ پوچھ لو کہ ہمیں کس برتے پر لوٹا گیا ہے اور یہ کس کے سوگ کی کالی تحریریں یہاں ہمارا منہ چڑا رہی ہیں!

نیچے پہنچ کر انور بڑی بی سے الجھے ہوئے تھے کہ پڑوس والی بچی نے مجھ سے شکستہ انگریزی میں پوچھا معاملہ کیا ہے؟ پہلے تو میں نے کہا مبارک ہو آپ انگلش بولنے کی زحمت گوارا کرتی ہیں۔ بچی نے کہا' تھوڑی بہت کر لیتی ہوں۔ اب انور بھی میری طرف ہو لیے تھے۔ ہماری سمسّیا سن کر بچی پہلے مسکرائی، پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ آپ دس منٹ مجھے دیں، میری کافی بریک ہونے والی ہے۔ پھر میں آپ لوگوں کو ان تحریروں کے بارے میں بتا سکوں گی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ انور کی بوریت بھی کم ہوئی۔ پھر میں نے انور سے سرگوشی میں کہا ''یار چھوڑو بھی، ہم بے وقوف تو بن ہی گئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ پتہ چلے گا کہ یہ فلاں بادشاہ کا شاہی فرمان ہے! چلو چلتے ہیں! انور نے بھی سرگوشی کی کہ تھوڑا صبر تو کیجیے اور جیب سے چیونگ گم نکالا۔ ایک مجھے بڑھایا اور ایک لڑکی کو پیش کیا جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا! میں نے کہا' اچھا تو بات یہاں تک پہنچ گئی —— انور نے بڑے اطمینان سے کہا' بھائی صاحب آپ تو کل پرسوں میں چلے جائیں گے۔ مجھے اسی شہر میں رہنا ہے۔ ثقافتی تعلقات ہموار کرنا بہت ضروری ہے اور ہم

لوگ ہنس پڑے! انور واش روم کی طرف چلے گئے اور میں ویو کارڈ دیکھنے لگا۔ کچھ مجھے پسند بھی آئے۔ کارڈ سو ین فی عدد تھا۔ میں دس کارڈ کی قیمت ادا کر رہا تھا کہ انور آ گئے ـــــ ساتھ ہی لڑکی نے بھی اپنی دکان بڑھائی۔

ہمیں یقین نہ تھا کہ کسی عجائب گھر میں کوئی زندہ عجوبہ بھی ملے گا۔ وہ لڑکی بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ آئی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگی' میرا نام ''مینوری دائی'' ہے۔ میں یونیورسٹی میں تاریخ کی طالبہ ہوں اور یہاں پارٹ ٹائم کام کرتی ہوں۔ انور نے اپنا تعارف انگلش میں اور میرا جاپانی میں کچھ بڑھا چڑھا کر کرایا۔ جب مس مینو کو پتہ چلا کہ میں کینیڈا سے نازل ہوا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی اور میرا پتہ مانگا۔ میں نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے یاد دلایا کہ آپ ہمیں ان سیاہ تحریروں سے آگاہ کرنے آئی تھی! ہاں' وہ ـــــ یہ تحریریں دراصل جاپان کے قدیم شعراء کے قلمی نسخے ہیں! کیا' میں چونکا ـــــ جی ہاں ـــــ یہ ہمارے شعراء جیسے باشؤ' سانتوکا اور سٹی گیو وغیرہ کے واکا' تنکا اور ہائیکو صنف کے نمونے خود ان کے قلم سے کتابت شدہ ہیں' اسی لیے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ میں بڑا متاثر ہوا۔ واقعی جاپانی اپنے ادب اور ادیب و شاعر کی وقعت جانتے ہیں اور قدر کرتے ہیں۔ شاعر ان کے نزدیک کسی ہیرو سے کم نہیں۔ میرا سر عقیدت سے نہ صرف ان مشاہیر قلم کے لیے جھک گیا بلکہ اس نازنین کی عزت بھی میری نگاہ میں بڑھ گئی۔ میں نے کسی ملک کے شاعر کا کلام اس طرح عجائب گھر کی زینت بنتے نہ دیکھا تھا۔ یہ بالکل انوکھی چیز تھی! کتابیں اور قلمی نسخے دیکھے تھے مگر سوچیے کہ غالب کا شعر قد آدم اسکرین پر خود غالب کے قلم سے کتاب شدہ کسی عجائب گھر میں محفوظ ہو ـــــ کیا عقیدت ہے' واہ! پھر مس مینو نے دیگر شعراء کے کلام سے متعارف کرایا! یہ قدیم شاعر ''یوکی تا گیما'' کی نظم ہے ـــــ یہ ''سا نگ ادا'' کا شعر ہے اور پھر وہ کسی شاعر کے شعر کا مطلب انگلش میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا متن کچھ اس طرح تھا کہ ''میرے بستر کے نزدیک آج کوئی چراغ نہیں ہے ـــــ سوائے میرے کھڑکی والے تنہا چاند کے''!

کچھ دیر ہم لوگ جاپانی شاعری پر بات کرتے رہے۔ میں نے مس مینو کا تین بار تعظیماً جھک کر شکریہ ادا کیا اور کافی کی دعوت دی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا ـــــ میوزیم کے پرلے طرف ایک چھوٹا سا کیفے تھا۔ ہم لوگ اس میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ میں آرڈر دیتا' انور نے کافی کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی بل ادا کرتے ہوئے کافی کی ٹرے اٹھائے ایک میز پر آ گئے! ''مینوری دائی'' سے مل کر ہم لوگ خوش تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم کیفے سے نکلتے' میاں انور نے ہماری بھولی بھالی گائیڈ کا فون نمبر لے لیا'

بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ کوئی کام ہوتو مجھے فون کرلیں! ہم لوگ کافی ختم کر چکے تھے۔ مینو کو بھی کاؤنٹر پر واپس جانا تھا۔ میں نے بہت سنبھلتے ہوئے اور ذہن پر زور دیتے ہوئے ''دوموآری گاتو گذائی ماس''یعنی شکریہ کہا —— میری شستہ جاپانی سن کر مینو مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے کہا ''زندگی نے وفا کی تو اسی طرح کسی عجائب گھر میں ڈھیر ساری حیرانگی لیے ہم لوگ کبھی نہ کبھی پھر ملیں گے! آج ہم لوگوں نے صحیح معنوں میں پھول والوں کی سیر کی تھی۔ ''مینوری وائی'' کی الوداعی مسکراہٹ نے پھر سے سکورا کے شگوفوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔

☆☆☆

جاپان کی نوٹنکی وغیرہ

ٹوکیو میں نازل ہوئے مجھے آج ٹھیک تیرہواں دن تھا۔ انیس مارچ کی صبح کو معمول کے مطابق ہم دیر سے اٹھے، بلکہ انور کے اٹھانے پر اور چائے کی پیالی دیکھ کر آنکھ کھلی۔ کوئی دس بجے ہوں گے مگر اس دوران جوان اپنے دو کلاسوں کی حاضری لگوا کر اخبار اور چائے سمیت میرے سر پر سوار تھا۔ اخبار کے ساتھ ایک روزنامچہ ''ٹور کمپینئن'' بھی تھا۔ دوسرے ہی صفحہ پر کسی ''کابوکی تھیٹر'' کا لمبا چوڑا اشتہار دیکھتے ہی مجھے اپنا جگر اور رنگ منچ کا ساتھی ظہیر انور بری طرح یاد آیا — سفر میں مسلسل میں رہتا ہوں مگر دنیا کے کس کونے میں کون سی نوٹنکی تہلکہ مچائے ہے اس کی خبر ظہیر یوں جمع کرتا ہے جیسے عاشق لوگ پری جمالوں کا فون نمبر — پھر ہر سفر سے پہلے وہ مجھے اس طرح تھیٹر کی ''انسٹرکشن'' دیتا ہے کہ فلاں ڈراما ضرور دیکھ لینا اور ہاں وہ بیکٹ ''ویٹنگ فار گودو'' اور شاہ کا ''کینڈیڈا'' اور کاموکا شہرہ آفاق ''کیلی گولا''۔ ایک بات اور ''ریسپیکٹ فار ایکٹنگ'' کتاب مل جائے تو لیتے آنا — بالکل اسی طرح جیسے کسی زیارت گاہ کو جانے والی ٹولی کو تجربہ کار لوگ پھول، شیرینی اور مجاور صاحب کی جابیجا خبروں سے آگاہ کرتے ہیں!

کلکتے سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے بڑی معصومیت مگر گمبھیر اسٹائل میں جاپانی نوٹنکی سے بھی فیض یاب ہونے کی تلقین کی تھی۔ پچھلے بارہ دنوں سے کچھ اردو والوں اور کچھ پھول والوں اور والیوں کے چکر میں ظہیر کی وصیت بھول گیا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ میں ٹھنڈی چائے حلق میں انڈیلی اور با آوازِ بلند انور کو مژدہ سنایا کہ آج مابدولت نوٹنکی دیکھنے جائیں گے۔ انور نے بڑی مسکین اور حسرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور حیرت سے کہنے لگا ''بھائی صاحب کچھ دیر پہلے تو آپ ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک تھے، یہ اچانک — خیر حضور کو میں گرم چائے پلاتا ہوں! میں نے پراعتماد لہجے میں اعلان کیا کہ گرم چائے سے میرے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں آنے والی ہے، ویسے تم چائے تو بناؤ جب تک میں ضروریات سے فارغ ہوتا ہوں۔

ناشتے میں آملیٹ اور چائے کے دوران انور کو یہ فکر تھی کہ اکثر لوگ یہاں آکر ''اسٹرپ ٹیز شو'' کے لیے بے چین رہتے ہیں اور میں نوٹنکی کے لیے مچل رہا تھا۔ میں نے اسے یقین کے ساتھ بتایا کہ یہاں کے شو میں نہ تو پیرس اور نیویارک والی وارفتگی ہوگی اور نہ ان کے یہاں عریانیت کا اپنا کلاسیکی انداز — پھر جاپانیوں کا صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا انداز بڑا بھونڈا تھا — اس آنکھ مچولی سے بہتر ہے آج ''نوٹنکی ایکسپڈیشن'' میں نکلا جائے! اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ اسادا صاحب سے کچھ معلوم

کیا جائے۔ اتفاق سے وہ مجھے گھر پر مل گئے ــــــ انھوں نے کہا ویسے تو آپ کا ''کاراجوزو'' کے تجرباتی ڈرامے پسند کرتے جس کا ماڈرن ڈراموں میں بڑا نام ہے' مگر آج کل اس کا کوئی شو نہیں چل رہا ــــــ ہاں! آج شام ''چیکامتسومون زامون'' جسے جاپان کا شیکسپیئر کہتے ہیں' اس کا کوئی شو ہے۔ آپ ٹورسٹ انفارمیشن کو ۱۱۹۲-۳۰۵ پر فون کر کے تفصیل حاصل کر لیں۔ میں نے اسادا صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر بات ہو گی کہہ کر دوسرا مطلوبہ نمبر ملایا ــــــ انگلش میں کوئی ٹیپ چل رہا تھا جس پر آج کی تقریبات کی تفصیل بتائی جا رہی تھیں۔ تمام تفصیلات نوٹ کر کے میں تنہا اس مہم پر نکل پڑا!

جاپان کے قدیم آرٹ اور کلاسیکل تھیٹر میں تین خاص فارم ''بنز اکو''، ''کابوکی'' اور ''نوہ'' ڈراما شامل ہے۔ تقریباً تیرہویں صدی میں ''نوہ'' ڈراما وجود میں آیا ــــــ جو بنیادی طور پر انگلستان کے Morality Plays کی طرح مذہبی طرز کا تھا۔ شروع میں یہ شنتو معبد اور تہواروں میں دیوداسیوں کے رقص کے طور پر کھیلا جاتا تھا۔ ان ڈراموں کا ہیرو اکثر شنتو راہب ہوتا تھا۔ میں ''نوہ'' ڈرامے کا آموختہ ذہن نشین کرتے ''کانزے نوہ گاکوڈو'' ہال پہنچا۔ جو ''شی بویا'' اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی محترمہ نے بورڈ پر اشارہ کیا۔ ۷۰۰۰ اور ۵۰۰۰ کے ٹکٹ دستیاب تھے اور سب سے کم ۴۰۰۰ والا ٹکٹ فل ہو چکا تھا۔ میں نے ۵۰۰۰ ین کا ٹکٹ لیا۔ میٹنی شو کچھ دیر پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اندر آدھا ہال خالی تھا اور میری طرح کے سر پھرے سیاح میرا ساتھ دینے کو موجود تھے۔ اپنی پسند کی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ بیشتر مغربی سیاح تھے۔ اسٹیج پر ایک منحنی سا کردار ایک بے سری بانسری بجا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ ''نوہ'' ڈراما کے تمام کردار مرد ادا کر رہے ہیں۔ بقیہ کرداروں کے چہروں پر بھی میک اپ کی جگہ ایک خاص قسم کا ماسک تھا! اس طرح ہر کردار چہرے کے تاثر کی بجائے مومنٹ اور آواز سے اپنے کردار کو ابھار رہا تھا۔ اسٹیج چوکور اور بغیر پردے کا تھا۔ نیچے اسٹیج کے سامنے موسیقاروں کی ایک منڈلی بیٹھی تھی۔ مختلف قسم اور سائز کے ڈھول' نفیری اور بانسری بجا رہی تھی۔ ایک طرف ایک گروپ کورس میں کچھ گا بھی رہا تھا۔ ساتھ ہی کچھ کردار رقص کے ساتھ اونچی آواز میں ڈائیلاگ ادا کر رہے تھے۔ ماحول خالص آغا حشر والا تھا صرف اسٹیج کشمیری کی جگہ جاپانی تھا۔ میرے سامنے بیٹھی ایک امریکن لڑکی لگاتار چپس کھائے جا رہی تھی۔ اس کی چرمراہٹ ہمیں خاصا بور کر رہی تھی۔ میرے ساتھ والی سیٹ کے انگلش صاحب ''نوہ'' کو باآواز بلند گریک کلاسیکل ڈراما قرار دے رہے تھے۔ مجھے سارا معاملہ ''رام لیلا'' لگ رہا تھا ــــــ بلکہ یہ ایک سمبالک ڈراما تھا جس میں (Prop) پراپ برائے نام استعمال کیا گیا تھا۔ ڈراما چوں کہ میرے آنے سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور ڈائیلاگ جاپانی میں تھے اس

لیے میں اب تک کہانی اور پلاٹ کے سرے نہیں ملا پا رہا تھا۔ اچانک ایک کالا دیو نمودار ہو کر چیختا ہے۔ انداز اس کا دبستانِ آغا حشر جیسا تھا' لہجہ ترش :

''دانش کس خیال میں ہے

جان تیری وبال میں ہے'' ــــ وغیرہ!

اس دیوزاد کو دیکھ کر مجھے بچپن کی ایک سرد رات یاد آ گئی ہے۔ میرے محلے کے ایک بھلے فروٹ مرچنٹ کے (پہلونٹی کے) لڑکے کا ختنۂ شاہی تھا۔ بچے کو مسلمان کرنے کی خوشی میں رت جگا اور میراثنوں کی منڈلی کا خاص اہتمام تھا۔ میں خاموشی سے بغیر گھر میں بتائے رات گئے تک شہزادہ گلفام، سبز پری، کالے دیو اور کلو جمعدار کے ہمراہ پرستان کی سیر کرتا رہا۔ جب ڈرتے ڈرتے گھر پہنچا اماں جان بید لیے استقبال کو ٹہل رہی تھیں۔ اس رات کی حجامت کے باوجود میں سبز پری کے رُخِ جمال کو آج تک نہ بھولا تھا ــــ ''پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے'' اسٹیج کے دیو نے شاید جاپانی میں یہی کچھ گرج کر کہا اور میں بچپن کی گلیوں سے نکل کر دوبارہ ''نوہ'' ڈرامے کے مستقبل پر غور کرنے لگا!

کچھ لوگ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ دیکھا دیکھی کچھ اور اٹھے! میں سمجھا جاپانی میں انٹرویل کا اعلان ہوا ہوگا۔ میں بھی اٹھ کر باہر آ گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے پتہ چلا کہ ڈرامے کا نام ''ننجو شیکو'' ہے۔ دراصل یہ ایک رزمیہ ڈراما تھا اور سولہویں صدی کے دو نامور جنگجو ''تاکیدار شنگین'' اور ''یوسوکی کینشن'' کے جنگ کی داستان تھا۔ اس تاریخی ڈراما میں ایکشن بہت تھا۔ لاٹھی، تلوار، اٹھا پٹخ غرض بارہ مسالہ موجود تھا!

سولہویں صدی کے جنگجو جاگیردار ''شوگن'' سماج نے ''نوہ'' ڈراموں کی بڑی سرپرستی کی۔ اسے مندر سے نکال کر دربار میں لائے۔ اس دور میں ''سمورائی'' جنگجو اس سماج کا آئیڈیل ہیرو ہوا کرتا تھا! آج تک جاپانی فلم ''شوگن اور ننجا'' وغیرہ ماردھاڑ سے بھری پڑی ہے۔ اس دور کے فیوڈل حاکموں نے اونچ نیچ کو خوب رائج کیا مگر ادب کو خوب فروغ حاصل ہوا ــــ ''نوہ'' ڈراموں میں بیشتر منظوم مکالمے اور کورس ہوتے ہیں۔ آغا حشر کے ڈراموں کی طرح' مگر زیادہ تر ''نوہ'' ڈرامے بہت سمبالک ہوتے ہیں ۔نوہ ڈراما رفتہ رفتہ قدیم آرٹ فارم اور میوزیم کی زینت ہو چلا تھا کہ کچھ ہدایت کاروں نے اس کے تھیم ، پلاٹ اور لمبے اوقات میں تبدیلی کی اور آج کا ماڈرن نوہ ڈراما ایک بار پھر پوری آب و تاب سے تھیٹر کے متوالوں میں بڑا مقبول ہو چکا ہے۔

کافی بریک میں ایک کنارے دو جوان امریکی جوڑے اور ایک بوڑھا فرنچ نوہ کے ماضی اور حال پر بحث کر رہے تھے۔ ان کی اجازت سے میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ ہم سب نوٹنکی کے طالب علم تھے۔

ہیلو،ہائے! سے زیادہ کسی نے تعارف نہیں کرایا۔ان لوگوں سے ایک کام کی بات یہ معلوم ہوئی کہ ماڈرن نوہ ڈراموں کا گاڈ فادر''یوکیومیشی ما'' نے بڑے اچھے' کامیاب اور موثر نوہ ڈرامے تخلیق کیے ہیں۔اس نے قدیم آرٹ فارم میں حال کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس کے ڈرامے''سوٹوبا کو ماچی'' اور''لیڈی آوی'' بہت مشہور ہیں۔اس کا انعام یافتہ ناول''شی اوسائے'' بھی خاصا مقبول ہے۔۱۹۷۰ء میں موت نے اس عظیم فن کار کے ہاتھوں سے قلم چھین لیا۔یہ بھی پتہ چلا کہ''میشی ما'' کے ڈراموں کو''ڈونالڈ کین'' نے ترجمہ بھی کیا اور کتاب بازار میں دستیاب بھی ہے۔میں نے یہ باتیں نوٹ کرلیں کہ ظہیر سے''نوہ'' پر خوب باتیں ہوں گی اور موقع ملا تو جلد ہی چند''نوہ'' ڈراموں کا اردو میں ترجمہ بھی کروں گا۔

اس شاندار قیمتی شو اور کارآمد تھیٹر کرافٹ کی معلومات کے باوجود کچھ تشنگی سی تھی۔میں باہر نکلا' گھڑی چار بجا رہی تھی۔میں نے دوبارہ ٹورسٹ انفارمیشن فون گھمایا۔اس بار مشین کی جگہ کسی بچی نے فون اٹھایا۔ میں نے' کابوکی' یا' بنراکو' کے بارے میں دریافت کیا۔ پتہ چلا شام ۵ر بجے بنراکو کا کوئی خاص رعایتی شو بنراکوایسوسی ایشن کی ۵۲ویں سال گرہ کے سلسلے میں ہے۔اس لیے آٹھ ہزار ین کے ٹکٹ صرف ۲۰۰۰ ین میں دستیاب ہیں۔یہ''توشی ما'' پبلک ہال میں ہے۔میرے پاس ابھی وقت تھا۔قریب ہی ایک فرنچ بیکری نظر آرہی تھی۔کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ڈراموں کے چکر میں لنچ گول ہوگیا تھا۔میں لیمن پیسٹری اور کولڈ کافی لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔دونوں چیزیں مزے کی تھیں اس لیے مہنگائی کا قلق نہ ہوا!

''توشی ما'' ہال پر کافی بھیڑ تھی۔اس رعایتی شو سے مستفید ہونے کے لیے سیاحوں سے زیادہ مقامی لوگ لائن میں نظر آئے۔ٹکٹ لے کر میں ہال میں داخل ہوا۔دیکھتے ہی دیکھتے ہال بھر چکا تھا۔ ''بنراکو' ہمارے یہاں کی کٹھ پتلی سے ملتا جلتا آئٹم ہے مگر ان کی کٹھ پتلیاں قدآدم ہوتی ہیں۔کچھ ہی دیر میں اسٹیج کا پردہ سرکنے لگا اور ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی! سیاحوں کے لیے''بنراکو' اور آج کے شو''شنجو تینوآمی جیما'' کے بارے میں انگلش میں مختصراً بتایا گیا۔بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ وہی شو ہے جس کے بارے میں صبح اسادہ صاحب بتا رہے تھے۔حسنِ اتفاق شاید اسی کو کہتے ہیں۔

''نوہ'' ڈراموں کی مقبولیت کے بعد سولہویں صدی یعنی''ایڈو' عہد میں''بنراکو' ڈراموں کی شروعات ہوئی اور روز بہ روز اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا —— اسٹیج کی داہنی طرف ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا جس پر ایک راوی کچھ پڑھ کر شو کا آغاز کر رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی تین چار افراد ایک بینجو نما باجے پر راگ چھیڑ رہے تھے۔اسی ساز کو''شامی سین'' کہتے ہیں اور راوی کو''تایو' کہا جاتا ہے۔ہمیں ٹکٹ کے ساتھ ایک کتابچہ ملا تھا جس میں اسٹیج کرافٹ کی تفصیل درج تھیں۔زوردار موسیقی کے جلو میں

ایک رقاصہ (کٹھ پتلی) سامنے آتی ہے جسے تین افراد اٹھائے ہوئے تھے۔مزے کی بات یہ تھی کہ اسٹیج دومنزلہ بنا تھا۔ نچلے اسٹیج پر کٹھ پتلی نچانے والے کھڑے تھے اور کٹھ پتلیاں اوپر کے اسٹیج پر حرکت کرتی نظر آرہی تھیں۔دور سے یوں لگ رہا تھا کہ یہ کٹھ پتلیاں خود سے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں۔کارندے کالے کپڑے اور نقاب پہن کر ان کٹھ پتلیوں کے پیچھے تھے۔معلوم ہوا کہ تقریباً بیس برسوں میں کٹھ پتلیوں کو نچانے میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اس عرصے میں تو آدمی خود بہت بڑا ''اودے شنکر'' بن سکتا ہے مگر فوراً یہ خیال بھی آیا کہ جو مزا دوسروں کو نچانے میں ہے' خود ناچنے میں کہاں؟ انگلیوں پر نچانا شاید اسی مہارت کو کہتے ہیں۔

اسٹیج پر ناچتی کٹھ پتلی نہ صرف رقص کر رہی تھی بلکہ کورس کے اتار چڑھاؤ پر آنکھیں اور پلکیں تک جھپکا رہی تھی۔ساتھ ہی ہونٹ بھی گانے کے انداز میں کھل بند ہو رہے تھے۔رفتہ رفتہ اسٹیج پر دوسرے کردار (کٹھ پتلیاں) بھی نمودار ہونا شروع ہوئے۔کہانی کچھ اس طرح تھی کہ ایک شادی شدہ آدمی ایک باوقار امراؤ جان نما رقاصہ کی الفت میں گرفتار ہوتا ہے۔ان کا خاندان اور سماج اس محبت کو بالکل برداشت نہیں کرنا چاہتا۔اپنے دل اور شرافت سے مجبور ہو کر بندۂ خدا اپنے محبوب کے ساتھ اس کے حجرے میں خودکشی کر لیتا ہے کہ اس دنیا میں گر ان کا ملن ممکن نہیں مگر اگلی دنیا میں انھیں Dating سے کوئی نہیں روک سکتا! عشقِ صادق کی اس رقت انگیز داستان پر جنتا نے دل کھول کر داد دی —— کمال یہ تھا کہ ہماری بمبیّا فلمی کہانی کو کٹھ پتلیوں کے ذریعہ پیش کیا گیا تھا —— کہانی سے پرے' پروڈکشن، لائٹ اور مومنٹ غضب کا تھا۔اب سمجھ میں آیا کہ کٹھ پتلی نچانے میں بیس سال کیوں صرف ہوتے ہیں؟

کٹھ پتلیوں کے سحر سے باہر نکلا تو یاد آیا کہ آج رات کا کھانا بھائی رئیس کے ساتھ کھانا تھا۔وہ مجھے ریڈیو جاپان کے عزیز صاحب سے ملوانا چاہتے تھے۔میں نقشہ دکھا کر پتہ پوچھتا کوئی آدھے گھنٹے میں ''سمراٹ ریستوران'' کے سامنے پہنچا۔رئیس بھائی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے لئے سگریٹ کے مرغولے بناتے میرے منتظر تھے۔میں جاپانی کورنش اور لکھنوی آداب کے ساتھ ان سے بغل گیر ہوا۔پتہ چلا کہ عزیز صاحب کچھ دیر سے آئیں گے۔رئیس بھائی نے اپنی پسندیدہ ٹیبل پر جمتے ہی میرے آوارگی کا حال پوچھا! میں نے جاپانی نوٹنکی کا قصہ سنایا! رئیس بھائی نے کہا عزیز صاحب کو اسٹوڈیو میں کچھ کام ریکارڈنگ کا نکل آیا ہے، ان کے آنے تک ہم لوگ کھانا شروع کرتے ہیں۔چائے اور میٹھا ان کے ساتھ کھائیں گے۔مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ویٹرس نے آکر آرڈر معلوم کیا۔ریشمی کباب،چکن مکھنی اور نان کہہ کر انھوں نے ویٹرس سے جان چھڑائی۔میں نے ''اوساکا'' جانے کے بارے میں تفصیل معلوم کی۔پتہ چلا

جناب تبسم کاشمیری ان دنوں شاید چھٹیوں میں کراچی گئے ہوئے ہیں ۔ میں نے دوسرا پروگرام دو روز ''ہکونے''، فیوجی یاما کے دامن میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی ـــــ ابھی رئیس بھائی ''ہکونے'' کی سفری تفصیل بتا رہے تھے کہ کھانا آ گیا۔

سمراٹ ریستوران کا کھانا اور ماحول دونوں اچھا تھا۔مگر ریشمی کباب سب کچھ تھا بس ریشمی نہ تھا! ہم لوگ ابھی نان اور چکن سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ عزیز صاحب آ گئے ۔رئیس بھائی نے تعارف کرایا ۔ بڑے تپاک سے ملے ۔لانبا قد، گندمی رنگت ،آواز اور انداز سے پٹھان نما۔مگر لب ولہجہ گورکھ پور والا، پتہ چلا دہلی ریڈیو سے دو سال ہوئے' ہندی سیکشن میں آئے ہیں ۔رئیس بھائی نے پلیٹیں سمیٹتی ویٹرس کو عزیز صاحب کے لیے کھانے کا آرڈر دیا اور ہماری باتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ میں نے بتایا کہ پچھلے دنوں میں دہلی میں تھا اور کلکتے کے سینئر ساتھی معین اعجاز سے ملاقات ہوئی ۔انھوں نے ریڈیو پر انٹرویو بھی رکھوایا تھا۔ وہیں موج رام پوری اور عثمانی صاحب سے بھی ملاقات اور دلچسپ باتیں ہوئی تھیں ۔ٹی پر علی گڑھ کے سینئر ساتھی انجم عثمانی سے بھی خوب ملاقات ہوئی مگر ان کے پروگرام میں وقت کی تنگی کی وجہ سے میں شریک نہ ہوسکا۔عزیز صاحب کو حیرت تھی کہ ہم لوگوں کی ملاقات دہلی میں کیسے نہ ہوئی ۔پھر انھوں نے بتایا کہ ان کے سیکشن والے پرویز پچھلے دنوں ''بی بی سی'' کے ہندی سیکشن میں آ گئے ہیں میں نے پوچھا 'کون؟علی گڑھ والا پرویز ـــــ عزیز صاحب نے دوبارہ حیرت سے پوچھا'اچھا آپ پرویز کو بھی جانتے ہیں ـــــ ارے بھئی ملاقات ہوئی زمانہ ہوامگر پرویز میرے ہم عصر ڈراما نگار اور ایکٹر تھے۔علی گڑھ کے سنہرے دنوں میں ۔ہائے کیا زمانہ تھا ''جوانی کی راتیں مرادوں کے دن'' ۔جیب خالی مگر امنگیں چوتھے آسمان پر ۔میرا ایک اور جگر عبید صدیقی بھی آج کل بی بی سی کی اردو سروس میں آ گیا ہے ـــــ میں نے بتایا ۔عبید کو عزیز صاحب جانتے تھے ۔اس طرح ہمارے بہت سے دوست مشترک نکلے ۔گفتگو مزید پرلطف اور بے تکلف ہوتی چلی گئی ۔ میں نے ایک بات محسوس کی کہ عزیز صاحب گفتگو کے دوران بڑے دھڑلے سے دوستوں کو پٹھانی صلواتیں سنا رہے تھے جس سے بیچارے رئیس بھائی کچھ بور ہو رہے تھے ۔ مگر ان کا حسنِ اخلاق کہ بڑی خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔کھانے کے بعد رس ملائی اور الائچی والی دیسی چائے کا آرڈر دیا گیا۔ میں نے عزیز صاحب سے جاپان کے قیام کا پوچھا ہی تھا کہ رئیس بھائی نے بیچ میں ٹوک کر موضوع بدل دیا۔شاید انھیں اندازہ تھا کہ بے تکلفی میں بات اب کہاں پہنچنے والی ہے اور ہم تینوں مسکرائے بغیر رہ نہ سکے ۔جب چند ادیب وشاعر یک جا ہوں تو کس کس کی پگڑی اچھلتی ہے اور کیسے کیسے تیر ونشتر کا تبادلہ اور تنقید شروع ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔بس ہم لوگ بھی کافی

دیر لگے رہے۔ پھر رئیس بھائی نے دوبارہ ویٹو کیا اور ہمیں طنزیہ موضوع بدلنا پڑا۔ میں نے فرمائش کی کہ ایک شعر ہو جائے تو ہم لوگ اپنی بکواس بند کر لیں گے! اس حسین بلیک میل پر رئیس بھائی زیرلب مسکرائے' پھر اپنے مخصوص انداز میں شعر سنایا :

وہ رہ گزر کہ بڑے پیچ و خم سے گزری ہے
جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ ساعتوں کا شمار

میں نے جذباتی ہو کر اتنے جوش میں سبحان اللہ اور مکرر ارشاد کہا کہ آس پاس کے ٹیبل والے گھبرا کر ہمیں گھورنے لگے —— شعر اچھا تھا۔ دوسری بار سنا تو اور اچھا لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ عزیز صاحب سے ملاقات مختصر تھی مگر تھی دلچسپ۔ پھر کبھی دہلی میں ملنے کا وعدہ ہوا اور میں رئیس بھائی کا شکریہ ادا کرتے باہر نکلا —— رات نہ صرف جوان ہو چلی تھی بلکہ بے حد مصروف بھی تھی۔ میں سارے دن کا تھکا پُرش —— دن رات اور ساعتوں کا شمار کرتا ''سی بویا'' اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا!

دوسری صبح معمول کے خلاف آنکھ جلدی کھل گئی۔ انور چائے بنانے کی تیاری کر رہے تھے' حیرانگی کے ساتھ صبح بخیر کہا —— میں صبح بخیر کہتا باتھ روم میں گھس گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا' ایک وفا شعار بیگم کی طرح انور نے ناشتہ میز پر چن رکھا تھا۔ میں ساتھ دینے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے انور نے گزشتہ کل کی کارگزاری پوچھی' میں نے مختصراً روداد سنا دی اور پوچھا ''یار وہ آج کوئی ''کابوکی'' شو دیکھنا ہے' ساتھ چلتے ہو؟ انور نے کہا' اول تو آج میرے کلاس ہیں' پھر شام کام سے فرصت نہیں ملے گی' مگر فرصت ہوتی تو بھی ہم آپ کے ساتھ اتنا قیمتی شو دیکھنے نہ جاتے۔ میں نے پوچھا کیا مطلب؟ پتہ چلا ''کابوکی'' کے عام شو کا ٹکٹ کم از کم آٹھ' دس ہزار ین کا ہوتا ہے۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر میں نے کہا بھیا! اتنے میں تو میرا یار ظہیر اپنا ڈراما ''صلیب'' اسٹیج کرتا ہے اور اس سے کم میں میرے سر پھرے ساتھی خورشید نے ڈراما ''فساد'' اسٹیج کیا تھا۔ ان سودائیوں کو پرے رکھو۔ میں خود دو ہزار روپے میں اپنا ڈراما ''سماج کا زہر'' اسٹیج کر چکا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اشتہار کے بہت سے پیسے آج تک نہیں ملے۔ میں باہر کیا نکلا ''پروگریسیو ڈرامیٹک ہاؤس'' پر بڑھاپا آ گیا —— وہ بھی کیا دور تھا۔ گھنٹوں کالج اسٹریٹ کے کافی ہاؤس میں بیٹھے ڈراموں پر بحث کرنا' یہ پلان بنانا کہ کس ڈرامے کو کون ڈائرکٹ کرے گا' پھر اسکرپٹ کا تجزیہ کرنا' مگر میری ہجرت سے میری نوٹنکی برادری نے ہمت نہیں ہاری' ظہیر لڑ مر کر ''شرجیل آرٹس'' کو زندہ رکھے ہے اور خورشید گھر والوں کی مرضی کے خلاف ''یونیورسل لٹل تھیٹر'' کے تحت ڈرامے اسٹیج کر رہا ہے۔ چند دوست اردو کے شانہ بشانہ ہندی والوں کے ساتھ لگے نام کما رہے ہیں جن میں دراز

قد شاہد، پستہ قد شکیل اور وضع دار رفیق انجم نمایاں ہیں۔ اور ہماں ہمارے ہم عصر کمال نے اسٹیج سے زیادہ پتہ نہیں کیوں ریڈیو پر ڈرامے زیادہ پیش کیے ہیں۔ غرض ع ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔''

انور کے کچھ کہنے پر میں چونکا۔ تھیٹر کی بات پر اکثر ہم کلکتے کے رنگ منچ میں الجھ جاتے ہیں ——

انور نے پھر پوچھا کہ کیا فیصلہ کیا آپ نے؟ میں نے کہا' یار جتنے میں ایک ڈراما (کبھی کبھی دو ڈراما) اسٹیج کرتے تھے' اتنے میں ایک شو دیکھنے کا تجربہ بھی کرتے چلیں۔ پھر کبھی ہم لکھ پتی بن پائیں کیا بھروسہ! میری سادگی (یعنی بے وقوفی) انور ہنس پڑے!

صبح گیارہ بجے ہم خراماں خراماں شاہ راہ گنز اپر ایک ''کابوکی'' تھیٹر ڈھونڈ کر نکال چکے تھے۔ ٹکٹ کی قطار میں کوئی ۵۳ ؍مرد وزن اپنی تھیٹر دوستی اور قدردانی کا ثبوت دینے کے لیے بڑی زندہ دلی سے لگے تھے' میں بھی ان میں شامل ہو گیا —— قطار سے پرے چاندی کی یہ شاہ راہ شام کی طرح مخمور تو نہ تھی مگر پھر بھی رونق افروز تھی۔ جتنے حسین فرنگی چہرے یہاں مٹر گشتی کر رہے تھے' اتنے ہی ستھرے جاپانی نقوش' اپنے حسن کو سنبھالے محوِ خرام تھے۔ حسن کے جاپانی شوکیس میں ہم الجھتے چلے گئے۔ بقول شاعر:

خیال و خواب کی رعنائیوں میں
کہاں ہم کھو گئے پرچھائیوں میں

کاؤنٹر والی دوشیزہ کی نقرئی آواز پر مجھے انداز ہوا کہ میرا نمبر آچکا ہے۔ اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کے لیے ''اوہائیو گزائی ماس''، یعنی جاپانی میں سلام علیکم کہا۔ دوشیزہ خوش ہو گئی مگر اس سے پہلے وہ کچھ بولتی میں نے انگلش میں ایک ٹکٹ میٹنی شو کی درخواست کی' اب اس نے قدرے لاتعلق ہو کر کہا۔ ۱۲۰۰۰ ؍ین میں نے خود کو سنبھالا۔ بڑے پُر وقار کینیڈین اسٹائل میں ۱۲۰۰۰ ؍ین ایسے گنے جیسے ۱۲ ؍ڈالر ہوں مگر کم بخت اُس دیسی دل کا کیا کریں جو اندر سے بیٹھا جا رہا تھا کہ ظالم حسینہ نے سوڈالر یعنی ۱۵۰۰ ؍روپے لوٹ لئے! شیشے کے اس پار سے دوشیزہ نے بڑی بے نیازی سے پوچھا کیا آپ ہیڈ فون کرائے پر لینا پسند کریں گے۔ میں نے پوچھا وہ کس لیے۔ محترمہ نے بتایا کہ ڈراما جاپانی میں ہے۔ اس کا خلاصہ انگلش میں ٹیپ کے ذریعہ فارنر کو بتا دیا جاتا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا ''ہیڈ فون کا کرایہ ہزار ین اور ایک ہزار ین اس کی ڈپازٹ —— میں کہنا تو بہت کچھ چاہ رہا تھا مگر گھونٹ گیا! اور مسکرا کر کہا ''شکریہ'' میں شو اوریجنل دیکھنا پسند کروں گا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یہ ہیڈ فون والا دھندا کچھ جچا نہیں۔

میٹنی شو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے شروع ہو گیا۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ اندازہ یہ ہوا کہ سیاحوں میں ''نوہ'' اور ''بنراکو'' ڈراموں سے زیادہ مقبول ''کابوکی'' تھیٹر ہے۔ اس قدر مہنگا ٹکٹ ہونے کے باوجود

کافی لوگ ہال میں موجود تھے۔ میں زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار اتنا مہنگا ڈراما دیکھ رہا تھا۔ کاش ظہیر ساتھ ہوتا تو اسے اندازہ ہوتا کہ ہمارے تھیٹر کس قدر سستے اور ہمارے نوٹنکی والے کتنے سادہ ہیں!

سولہویں صدی میں ''ایزومونواکونی'' نامی ایک دیوداسی نے ''کابوکی'' تھیٹر کی بنیاد ڈالی۔ یہ اس دور کا پہلا غیر مذہبی تھیٹر تھا۔ وہ دیوداسی رہبانیت کی زندگی سے بھاگ کر کیوٹو چلی آئی تھی اور پھر اس نے یڈو یعنی ٹوکیو میں اپنی ناٹک منڈلی قائم کر لی تھی۔ ''کابوکی'' کی شروعات گو ایک عورت نے کی تھی اور اس عہد میں اکثر طوائفیں اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں مگر ''ٹوکوگاواشوگن'' کے عہد میں عورتوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ تمثیلوں اور ڈراموں میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ ڈر تھا کہ عوام کی اخلاقیات کو خطرہ ہے۔ آج بھی کابوکی ـــــ بنراکو ـــــ نوہ ـــــ ڈراموں میں عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ شاہ راہ گنزا ہی پر بے شمار نائٹ کلب اور اسٹرپ ٹیز میں ہر کلاس اور وضع کی عورت اپنے جوبن کے سونا چاندی کو سرِ بازار نیلام بھی کر رہی ہے۔ پتہ نہیں عوام میں بالیدگی آ گئی تھی یا عورتوں کی اخلاقیات کو نظر لگ گئی تھی۔

''کابوکی'' والوں نے اتنی شرافت کی تھی کہ ٹکٹ کے ساتھ ایک خوبصورت بروشر (کتابچہ) بھی دیا تھا جس میں خاص خاص نام اور اسٹیج و ڈراما کے متعلق کارآمد باتیں درج تھیں۔ ابھی ہم بروشر میں لگے تھے کہ اسٹیج پر روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا۔ پھر اسٹیج کے بیچ ایک ہیرو نمودار ہونا شروع ہوتا ہے اور اسٹیج پر آتے ہی دھاڑنے لگتا ہے۔ پتہ چلا کہ اس طرح کے کردار کو ''اراگوٹو'' کہتے ہیں۔ (یہ ایک سورما ہوتا ہے جو کسی لڑائی میں کام آ جانے کے بعد دوسری دنیا سے [مافوق الفطرت] اسرار لے کر انتقام لینے دوبارہ نازل ہوتا ہے۔) ہیرو صاحب کا نازل ہونا بڑی بات نہ تھی مگر جس طرح وہ نازل کیے گئے تھے' وہ تکنیک زبردست تھی۔ معلوم ہوا کہ اسٹیج کے اس حصہ کو سیری کہتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں جب برقی سہولتیں نہ تھیں' اس پلیٹ فارم کو اسٹیج پر ابھارنے اور غائب کرنے کے لیے جسمانی طاقت استعمال کی جاتی تھی۔ پانچ آدمی رسّی کے ذریعہ گھسیٹ کر ''سیری'' کو اوپر یا نیچے کرتے تھے۔ اسی طریقے پر اس دور میں ''ریوالونگ اسٹیج'' بھی موجود تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپان میں تھیٹر کرافٹ پرانے دور میں بھی کتنا ترقی یافتہ اور میکانیکی طور پر کس قدر آگے تھا۔

اس سے زیادہ جو بات قابلِ غور تھی وہ ان کا میک اپ اور کاسٹیوم تھا۔ یوں تو ''کابوکی'' جنوبی ہند کے ''کتھاکلی'' یا بنگلہ کے ڈانس ڈراما سے قریب تر ہے مگر آرائش اور رنگوں کا عجیب امتزاج ''کابوکی'' میں موجود ہے۔ ہم لوگوں نے تواریخی ڈراما یا انارکلی ٹائپ کے شو سے ہمیشہ اس لیے انکار کیا کہ اس میں

کاسٹیوم بہت مہنگے پڑتے ہیں مگر ''کابوکی'' دیکھ کر انداز ہوا کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ڈراما ہو جو کاسٹیوم اور میک اپ میں ''کابوکی'' سے مقابلہ کر سکے۔ ''کابوکی'' میں عورتوں کا رول بھی مرد ادا کرتے ہیں۔ اس کردار کو ''اومایا'' کہتے ہیں۔ اس کردار کے شوخ رنگ کا سٹیوم اور گہرے میک اپ میں ہم اتنا کھوئے کہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ رول کوئی محترم بڑی حسن و خوبی اور اداؤں کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ ایک اور کردار اسٹیج پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے نمودار ہوتا تھا۔ اس کا کام کسی اور کردار کو کوئی چیز بڑھا کر دینا یا کسی شئے یا ''پراپ'' کو اسٹیج سے ہٹانا تھا۔ اس نے کالا لباس اور چہرے پر کالا نقاب لگایا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ اس کردار کو ''کوروکو'' کہتے ہیں اور تماش بین کے لیے یہ دکھائی نہ دینے والا ہوتا ہے جسے Invisible Character بھی کہتے ہیں۔ یہ ڈراما بھی دراصل ایک رزمیہ تھا جس میں ایک شوگن خاندان کی لڑکی اپنے دشمن خاندان کے شہزادہ نما ہیرو کو دل دے بیٹھتی ہے۔ اس عاشقی میں بڑا خون خرابہ ہوتا ہے مگر سمورائی جوان جان کی بازی لگا کر اپنی محبت کی بازی جیت لیتا ہے۔ میں نے پچھلے دس سالوں میں بہت کہے سنے ایک پاکستانی فلم ''مولا جٹ'' دیکھی تھی، عرصے تک خواب میں بھی چونک پڑتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ذہن سے اس فلم کا بخار اتارا تھا مگر آج اس شو نے پھر مولا جٹ صاحب کی یاد تازہ کر دی تھی۔ بس آج کا شو اس جٹ کا جاپانی ورژن تھا! پنڈ کے چودھری کی طرح سمورائی بھی بہت چیختا چنگھاڑتا اور اچھل کود کرتا ہے، مگر اس کے باوجود ہم چھ گھنٹے کے کمر توڑ شو میں بیٹھے رہے اس انتظار میں کہ شہزادہ اب سدھر جائے گا، مگر ان سبھوں نے قسم کھا رکھی تھی ''جاؤ ہم نہیں سدھریں گے۔'' تمام تر اوٹ پٹانگ کے باوجود ''کابوکی'' تھیٹر مجھے پسند آیا۔ سنا جاپانی ''شیخ پیر'' صاحب ''چیکا مستون مون زامون'' نے کابوکی تھیٹر بنانے میں کافی کچھ کیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوا باہر آیا کہ اگلے وقتوں میں کابوکی میں کیا کچھ غیر سنجیدگی ہوتی ہوگی — مگر تمام غیر سنجیدگی کے ساتھ کابوکی زندگی سے بھرپور تھیٹر ہے اور ان کے کاسٹیوم اور تیکھے نقوش والے میک اپ میں شاید ہی بھلا پاؤں — ! چلئے کچھ عرصے کے لیے میرے سر سے نوٹنکی کا بھوت اتر چکا تھا!

☆☆☆

ہکونے فیوجی یاما کے دامن میں

۱۶/مارچ کی ایک تر وتازہ صبح میں ٹوکیو سینٹرل اسٹیشن کے کشادہ لابی میں چہل قدمی کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آج کو ہِ فیوجی کی زیارت اور ہکونے لیک ونیشنل پارک دیکھنے کس طرح جایا جائے!

ایک بڑے سے سنہرے بورڈ پر سنہرے لفظوں میں لکھا تھا ''نادان ہیں وہ لوگ جو فیوجی یاما کی چوٹی تک نہیں گئے۔ مگر ایسے بے وقوفوں کی بھی کمی نہیں جو فیوجی یاما کی چوٹی سر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے'' —— ''ہکونے''بس، ٹرین یا ہوائی جہاز سے جایا جاسکتا تھا۔ میں بس اور ہوائی سفر سے کترا رہا تھا، مگر ریل بھی طرح طرح کی فیوجی تک جاتی تھی۔ انور نے کہا تھا ''بلٹ ٹرین سے ضرور سفر کیجیے گا مگر حضرتِ مجتبیٰ حسین نے نہ صرف تنبیہ کی تھی بلکہ ''بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو'' سے متعلق ایک لمبا چوڑا مضمون بھی اپنے سفر نامے میں لکھ مارا تھا۔ مانا آج تک ہم نے بزرگوں کے سفر ناموں سے استفادہ نہ کیا تھا (نہ کرنا چاہتا تھا) مگر مجتبیٰ صاحب سے مجھے بزرگوں سی عقیدت اور دوستوں سا پیار تھا' وہ میرے منہ بولے استاد بھی تھے۔ ان کی بات رد کرنے میں ہم شش و پنج میں مبتلا تھے۔ یوں تو انھوں نے اور بھی بہت ساری ہدایتیں اپنے تجربات کی روشنی میں کی تھیں کہ فلاں کے ساتھ نہ گھومنا اور فلاں کو منہ نہ لگانا مگر نالائقی کے تحت ہم نے ابھی تک ایک بھی ان کی ہدایتِ زریں پر عمل نہ کیا تھا —— اب آوارگی میں اصول وقواعد کہاں تک نافذ کیے جائیں۔ خود سے شرم سار ہو کر میں نے فیصلہ کیا کہ بلٹ ٹرین میں نہ بیٹھیں گے۔ مجھے مجتبیٰ صاحب سے سو فیصد اتفاق تھا کہ وہ ٹرین ہی کیا جو ۲۱۰ رکیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگے! اب ایسی بھی کیا جلدی۔ کون سے سسرال والے ہکونے میں میری آمد میں پلکیں بچھائے بیٹھے تھے —— اپنی سودیشی ریل کی لاکھ برائی کرو' مگر جو مزہ جھوم جھوم کے سفر کرنے میں ہے وہ برق رفتار ریلوں میں کہاں۔ پھر ایسی بھی کیا وقت پر پہنچنے کی آفت آئی ہوئی ہے۔ جب تک دوست احباب چند گھنٹے اسٹیشن پر انتظار نہ کریں ''ریل''اور''بندے'' کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ چلیے صاحب ہم نے اساتذہ حضرات (وہ بھی اردو کے) کی بات ماننا آج سے شروع کر دی! نہیں جاتے بلٹ ٹرین سے۔ دوسری کئی ٹرینیں تھیں مگر دل کم بخت کا کیا کریں۔ ہمیشہ خوش شکل چیزوں کی طرف لپکتا ہے۔ کئی ناموں میں ایک نام بڑا رومان پرور لگا۔ ٹرین کا نام تھا''سپر ا کسپریس رومانس کار''میں نے سوچا یار پھر کبھی سودیشی جیسی ریل میں سفر کر لیں گے۔ ابھی ہم کون سا''آوارگی'' سے دست بردار ہو رہے ہیں۔

ٹکٹ بوتھ میں بیٹھی دوشیزہ سے میں نے''ہکونے'' کے لیے معلوم کیا۔ اس نے پوچھا واپس آج ہی

ہے یا کل —— میں نے سوچا ایک عظیم پہاڑ پر جا رہے ہیں۔ایک روز میں خاک نظارہ ہوگا۔کم از کم دو دن کا پروگرام ٹھیک رہے گا۔ٹکٹ صرف بیس ہزار ین سن کر فیوجی یاما کی عظمت کا یقین ہو چلا۔خیر اس سفر میں جب ہم ایک شو بارہ ہزار ین کا دیکھ سکتے ہیں تو فیوجی کے لیے بیس ہزار کون سے برے ہیں! میں نے بڑی سعادت مندی سے پانچ ہزار والے چار نوٹ دوشیزہ کے آگے رکھ دیے اور میری بکنگ ہنستے کھیلتے ہوگئی۔نہ رشوت دینی پڑی نہ ہی قطار میں کسی سے ''مکالات''، پتہ چلا دس منٹ میں سواری روانہ ہوگی۔ پلیٹ فارم نمبر دو پر چلے جاؤ۔میں تیزی سے پلیٹ فارم نمبر دو پر پہنچا۔ٹرین تیار کھڑی تھی۔میں نے فون کر کے انور کو اپنا پروگرام بتایا۔وہ یہ سنتے ہی بدک گیا کہ میں ٹوکیو پہنچ کر بھی بلٹ ٹرین سے فیض یاب نہ ہو رہا تھا —— میں نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ دیکھو شہزادے مجھے تمہاری ہمدردی اور خلوص کا پورا خیال ہے مگر تم مجتبیٰ صاحب کو نہیں جانتے۔ان کی باتیں کم ہی لوگ ٹال پاتے ہوں گے۔ویسے پہلی بار انھوں نے محض اپنی شرافت اور حیدر آبادی وضعداری کے تحت میرے بارے میں ٹھیک ٹھاک لکھ دیا تھا۔کوئی بات ناگوارِ خاطر گزری تو اس بار میرا خاکہ......بھئی میرا حلیہ تو ایسے ہی خراب ہے۔تم چاہتے ہو خاکہ بھی خاکِم بدہن ہو جائے۔اگلی بار آئیں گے تو تمہارے ساتھ بلٹ ٹرین میں سفر کر لیں گے۔اچھا اب دو روز بعد ملاقات ہوگی،اور ہاں —— ذرا رئیس بھائی اور اسا دا صاحب کو فون کر کے میرا پروگرام بتا دینا۔

ٹھیک نو بجے رومانس کار اپنی مستانہ چال کے ساتھ روانہ ہوئی۔اتنی خوب صورت و سیرت ٹرین میں ہم نے کم ہی سفر کیا تھا۔دبیز سرخ قالین،کشن والی آرام نشستیں اور عطر بیز ماحول۔ریل سے زیادہ کسی عالی شان ریستوران کا منظر پیش کر رہا تھا۔خوش باش و خوش لباس، صحت مند چہرے ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ کر اجنبیت ختم کر رہے تھے۔میرے ساتھ کی نشست پر ایک سفید فام بودھ راہب ایک جاپانی راہبہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔بیشتر سیاح امریکن لگ رہے تھے۔میں اپنی رنگ کا دوسرا تلاش کر رہا تھا مگر نہیں ملا۔میرا پڑوسی گیروے لباس میں بھی عاشق مزاج لگ رہا تھا۔میں نے اس کے حلیے کو دیکھ کر ہیلو کہا اور پھنس گیا۔بندہ شاید اسی انتظار میں تھا۔اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا، تعظیماً جھکا اور کارڈ بڑھایا۔اس پر ''ریو —— جیمس برنارڈ —— بدھسٹ ٹیچر'' لکھا تھا۔پتہ ٹیکساس، امریکہ کا تھا۔اس نے سکوت توڑتے ہوئے کہا —— میرا جاپانی نام 'یوکان' ہے۔میں بدھ ازم اور زین فلسفے پر ریسرچ کر رہا ہوں۔یہ میری ساتھی ''اوکی تا کوٹو سان'' ہیں۔ہم نے گردن خم کرتے ہوئے ایک دوسرے کو ہیلو کہا۔مسٹر جیمس یوکان نے مجھ سے میرا کارڈ مانگا۔ٹورانٹو کا پتہ دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔میرے رنگ کو بھول کر وہ شمالی امریکہ کی باتیں چہک چہک کر کرنے لگا۔اس نے بڑی رازداری سے مجھ سے کہا

''شا کی منی'' کہیں کھو گیا ہے ـــــ میں نے پوچھا کیا مطلب؟ اس نے دوبارہ سرگوشی میں کہا۔ بودھ کا چہرہ یہاں بدلتا جا رہا ہے۔ یہ لوگ شنتو عقیدے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اپنی قدیم روایتوں میں الجھ کر ان لوگوں نے نہ صرف زین بلکہ بدھ فلسفے کو بھی بدل ڈالا ہے۔ آپ نے اندازہ تو کیا ہوگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا ''محترم یوکان' میرے نزدیک فلسفہ کوئی سا ہو' انسان صدق دل سے اس کی طرف لگ جائے گا ـــــ روشنی پالے گا، نہیں تو ساری عمر ریسرچ کرتا رہے گا مگر سکون حاصل نہ ہوگا! اس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی ـــــ میں نے پوچھا اس ریسرچ کے سلسلے میں آپ جاپان کے علاوہ کہاں گئے ہیں؟ یوکان صاحب نے کہا' ابھی تو سفر شروع ہوا ہے اور یہ میرا پہلا پڑاؤ ہے۔ میرے خیال میں جاپان آپ کا آخری پڑاؤ ہونا چاہیے تھا اور پہلا پڑاؤ بودھی، گیا، انڈیا۔ تب اندازہ ہوتا کہ بودھ مت نے کیا کھویا اور کیا اپنایا ہے! اس نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو اور میں جلد انڈیا جانا چاہتا ہوں ـــــ ویسے آپ کا بدھ ازم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی' ساتھ ہی یہ تمام مسائل کا حل بھی نہیں پیش کرتا۔ مگر مسئلہ وہی ہے کہ کس کو خبر ہے کہ روشنی کس دریچے سے آنے والی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران یوکان کی ساتھی راہبہ خاموشی سے کتاب پر نظریں جمائے مجھے بور کر رہی تھی۔ جتنا وہ کم گو تھی اس کا ساتھی اسی قدر باتونی ـــــ میں بھی خواہ مخواہ الٹے سیدھے سوالات اس سوڈو راہب سے پوچھ رہا تھا ـــــ اچانک میں نے پوچھا۔ یہاں کی سوسائٹی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ اس نے بڑے ہچکاک انداز میں آس پاس کا جائزہ لیا پھر دبی دبی آواز میں بولا۔ یہ ''ہیڈ انسٹک سوسائٹی'' ہے! اچھا ـــــ میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا ـــــ ''ٹوٹل ہیڈ ازم۔'' اتنی ساری کمپیوٹر سازی کے باوجود یہ لوگ فیوڈل عہد میں ہیں ـــــ میں اس کی باتوں سے پوری طرح متفق نہ تھا' مے بی (May Be) کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مگر اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہوا تھا کہ یہ قوم منطقی نہیں اور ان کے طور طریقے اور عقیدے بڑے پُر اسرار ہیں۔

میں نے یوکان سے منہ موڑ کر ٹرین سے باہر دیکھنا شروع کیا ـــــ فضا ابر آلود تھی۔ ہم لوگ شہر کے ہنگاموں کو پیچھے چھوڑ کر ٹوکیو کے مضافات سے گزر رہے تھے۔ حدِ نظر تک سبزے کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں' لکڑی کے کاٹج' ان پر تیرتا چمنی کا دھواں' پائن کے جھنڈ' کھیتوں میں دھان بوتی کسان عورتیں' تنکے کی ٹوپیاں پہنے مرد' اچھل پھاند کرتے بچے' ان سب کے اوپر آوارہ بادل کے ٹکڑے جن میں کہیں کہیں سے چھن کر سورج کی کرنیں مچل رہی تھیں۔ جگہ جگہ تالاب میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ایسا لگ

رہا تھا کسی مصور نے بڑے رچاؤ سے لطیف اور مدھم رنگوں سے ایک ویو کارڈ کے لیے مصوری کی ہے! مجھے بنگال کے گاؤں، دھان کے کھیت، تالاب اور گندمی حسن بڑا یاد آیا۔ ہریالی اور منظر وہی ہے مگر ہمارا کسان آج بھی قلاش ہے اور دیہی حسن وقت سے پہلے ماند پڑ جاتا ہے۔ مگر یہاں کے منظر نامے سے خوش حالی اور سکون نمایاں تھا۔ میں مشرق کے دو کناروں کو ملا رہا تھا کہ ہوسٹس نے چائے یا کافی کا پوچھا۔ میں نے ''دوموآریگاتو گزائی ماس'' کہتے ہوئے کافی کی فرمائش کی۔ جی میں آیا کہہ دیں —— بی بی، جتنی دیر میں جاپانی میں شکریہ ادا ہوتا ہے، ہم اتنی دیر میں ایک پیالی کافی بنا لیتے ہیں۔ خیر ہر ملک کے شکریے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ہم گاؤں، کھیت، تالاب چھوڑتے بڑی تیزی سے ایک میدان سے گزر رہے تھے۔ مٹی کا رنگ گہرا کتھئی یا کافی کی طرح ہو چلا تھا۔ نظروں کے سامنے پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر پائن اور چیری کے درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ بہار کی آمد آمد تھی اور چیری کے شگوفوں پر نکھار دیکھنے کی قابل تھی، مجھے کسی جاپانی شاعر کا شعر یاد آیا :

او مسرور قہقہے لگاتی موسمِ گل کی دھوپ
اتنی بے صبری سے چیری کے شگوفے کیوں گرا رہی ہے!

پتہ نہیں کب اور کن خیالوں میں مجھے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مسافروں کے زور زور بات کرنے پر آنکھ کھلی، دیکھا لوگ اترنے کی تیار کر رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا بیگ اٹھایا اور یوکان کو گڈ بائی کہتا باہر آ گیا۔

''فیوجی یاما'' کے دامن میں ''ہکونے'' دارجلنگ اور نین تال کے بیچ کی چیز ہے۔ ہمیں بس کے ذریعہ ہوٹل ماؤنٹ فیوجی لے جایا گیا۔ یہاں مطلع صاف اور فضا میں کچھ خنکی تھی۔ شہر کی گہما گہمی سے دور یہاں گھٹن نہ تھی حالاں کہ بھیڑ کافی تھی۔ ہوٹل کے لاؤنج میں تقریباً سو افراد جمع ہوئے۔ ہماری ٹور گائیڈ مس سونو نے سبھوں کا استقبال کیا اور بتایا کہ ایک گھنٹہ ہمارے پاس ہے۔ دوسری منزل پر بوفے کا انتظام ہے، پھر بس کے ذریعہ ہم سب فیوجی کی سیر کو جائیں گے۔'' اوپر خوبصورت اور دل کش جاپانی پکوانوں کا بوفے تیار تھا، مگر اسے چکھنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ ایک ویٹرس نے میری الجھن کو بھانپ کر مجھے پرلے طرف اشارہ کیا۔ ایک تختی پر ''امریکن فوڈ'' لکھا ہوا تھا۔ یہاں بھیڑ بھی زیادہ نہ تھی۔ میں نے شرافت سے ویجی بیف اسٹک اور آلو کے قتلے اٹھائے اور ایک کنارے انھیں سوارت کرنے لگا۔ ایک کنارے ایک فرنچ جوڑا کسی چیز کی تعریف کرتے مرا جا رہا تھا۔ میں سمجھا کھانے کی تعریف ہو رہی تھی۔ مگر جلد اندازہ ہوا بات ماؤنٹ فیوجی کی ہو رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھ ہی لیا۔ انھوں نے ہال

کے اس طرف ایک کھڑکی کو اشارہ کیا ـــــ میں نے جا کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو دیکھتا رہ گیا۔ دور فیوجی کا بے مثال پہاڑ برف کی ٹوپی اوڑھے کسی معمر درویش کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ اس کے گرد کہرے کا ایک ہالہ سا بنا تھا۔ میں کھانا بھول کر چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتا رہا' تصویر میں ہزار بار فیوجی یاما دیکھا تھا' مگر ان لمحات کو شاید صرف مصوری کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا تھا۔ کم از کم میرے پاس اس منظر کے لیے الفاظ نہ تھے۔ ذہن کے پردے پر سٹی گیو کی ایک نظم ابھرنے لگی :

کوہی بستی
کہر میں ڈوبی
منظر ایسا
اندازہ ہے
موسمِ گل آ کر ٹھہرا ہے!

جس طرح تاج محل کو تصویروں میں دیکھ کر سیّاحوں کو اس کی اصلی ساخت اور عظمت کا اندازہ نہیں ہوتا اور جب وہ دیکھتے ہیں تو بس دیکھتے رہ جاتے ہیں' فیوجی یاما کو دیکھ کر اس وقت میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اس دوران میں نے کھانا کیسے اور کب کھایا' یاد نہیں۔ گائیڈ کے اعلان پر ہم کھڑکی سے ہٹے۔ لوگ نیچے یکجا ہو رہے تھے اور بس جانے کو تیار کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں بس ہم سبھوں کو لے کر فیوجی یاما کی چڑھائی پر ہولے ہولے بڑھنے لگی۔ ہمارے آگے ایک لوکل بس مقامی لوگوں کو لے کر جا رہی تھی۔ اس میں سوار جوان' بچے' بوڑھے سب ایک ہی آواز ہو کر کوئی کورس الاپ رہے تھے۔ معلوم ہوا فیوجی یاما کی عظمت اور اس کی الوہی دھند کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہماری بس کے جاپانی جوانوں نے بھی آواز اٹھانا شروع کیا اور ان کا ساتھ ڈرائیور اور گائیڈ بھی دینے لگے۔ کورس کا مطلب تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اس سے ملتا جلتا لوک گیت میں نے تبّتی پہاڑیوں کو گاتے سنا تھا۔ لوک گیت اور موسیقی دنیا کے کسی کونے کی ہو' اس کی روح ایک سی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ فضا کی خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور ہماری بس کے دیگر سیاح اس لوک کورس میں تالی بجا بجا کر شریک ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی الفاظ و معنی سے پرے احساسات اس طرح مل جاتے ہیں کہ اجنبیت ختم ہو جاتی ہے ـــــ لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر ہماری گائیڈ صاحبہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گیت کا ترجمہ کر کے اس کی روح کو زخمی کرنے لگیں تو میں نے باہر کے دلکش منظر میں خود کو گم کر دیا۔

چالیس منٹ بعد ہمارا پہلا پڑاؤ آیا۔ یہاں کوئی زیارت گاہ بھی تھی' مقامی لوگوں کے لیے بس روکی

گئی۔ کچھ جوڑے اترے اور معبد کی طرف حاضری دینے چل دیے۔ ماحول کچھ ہماری زیارت گاہوں سا تھا۔ فضا پر لوبان کی مہک مسلط تھی۔ لوگ پھول بھی خرید رہے تھے۔ کچھ تعویز گنڈے کا معاملہ بھی نظر آرہا تھا۔ باہر سردی کافی تھی مگر لوگوں میں عجیب جوش وخروش تھا۔ بہت سے مقامی موٹے موٹے اونی لباس اور مفلر لپیٹے یہاں سے پیدل اوپر جاتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے یا تو کوئی مراد مانی ہوئی ہے یا منت اتارنے، اپنی عقیدت کا اظہار، پیدل جا کر کرنے والے ہیں۔ یعنی یہ لوگ بھی ہمارے عقیدت مندوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ یہاں چند مجسّمے ایستادہ تھے۔ اس سے ملتے جلتے آگے بھی خطرناک موڑوں پر دیکھ چکا تھا۔ معلوم ہوا یہ ''اوجی زو'' یعنی زمین کے محافظ کی مورتیاں ہیں! (اچھا ہم نے تو سنا تھا کہ زمین کی حفاظت کوئی اوپر بیٹھا کر رہا ہے ــــ خیر) انھیں جاپانی ''خضرِراہ'' کہہ لیجیے ــــ ایسا لگا ساری دنیا کے ڈراموں کے کردار ایک ہی طرح کے ہیں۔ بس نام بدل بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے اس طرح کے مجسّمے تقریباً دنیا کے ہر شہر میں دیکھے ہیں! دراصل ساری کائنات ایک ہی ہے۔ یہ حضرتِ انسان کی کارستانی ہے کہ اس نے رنگ ونسل اور مذہب کے نام پر (مجسّمے بٹھا رکھے ہیں) اور دیواریں اٹھا رکھی ہیں۔ ایک خوش شکل مورت نظر آئی جو بنگال کی ''سرسوتی'' سے ملتی جلتی تھی۔ پتہ چلا کہ اس کا نام ''کیشو تین'' ہے اور یہ چین کے راستے یہاں آئی ہے۔ ایک مورت ہنومان سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے بتانے والے کو جب اطلاع دی کہ یہ مورتیاں خالص ہندستانی ہیں اور چین کے راستے یہاں پہنچی ہیں تو موصوف کو یقین نہ آیا۔ میں نے کہا یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بدھ ازم ہندستان سے ہجرت کر کے رکتا رکتا یہاں آیا ہے۔ انھوں نے کہا ''ہاں سنا ہے، مگر اصل بدھسٹ یہاں ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''ہم لوگ بھی اپنے دہی کو کھٹا نہیں کہتے۔''

بس دوبارہ اپنی منزل کی طرف رواں ہوئی۔ گائیڈ نے بتایا کہ ہم لوگ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر جارہے ہیں۔ دستانے، ٹوپی وغیرہ پہن لیں اور اپنا کیمرہ تیار کر لیں، اوپر سردی بہت ہوگی۔ لوگوں نے فیوجی کی زیارت کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ راستہ پیچیدہ بل کھاتا اوپر جارہا تھا۔ دونوں طرف گہری کھائیاں تھیں، مگر ڈرائیور بڑے سکون سے پُرخطر موڑ کاٹتا لہراتا چلا جارہا تھا۔ دور تک گھنا سرسبز جنگل اور حدِ نظر تک برف پوش پہاڑیوں کا سلسلہ تھا جو دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

۸/ہزار فٹ کی بلند پر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ پہاڑ کی چوٹی ہنوز دلّی دوراست کی مانند ہےــــ مگر آدھی سے زیادہ بس نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا۔ سردی سے ہر ایک کپکپا رہا تھا مگر ہر کوئی اپنے کیمرے میں اس یادگار منظر کو محفوظ کرنے میں مگن تھا۔ میں نے بھی چند خوبصورت پوز اتارے، کچھ

اپنی تصویریں اتروائیں اور پھر بھیڑ سے دور ایک کونے میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا' کہر آلود فضا میں ایک سرشاری تھی۔ میں اپنے چاروں سمت پھیلی خاموشی کو چند لمحے محسوس کرتا رہا۔ آس پاس گھنا جنگل تھا۔ مجھے پتہ نہیں کس طرح بہت پہلے پڑھے زین فلسفے کے کچھ منظر نامے یاد آ گئے۔ ماحول، منظر اور موسم کچھ آج کی طرح کا تھا۔ خاموشی اور دھند بھی اتنی ہی تھی۔ میں اپنے دھیان میں گم ہوتا چلا گیا۔

''گھنے جنگل کی تنہائی میں' چرواہا اپنے بیل کو ڈھونڈ رہا ہے۔ نادان چرواہا خود کو کھوئے بیٹھا ہے۔ اس کا بیل تو کہیں گم ہوا ہی نہ تھا۔ پھر اسے ڈھونڈنے سے کیا مراد ہے؟ ہر سو پانی کے جھرنے ہیں۔ پہاڑیاں ، پگڈنڈیاں اور ہریالی۔ تھکا مارا وہ بے چارہ نہیں جانتا کدھر جائے! اسے تو صرف پیپل کے جنگلوں میں ٹڈوں کے گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ستراؤں کی مدد سے اسے بیل کے نقشِ پا مل گئے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ گو برتنوں کی شکلیں مختلف ہیں مگر سونا ایک ہی ہے اور خارجی دنیا دراصل پرم آتما کی مظہر ہے لیکن ابھی تک وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر پا رہا ہے۔

ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیل کے قدموں کے نشان بکھرے ہوئے ہیں مگر خوشبو دار گھاس اتنی گھنی ہے کہ چرواہا اس میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر پاتا۔ ایک جاپانی بوڑھے کے ''سیما سین'' (یعنی ذرا سنتے ہیں) کہنے پر میں چونکا۔ وہ اپنی تصویر اتروانا چاہتے تھے اور جاپانی میں جھک جھک کر جو کہہ رہے تھے اس کا مطلب صاف تھا کہ میں ان کی مدد کروں۔ میں نے خاموشی سے ان کا کیمرہ لیا اور فوکس ٹھیک کر کے شٹر دبا دیا۔ دونوں نے یک زبان ہو کر شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئے! میں ایک بار پھر دھیان کی وادی میں چرواہے کو ڈھونڈنے لگا!

''چرواہے نے آواز سن کر راستے کا پتہ لگا لیا ہے۔ اسی کے بعد اس نے چیزوں کی ابتدا پر نظر ڈالی اور اس کے حواس میں سرگم کی سی آہنگ پیدا ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ جب آنکھ کو صحیح اشارہ ملا تو اسے خود بھی اپنا پتہ مل جائے گا۔ شاخ پر کوئل گا رہی ہے' سہانی ہوائیں چل رہی ہیں اور ندی کے کنارے بیدِ مجنوں سبز ہیں ــــ بیل تو وہاں خود ہی موجود ہے' وہ کہاں چھپ سکتا ہے۔ لڑکے نے مضبوطی سے بیل کو پکڑ لیا' مگر اے لو ــــ بیل تو رسہ تڑا کر پھر کہر آلود پہاڑیوں میں جا چھپا ہے۔ چرواہے کو اپنا رسہ اور سونٹا کبھی نہ کھولنا چاہیے تا کہ بیل دنیا کی ناپاکیوں میں گم نہ ہو جائے۔ لیکن اگر بیل کی ٹھیک طرح رکھوالی کی گئی تو وہ خود ہی سُدھ جائے گا' خود ہی چرواہے کے پیچھے چلنے لگا۔''

کش مکش ختم ہوئی ــــ اب چرواہا اپنے بیل کی پیٹھ پر شام کے دھندلکے میں بانسری بجاتا گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہے ــــ کیا اب بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے گیان مل گیا ہے۔''!

سردی کی وجہ سے میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی اور میں نے چرواہے کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا مگر ذہن میں عجیب سوال سر اٹھانے لگے۔ یہ گیان، نروان، روشنی ــــ یہ ہے کیا۔ کیوں ہے۔ انسان اتنا بے بس کیوں ہے، کیا اس کے بغیر واقعی مکتی نہیں؟ ایک شعر خاموشی میری زبان پر آ گیا :

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کفر ہے

لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال پر

میں نے ایک بھرپور نگاہ طرۂ امتیاز پہنے درویش فیوجی یاما پر ڈالی اور چپ چاپ بس میں واپس آ گیا ۔اس مقام پر ایک طرح کا سکون حاصل ہوا تھا۔ میں اب کچھ اور دیکھنے کے موڈ میں نہ تھا۔ ہماری بس نیچے اتر کر ایک خوبصورت جھیل ''یامانا کا'' پر کچھ دیر رکی۔ گہرے نیلے رنگ کی اس جھیل پر بھی ایک پُرسکون خاموشی کا پہرہ تھا۔لوگوں نے یہاں بھی تصویریں اتاریں۔ کچھ جوانوں نے کنکر پھینک کر جھیل کے سکوت کو توڑا۔تھوڑے فاصلے پر کھیل کود اور تیراکی کا بھی انتظام تھا۔مگر موسم کی خنکی سے کسی کی ہمت نہ ہوئی ۔یہاں ہمارا گروپ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک وہ جو شام واپس جا رہے تھے' ایک جنھیں رکنا تھا۔ میری طرح اور بھی کچھ لوگ تھے جو ہوٹل واپس جانا چاہتے تھے۔ ہم لوگوں نے ''اواکیڈاسنی'' نیچرل سائنس میوزیم کوٹالا اور دوسری بس سے ہوٹل آ گئے!

ماؤنٹ فیوجی شاندار فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔لاؤنج میں کافی کی چسکی لیتے ہوئے گروپ میں سے پانچ لوگوں نے اچانک یہ فیصلہ کیا کہ وہ لوگ اس عالیشان ہوٹل کی بجائے کسی مقامی سرائے میں رات گزاریں گے' تاکہ جاپانیوں کے طرزِ رہائش کو قریب سے دیکھا جائے۔ بیشتر لوگوں نے ہنس کر بات رد کر دی۔ میں نے ہاتھ اٹھایا کہ مجھے ان کا آئیڈیا پسند آیا۔ان پانچ سرپھروں میں دو امریکی لڑکے اور دو لڑکیاں اور ایک جرمن جوان تھا۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ ہماری الگ ٹولی بن گئی۔سبھوں نے ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ ہمارا گروپ لیڈر ''ایگور'' تھا جو جرمنی سے کسی کاروبار کے سلسلے میں جاپان میں مقیم تھا۔اسے تھوڑی بہت جاپانی بھی آتی تھی اور ہم لوگوں سے بہتر تھا۔مگر صحیح آوارہ گرد تھا! باقی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا طالب علم تھے اور ایکسچینج پروگرام کے تحت نئے نئے آئے تھے۔ایک لڑکا سیاح تھا اور میری طرح فار ایسٹ کی سیاحی کو نکلا تھا۔''ایگور'' نے گائیڈ کو خبر کر دی کہ ہم لوگ رات مقامی لوگوں کے مہمان رہیں گے مگر صبح کے وقت پر ٹور گروپ میں شامل ہو جائیں گے۔ ہماری ٹولی باہر نکلی۔لڑکیوں نے ٹیکسی کی فرمائش کی مگر ایگور نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ذرا بازار میں گھومنے چلتے ہیں۔ہم سب اپنی اپنی کتھا سناتے' ایک ایک دکان پر تانک جھانک کرتے ایک چھوٹے سے بازار میں آ کر رک گئے۔لڑکیوں نے

چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔لڑکوں نے سگریٹ خریدا۔ میں نے ہزار ین کا ایک کنگھا خریدا۔ ایگور قریب کے کسی فون بوتھ پر کسی سرائے کا ٹھکانہ معلوم کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ کسی ''ردیوکان'' یا جاپانی سرائے کا پتہ ڈھونڈ لایا اور ہم سب اس کے پیچھے چل پڑے۔

''رویوکان'' ایک بڑا سا چوبی کاٹج نما سرائے تھا۔ ایک ہرے بھرے باغ کے بیچ یہ کاٹج بڑا رومان پرور لگ رہا تھا۔ کرایہ ۵۰۰۰ رین یومیہ تھا جس میں رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ شامل تھا۔ ہم سبھوں کو یہ جگہ مناسب لگی۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک طرف چبوترے پر دو لڑکیاں گلابی کیمونو میں ملبوس دوزانو بیٹھی تھیں۔ ''آراساہائے ماس'' کہتے ہوئے انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ایگور سب سے آگے تھا۔ اس سے لڑکیوں نے اور اس نے ہم سبھوں کو ایک کنارے جوتا اتار دینے کی گزارش کی۔ ہمارے جوتے اتروا کر ہمیں کپڑے کے نرم سلیپر دیے گئے۔ ہم لوگ ایک چھوٹے سے ہال میں تتامی یعنی چٹائی بچھا کر بیٹھ گئے۔ ایگور کمرے بک کرنے سے پہلے کی تفصیل معلوم کرنے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہمیں کمرے دکھائے گئے۔

ہر کمرے پر نمبر کی جگہ جاپانی پھول یا درخت کا نام لکھا تھا۔ مجھے اور ایگور کو جو کمرہ ملا اس کا نام ''چیری سوئیٹ'' تھا۔ کمرے کے باہر سلیپر بھی اتار دینے کا دستور تھا۔ جس کی مجھے تو عادت تھی مگر میرے ساتھی بار بار چپل پہننے اور اتار دینے پر ہنس بھی رہے تھے اور بور بھی ہو رہے تھے۔ ایگور نے ان کی کیفیت بھانپ کر بتایا کہ بھیا یہاں ٹائلٹ اور باتھ روم کے بھی علیحدہ سلیپر ہیں۔ اس کا خیال رکھنا —— اور ہاں' آپ ننگے پیر بھی نہیں گھوم سکتے۔ ہم لوگ باتوں میں لگے تھے کہ ایک لڑکی نے ہال کے ایک طرف ایک چھوٹی سی میز لگا دی اور اس کے اطراف کشن ڈال کر ہمیں بیٹھ جانے کو کہا۔ ایک دوسری لڑکی چائے کی کیتلی اور بسکٹ کا طشت لے آئی۔ دوزانو بیٹھ کر اس نے سبھوں کے لیے چائے بنائی۔ یہ چائے سادہ تھی جس کا مزہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ہاں بسکٹ خوب تھے۔ ہم چائے پی رہے تھے کہ پہلی لڑکی ایک رجسٹر لے آئے اور سبھوں سے اس میں خانہ پری کے لیے گزارش کی۔ پھر ہم سب اپنے اپنے کمروں کو چل دیے۔

ہمارا کمرہ سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ اکیبانا پھولوں کی آرائش کے علاوہ کمرے میں کچھ نہ تھا۔ دیوار میں بنی الماری میں سونے کا سامان رکھا تھا۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ باتھ رم یہاں کامن تھا۔لڑکوں نے تو اسے برداشت کر لیا مگر دونوں لڑکیاں ناک بھوں چڑھانے لگیں مگر کچھ بول نہ سکیں۔ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں کا جائزہ لے رہے تھے کہ چائے والی لڑکی ایک ٹوکری میں ایک تولیہ، ایک صابن اور ایک ''کیمونو'' نما لباس جسے ''یوتا کا'' کہتے ہیں' لے آئی۔ ہر ایک کو اس طرح کی ٹوکری مل گئی' ہم سبھوں نے بآواز بلند ایک ساتھ ''دوموآری گا تو گزائی ماس'' کہا اور لڑکی ہنستے ہوئے

کورنش بجالائی اور چلی گئی۔ پتہ چلا اس طرح کے سرائے ایک ہی خاندان کے لوگ مل کر چلاتے ہیں۔ ہمارے میزبان بھی ایک ہی کنبے کے افراد تھے۔ ہر ایک نے اپنے ذمہ ایک کام لے لیا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ ہم لوگ ڈنر اور سونے سے پہلے ذرا گھومنا چاہتے تھے۔ ''ریوکان'' کے پیچھے ایک ہرا بھرا باغ تھا۔ اس میں ٹہلتے ہوئے ہم لوگ ایک اور کاٹیج کی طرف نکل آئے جس میں سے کچھ موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ پتہ چلا یہ ''گیشا ہاؤس'' ہے اور اس سے متصل ایک ٹی ہاؤس۔ یہاں راگ رنگ کی محفل گرم تھی۔ مگر دونوں جگہ ہاؤس فل تھا اور ہم لوگ دوسری شام کا پروگرام بناتے واپس لوٹ آئے۔ میں نے ساتھیوں سے اجازت چاہی۔ میں تھکا ہوا تھا اور فوراً سونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا صبح ۸ بجے ناشتہ پر ملاقات ہوگی۔ ڈنر کے لیے میری طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔ مجھے کمرے میں چھوڑ کر وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ سب سے پہلے میں نے جاپانی لباس پہنا پھر الماری کھول کر دیکھا۔ ایک گدا جسے ''شی کی بوئن'' کہتے ہیں، ایک ''ماکورا''، یعنی تکیہ، ایک ''موفو''، یعنی کمبل ساتھ ہی ایک رضائی جسے ''کاکی بوٹن'' کہا جاتا ہے۔ چلئے صاحب ہوگیا بستر۔ چٹائی پر بستر لگا کر میں ڈھیر ہوگیا۔ جاپانیوں کی سادہ رہائش کا سوچتے ہوئے میں کروٹ بدل رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے ہولے سے دستک دی۔ میزبان لڑکی جس کا نام ہم نے اب تک نہیں پوچھا تھا، کھانے کی ٹرے سنبھالے کھڑی تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے منع کر دیا۔ جاتے ہوئے اس نے لفظ ''بریک فاسٹ'' ادا کیا۔ میں نے بھی صرف ''آملیٹ'' کہہ کر جان چھڑائی۔ چلئے ناشتے کا آرڈر ہوگیا۔ پتہ نہیں دوسروں کو کیسے نیند آئی۔ میں جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

صبح ٹائلیٹ دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ ماحول بالکل دیسی طرز کا تھا۔ میں نے سوچا یہ لوگ جتنی ترقی کر لیں، اندر سے خالص مشرقی ہیں۔ عرصے بعد اپنے پرانے اسٹائل کو اپنا کر طبیعت صاف ہو چکی تھی۔ نہانے سے فارغ ہو کر میں کمرے میں پہنچا تو دیکھا پوری منڈلی میرے کمرے میں جمع تھی۔ لڑکیاں جھک جھک کر جاپانی آداب پر ہنس رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ناشتہ آنا شروع ہوا۔ ہم سب سنبھل کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ دو لڑکیوں نے ہاتھ میں ایک بڑی ٹرے سنبھال رکھی تھی۔ ایک نے بڑھ کر میز پر ناشتہ چن دیا۔ دو طرح کے سوپ، پانچ کچے انڈے، ایک ادھ پکی مچھلی، سوکھی مچھلی کے چند قتلے، کئی طرح کے اچار، کچھ سمندری سیپیاں اور پتہ نہیں کیا کچھ الا بلا اور ایک بڑی ڈش میں ڈھیر سارا چاول۔ مزے کی بات یہ تھی کہ چاول کے علاوہ ساری چیزیں ٹھنڈی تھیں۔ یہ تھا جناب روایتی اور صحت مند جاپانی ناشتہ، میرا ناشتہ ابھی نہ آیا تھا۔ میں چپ کا بیٹھا رہا مگر ایگور اور دوسرے لڑکے لڑکیاں کچھ دیر منہ کھولے ناشتے کو تکا کیے۔ پھر سبھوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں محض مسکرا رہا تھا اور دل میں خوش تھا کہ جاپانی نہ جاننے کی

وجہ سے پہلی بار فائدہ ہوا تھا۔ ایک لڑکی نے پوچھا کیا واقعی جاپانی روز اتنا اور ایسا ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر سبھوں نے ایک زبان ہوکر کہا ''سوری، وی پاس''۔ ہماری میزبان حواس باختہ تھی کہ غلطی کہاں ہوئی۔ ایگور نے معاملے کو سنبھالا اور کافی لانے کو کہا۔ اتنے میں میرے لیے آملیٹ اور کافی آ گئی تھی۔ کافی گرم مگر آملیٹ ٹھنڈا تھا۔ میں نے حالات کے تحت اسی کا شکریہ ادا کیا۔ پھر سبھوں کے لیے ڈبل روٹی اور جام کی گزارش کی گئی۔ اور اس طرح جاپانی ناشتے سے جان بچائی گئی۔ ہم لوگوں نے ناشتے سے فارغ ہوکر کمرے کا کرایہ دیا اور جلدی جلدی ہوٹل کی طرف چلے کہ کہیں بس نہ چھوٹ جائے —— ویسے جاپانی سرائے و میزبانی کا تجربہ خوب رہا، سوائے ناشتے کے۔

ہوٹل ماؤنٹ فیوجی سے بس ہمیں لے کر ''ہکونے نیشنل پارک'' کی طرف بڑھنے لگے۔ کوئی پندرہ منٹوں میں ہم لوگ ہکونے پہاڑ کی ترائی میں پہنچ چکے تھے۔ آج موسم خوش گوار تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی، خنکی تھی مگر گزشتہ کل کی طرح سردی نہ تھا۔ یہاں سے ''کیبل کار'' کے ذریعہ ہم لوگ کوئی چار کیلومیٹر لمبے سفر میں تار سے لٹکتی ٹرالیوں میں بیٹھ کر جھولا جھولتے چل پڑے۔ یہ ٹرالیاں زمین سے کافی اوپر لٹک رہی تھیں۔ گو ان کی رفتار بہت تیز نہ تھی مگر پہلے پہل اس میں بیٹھنے والے کو ڈر سا لگتا ہے۔ میں یورپ اور ہانگ کانگ میں ایسی سواری پر بیٹھ چکا تھا۔ ہمارے اطراف میں برف پوش پہاڑیاں تھیں۔ ہوا صاف ستھری چل رہی تھی۔ نیچے گھنا جنگل تھا۔ ابھی ہم تھوڑی دور چلے تھے کہ دور ہی سے پہاڑوں پر دھواں سا اٹھتا نظر آیا۔ کہیں کہیں شعلے بھی لپک رہے تھے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ آتش فشاں پہاڑ ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم جہنم کی وادی سے گزر رہے تھے۔ نیچے آتش فشاں پہاڑیوں سے نکل کر بہتا ہوا گرم لاوا ایک نالے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ فضا میں آبی ابخار اُٹھ رہے تھے۔ گرم چشمے بھی ابل رہے تھے۔ اچانک گرمی محسوس ہونے لگی۔ کہیں کہیں سیاہ تار کول گرمی سے پگھل کر گڑھوں میں پک رہا تھا۔ جگہ جگہ زمین پک سی گئی تھی اور ان میں سے لاوا ابھر رہا تھا۔ کافی اوپر سے ہم لوگ گزر رہے تھے مگر منظر بڑا ہیبت ناک تھا۔ آج تک ملاؤں سے جہنم کی جو باتیں سنی تھیں اس کی ڈاکومنٹری یہاں دیکھ رہا تھا۔ اگر ان گڑھوں میں کوئی گر جائے تو جل کر کوئلہ ہو جائے۔ یہ سوچتے ہی ایک پھریری سی آئی۔ کل جنت نظیر فیوجی یاما کی درویشی دیکھی تھی۔ آج جہنم کی وادیوں کا جلال نظر کے سامنے ہے۔ ایک بے تکا سا سوال ذہن میں آیا کہ جنت اور جہنم کیا اسی دنیا کے خطوں کے نام تو نہیں۔ جواب ہر کوئی اپنی طرح سے تراش لیتا ہے۔ مگر جاپان میں دونوں کے نمونے دیکھنے کو مل گئے۔ کچھ ہی دیر میں طبیعت الجھنے لگی۔ ہم اس جہنمی وادی سے جلد از جلد گزر جانا چاہتے تھے۔

اس کے بعد ''ہکونے جھیل'' میں ایک پرانی وضع کے بادبانی جہاز کے ذریعہ ہم لوگ آدھے گھنٹے تک جھیل کی گہرائی اور خاموشی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ ایک گہرے رنگ کی عام سی جھیل ہے مگر جہنم کی وادی سے نکل کر یہاں بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور جھیل میں فیوجی یاما کا الٹا عکس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آئس کریم کے کون نما اس عکس کی لوگوں نے دھڑا دھڑ تصویریں اتاریں کیوں کہ یہ منظر صرف دھوپ میں چمکنے پر نظر آتا ہے۔ آج پھر ہم نے یہاں کے عجائب گھر کے پروگرام کو ٹالا۔ پتہ چلا معدنیات کا خاصہ ذخیرہ ان لوگوں نے جمع کر رکھا ہے۔ ہماری ٹولی سبھوں کو چھوڑ کر ایک دوسری بس کے ذریعہ واپس ہکونے آ گئی کیوں کہ آج ''گیشا ہاؤس'' میں کھانا اور ٹی ہاؤس میں شام کی چائے پی کر ٹوکیو واپس جانا تھا۔

☆☆☆

جشنِ چائے اور گیشا گرلز

جاپان کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس میں جشنِ چائے اور گیشا لڑکیوں کے بارے میں بڑے قصے سن رکھے تھے۔ ایگور کی سرپرستی میں ہم لوگ ''ہکونے'' میں ایک باغ ''سوکی یاما'' کو آئے تھے۔ اسی میں ٹی ہاؤس بھی تھا اور کچھ فاصلے پر ''گیشا ہاؤس'' یا ''رائی اوتی ریستوراں'' بھی تھا۔ جاپانی کلچر میں نیچر کو بڑا دخل ہے۔ اسی لیے پھولوں سے پیار کرنے والی یہ قوم اپنے باغوں کو بڑے فخر سے سجاتی ہے اور اس کی خاصی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ ''سوکی یاما'' باغ میں چھوٹے چھوٹے مصنوعی پہاڑ، نقلی جھرنے، تالاب جن میں تیرتی مچھلیاں او بطخیں اور جھومتے کنول کے پھول' جگہ جگہ لکڑی کے پل اور طرح طرح کے درختوں کے جھنڈ خاص کر پائن کے درخت اور چیری کے شگوفے بڑے قرینے سے سجے رہتے ہیں۔ اس باغ سے متصل ''چانی واباغ'' تھا جس میں لکڑی کے چائے خانے، مہمانوں کو عبادت کی سی عقیدت کے ساتھ چائے کی رسم سے نوازتے ہیں۔ پہلے ہم لوگ ''گیشا ہاؤس'' میں داخل ہوئے۔ یہاں ہال کی جگہ چھوٹے چھوٹے کیبن میں چٹائی بچھی تھی اور میز کے ساتھ فرشی انتظام تھا۔ کیمونو میں ملبوس ایک گیشا صاحبہ نے ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ جوتا اتار کر ہم سب اس کی رہبری میں ایک کیبن میں جمع ہوئے۔ لکھنوی آداب اور جوتا گھر کے باہر اتارنے کا اہتمام تو جاپانیوں نے بری طرح اپنایا تھا مگر جوتا غائب ہونے اور کرنے کے فن سے بے چارے غافل تھے ـــــ ایگور نے سبھوں سے کھانے کا دریافت کر کے جاپانی میں محترمہ کو آرڈر دے دیا۔ ابھی ہم لوگ چٹائی سے لگے ہی تھے کہ ایک بچی چائے کی کیتلی لے آئی۔ دوزانو بیٹھ کر اس نے چائے پیش کی۔ پھر ایک اور قدرے جوان گیشا جی نمودار ہوئیں اور آتے ہی اپنا پنکھا ہلا ہلا کر ناچنے لگیں۔ کسی اور کمرے سے بے سری سی بانسری اور بے ہنگم ڈھول کی آواز بھی آ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس لڑکی نے ناچ کے ساتھ کچھ گانا بھی شروع کر دیا۔ معلوم ہوا اس کلاسیکل رقص کو 'بویو' کہتے ہیں جس میں لڑکی ناچ کم رہی تھی اور پنکھا زیادہ جھل رہی تھی۔ جاپان میں گیشا یا طوائف زادیاں فیوڈل عہد کی دین ہیں۔ سولھویں صدی کا ہیرو ''سمورائی جنگجو' جب سماج کا آئیڈیل بنا تو عورتیں پردے میں بٹھا دی گئیں۔ نہ صرف روزمرہ کی زندگی اور ضروریات میں گیشا لڑکیاں مقبول ہوتی گئیں' بلکہ ادب میں' یعنی ناولوں میں انھیں ہیروئن بنا دیا گیا۔ گیشا گرلز آج بھی جاپانی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اٹھارہویں صدی کی گیشا لڑکیاں زیادہ تر ادبی ذوق اور موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں۔ ان میں بیشتر

ڈراموں میں حصہ بھی لیتی تھیں۔ گویا جاپانی گیشا ہماری لکھنوی امراؤ جان آدا سے کسی طرح سے کم نہ تھیں۔ (بلکہ ہیں)!

میں اپنے ذہن میں گیشا اور امراؤ جان کا تقابلی جائزہ لے رہا تھا کہ کھانا آ گیا۔ میں نے ''ٹمپورا'' پکوان منگوایا تھا جس میں تلی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ میرے ساتھی مختلف پکوانوں کو آزمارہے تھے۔ ہماری میز پر ایک گیشا خاتون بھی ساتھ دینے کو تیار تھیں۔ میں نے خاتون اس لیے لکھا تھا کہ محترمہ کم از کم پینتالیس بہاریں مسکرا چکی ہوں گی مگر چہرۂ گل نار پر اب بھی آب پوری طرح موجود تھا۔ اتنے دنوں میں ہم نے بھی جاپانی عمر خاص کر عورتوں کی عمر کا کچھ کچھ اندازہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ مسٹر ایگور بڑی شرافت سے گیشا جی سے باتیں کر رہے تھے اور شاید گیشا جی کے آداب یا ریستوران کی رسم کے مطابق خاتون نے بڑی اداؤں کے ساتھ نوالہ بنا کر ایگور صاحب کو اپنے دستِ نازک سے کھلانا بھی شروع کر دیا تھا۔ گروپ کی دونوں لڑکیاں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پا رہی تھیں۔ دوسری گیشا ریستوان اور مافیہا سے بے نیاز ہو کر ناچ بلکہ پنکھا جھلے جا رہی تھی۔ ایگور اِن نوازشوں پر یوں بچھے تھے کہ بس گیشا کی گود میں سر چھپانے والے ہوں۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ دونوں گیشاؤں کو انگریزی نہ آتی تھی اور دونوں بس نگاہوں اور اپنے عشوؤں سے ہم کلام تھیں۔ کچھ دیر تک یہ رومانی مگر بے حد تصنع والی ضیافت چلتی رہی۔ پھر بڑی اداؤں سے ہمارا ہاتھ دھلایا گیا۔ گروپ کے ایک لڑکے نے بڑے مزے کی بات کہی کہ ان شریف زادیوں کو ناچنے گانے سے زیادہ کھانا کھلانے میں مہارت ہے۔ یہ اپنا پیشہ چھوڑ کر ویٹرس کیوں نہیں بن جاتیں۔ ہم سب اس حقیقت پر غور کرتے ہوئے شہرہ آفاق گیشا ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ شام چار بجے کا عمل ہوا چاہتا تھا۔ ہمارے پاس مزید دو گھنٹے تھے۔ سات بجے والی ٹرین سے ہمیں ٹوکیو واپس چلنا تھا۔

پائیں باغ سے ہوتے ہوئے ہمارا قافلہ ایک چوبی ٹی ہاؤس پہنچا۔ میں نے سوچا چلو اس رسم کو بھی نبھاتے چلیں۔ جشنِ چائے کو ''چانویو'' یا ''سادو'' کہتے ہیں۔ جس طرح بنگال میں شادی سے پہلے کنواریوں کے لیے موسیقی اور رقص کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے اسی طرح ہر جاپانی لڑکی ''ایکیابانا'' یعنی پھولوں کی آرائش کا فن اور چائے بنانے اور پیش کرنے کا فن ضرور سیکھتی ہے۔ جاپان میں جشنِ چائے کو روحانی، رومانی اور تہذیبی اہمیت حاصل ہے۔ سولہویں صدی میں چین سے یہ رسم یہاں آئی اور زین فلسفے کے زیر اثر ''ماسٹر مسینو ریکیو'' نے اسے روحانیت بخشی، جشنِ چائے میں صرف چائے نوشی نہیں کی جاتی بلکہ محفل کے آداب بھی سکھائے جاتے ہیں۔

ٹی ہاؤس میں مختلف کیبن بنے تھے۔ ہم لوگوں کا استقبال کیمونو والی ایک خوش شکل سی لڑکی نے کیا۔

سب جوتا اتار کر ایک کیبن میں جمع ہوئے ۔میں نے ایک بات محسوس کی کہ ہر جگہ جوتا اتارنے پر امریکن بور تو تھے ہی، بار بار فرش پر بیٹھنے میں بھی انھیں تکلیف کا سامنا تھا۔ میں مزے سے آلتی پالتی مارے، گوتم بدھ کے انداز میں بیٹھ گیا۔ دوسرے کمرے میں چائے کا اہتمام تھا جہاں پہلے سے کچھ لوگ جمع تھے۔ ایگور نے میزبان خاتون سے بتایا کہ ہم لوگ جلدی میں ہیں اور ممکن ہو تو ہمیں جلد فارغ کر دیا جائے ۔عورتوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور پھر ہمیں بازو کے کمرے میں لے جایا گیا۔

اس کمرے کا دروازہ بہت چھوٹا تھا۔ ہم لوگ تقریباً رکوع میں ہو کر داخل ہوئے ۔ پہلے میں سمجھا جاپانیوں نے اپنے قد کے مطابق دروازہ بنایا ہے مگر پتہ چلا یہ چھوٹا اس لیے ہے کہ یہاں سے گزرتے ہوئے آدمی اپنی انا کو بھول کر مطیع بن جاتا ہے ۔ یہ فلسفہ میرے ساتھیوں کے سر سے گزر گیا۔ کمرے میں پہلے سے تین افراد دوزانو بیٹھے تھے۔ کمرے کے بیچ ایک چولہا روشن تھا جو زمین میں تنور کی طرح گڑا ہوا تھا ۔اسے ''فورو'' کہا جاتا ہے۔اس پر ایک کیتلی چڑھی تھی جسے ''کاما'' کہتے ہیں۔معاملہ سیدھی چائے نوشی کا تھا مگر اہتمام اور لوازمات نے اسے بڑا پُراسرار بنا دیا تھا۔ دولڑکیاں ہاتھ میں ایک طشت سنبھالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ دوزانو ہو کر وہ تعظیماً جھک گئیں۔طشت میز پر رکھی اور زمین پر سربسجود ہو گئیں ۔(یہ سب مغلِ اعظم کا بھولا بھٹکا سین لگ رہا تھا۔) جواب میں سبھوں نے کمر خم کی اور طشت سے مٹھائی نما شئے اٹھائی اور کھانے لگے ۔ مجھے شکل ہی سے وہ مٹھائی بھدی لگ رہی تھی ۔ میں کھڑکی کے باہر باغ کا معائنہ کرنے لگا۔

جاپانیوں کے لیے جشنِ چائے ایک ذہنی ڈسپلن ہے جس میں ''وابی فلسفے'' کے تحت انسان پرسکون اور قانع ہو جاتا ہے۔اس جشن کا حسن اس کی سادگی میں ہے۔ ہماری میزبان چولہے کے پاس دوزانو بیٹھ گئی ۔کیتلی میں پانی ابل چکا تھا۔قریب ہی ایک ڈبہ جسے ''اوسوکی'' کہتے ہیں، رکھا تھا۔اس میں سبز پاؤڈر کی طرح چائے پتی (جسے ''مانچا'' کہتے ہیں) نکال کر ایک پیالی میں تھوڑا گرم پانی ڈالتے ہوئے گھولا گیا اور دوسری لڑکی نے پیالے یا ''چاون'' سجائے اور ان میں چائے ڈالی گئی ۔لڑکی دوبارہ سربسجود ہوئی۔ سبھوں نے جھک کر اس کا جواب دیا۔لڑکی اٹھی اور ایک ایک کو بڑے انداز سے پیالہ بڑھایا۔ہمیں چائے کے ظروف کے علاوہ پینے کا طریقہ اور آداب بتائے گئے ۔ داہنے ہاتھ میں پیالہ پکڑتے ہوئے اسے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر جما لو۔ پھر اسے تین بار ہاتھوں میں گھما کر اٹھاؤ اور پی جاؤ۔ میں نے تمام آداب کا خیال کرتے ہوئے جب پیالہ ہونٹوں سے لگایا تو سارے جسم میں جھرجھری آ گئی ۔کم بخت چائے کڑوا جوشاندہ تھی ۔مرتا کیا نہ کرتا۔ بڑے ادب سے اس تہذیبی اور روحانی رسم کو ادا کیا۔ میرے ساتھیوں کی

حالت مجھ سے بدتر تھی۔ جونہی میزبان نے ہمارے پیالے دوبارہ بھرنے کے لیے اٹھائے، ہم سب ایک ساتھ کھڑے ہوئے اور جھکتے ہوئے اجازت چاہی۔ ایگور نے انھیں سمجھایا کہ ہماری ٹرین کا وقت ہو چلا ہے، پھر کبھی! باہر نکل کر ہم نے کہا، بھیا پھر کبھی تم ہی جانا۔ ہم تو اب ایسے جشن میں نہیں آتے۔

خیر ہمارے دو تجربے اپنی مثال آپ تھے۔ ویسے مزا نہ چائے میں آیا نہ گیشا کی اداؤں سے مگر نئی تہذیب اور انوکھی رسم سے آگاہی ہوئی۔ ہم سب گرتے پڑتے شام کی ٹرین سے ٹوکیو واپس آئے اور اپنی اپنی طرف چل دیے!

☆☆☆

تبسمِ عارفانہ سے غسلِ عاشقانہ تک

جاپانی تبسم روح کی گہرائیوں میں اترنے کے ساتھ بڑا پراسرار بھی ہوتا ہے۔ جب بھی کسی نازک اندام جاپانی نے اپنی عارفانہ مسکراہٹ سے میری تواضع کی' دلِ ناداں تو دھڑکا مگر میں نے بھی ایسے موقع کے لیے برمحل اشعار زبانی یاد رکھے ہیں۔ بس خود کو اس شعر سے بہلاتا ہوں :

دیکھنے والو تبسم کو کرم مت سمجھو!
ان کو تو دیکھنے والوں پہ ہنسی آتی ہے

اور پھر بڑی شانِ بے نیازی سے مسکرا کر نظریں جمائے جائے وقوع سے پھیر لیتا۔ اس طرح طرفین اپنی جگہ خوش۔ ایک زمانے میں جاپانی تبسم کو غلامی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تاریخی وجہ بھی ہے۔ فیوڈل عہد میں ایک جاپانی جب دوسرے سے ملتا تو اسے مسکرا کر فوراً یہ ظاہر کرتا کہ اس کا دل صاف ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مسکراہٹ ان کی عادت میں شامل ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ مسکرا مسکرا کر ایسے عارف بنے کہ ان کی مسکان روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ جاپانی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ "ہمارے تبسم میں نرمی' امن، بندگی اور جذبۂ خیر سگالی شامل ہے۔" میرے خیال میں اتنی تہہ داری اور معنی خیز مسکراہٹ کسی اور قوم کے پاس نہیں۔ کاش ہم بھی اتنی موٹی مسکراہٹ اتنے لطیف معنوں میں اپنی عادت میں شامل کر سکتے!

جاپانی تبسم کی شہرت اب دور دور تک پھیل چکی ہے۔ یہ ان کی تبسمِ عارفانہ کا کمال ہے کہ پچھلے دنوں "یوکو مینا مینو" (جسے پیار سے صرف نانو پکارا جاتا ہے) کی مسکراہٹ کو ملک گریناڈا نے اپنے ڈاک ٹکٹ کی زینت بنایا ہے۔ نانو جاپان کی مشہور جوان اداکارہ' گلوکارہ اور چیونگ گم کے اشتہار کی ماڈل گرل ہے۔ نانو کی مسکراتی تصویر والا ڈاک ٹکٹ بڑا مقبول ہوا ہے اور خوب بک رہا ہے۔ مگر یہ بھی سنا ہے کہ اس ڈاک ٹکٹ کی درآمد زیادہ تر جاپان میں ہی ہوئی ہے۔ مینا مینو کا نام سن کر مجھے رائل میوزیم والی مینوری دائی کی لطیف مسکراہٹ بھی یاد آ گئی اور ساتھ ہی چیری کے پُر بہار شگوفے بھی نظروں میں گھوم گئے۔

ٹوکیو میں قیام کے دوران جاپانی تہذیب کے پیچیدہ رموز سے رفتہ رفتہ شناسائی ہو رہی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر جگہ اور ہر کسی کے آگے تعظیم سے جھکتے ہوئے سب سے یکساں پیش نہیں آتے بلکہ جھکنے کی ڈگری رشتہ اور تعلقات پر منحصر ہوتی ہے۔ کسی کو صرف گردن کے خم سے' کسی کو رکوع میں جا کر اور کہیں کہیں سربسجود ہو کر یہ لوگ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے بس سجدے نہیں کیے مگر تعظیم سے جھک جھک کر سلام کا جواب دیتے ہوئے میری کمر بول گئی۔ اس تعظیم کو جاپانی "او جی گی" کہتے ہیں۔ خیر

تمام درد کے باوجود مجھے جاپانیوں کا امراؤ جان والی کورنش اور آداب بہت پسند آیا!

میں نے اکثر شنتو زیارت گاہوں کے سامنے زائرین کو تین بار زور سے تالیاں بجا کر آنکھ موندے پوجا کرتے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا اسے ''کاشی وادے'' کہا جاتا ہے اور زور سے تالی بجانے سے مراد دیوتاؤں کی یکسوئی حاصل کرنا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے اکثر اسی انداز میں زور سے تین بار تالیاں پیٹتے کئی نائٹ کلب کے سامنے اس کے میزبان کو بھی دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے اس بار توجہ کا مرکز عاشق مزاج گاہک ہوں۔ ایک پارٹی میں ایک جاپانی جوڑا جو بڑا مخمور اور سرور میں نظر آ رہا ہے' ہاتھ اٹھائے چیخ چیخ کر ''بان زائی'' پکار رہا تھا۔ میں سمجھا اپنے رب کو پکار رہا ہے' پتہ چلا ''یاہو'' کا بدل جاپانی میں ''بان زائی'' ہے جس کے معنی ہیں دس ہزار سال' اکثر کسی جشن کے شروع یا آخر میں دعائیہ کے طور پر ایسی چیخ و پکار ہوتی ہے۔ یعنی دس ہزار سال تک کی پارٹی کے لیے جوان دعا گو تھا!

انور' میں اور ایک جاپانی ساتھی کسی شو کے لیے گئے۔ ہال میں انور کے ایک اور جاپانی ساتھی مل گئے۔ آپس میں تعارف ہوا۔ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ موصوف نے ہڑبڑا کر کہا ''میں متشی بوشی'' میں کام کرتا ہوں۔ مجھے یہ تعارف بڑا عجیب لگا۔ ہم لوگ آگے بڑھے تو ہمارے ساتھ والے جاپانی دوست نے کچھ خفت کے ساتھ بتایا کہ جاپانی تعارف کے معاملے میں ذرا کرخندار یا کمرشیل ہوتے ہیں۔ وہ اپنا تعارف اپنے پیشے یا عہدے یا کمپنی کے ذریعہ کرتے ہیں تاکہ اگلا اس کی پوزیشن سمجھ لے۔ اس لیے جب دو جاپانی ملتے ہیں' رسماً جھکنے کے بعد فوراً اپنا بزنس کارڈ کا (جسے میشی کہا جاتا ہے) تبادلہ کرتے ہیں۔ جاپانی عموماً بہت کم گو ہوتے ہیں اور اکثر کاروباری میٹنگ میں ایک پارٹی دوسرے سے ملنے کے لیے گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے باوجود ملتے ہی جھکتے ہیں' اپنے کارڈ کا تبادلہ کرتے ہیں' کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر مسکراتے ہوئے رخصت ہوجاتے ہیں۔ میرے پاس جاپانی دوستوں کے بے شمار کارڈ جمع ہوچکے تھے جنھیں میں بڑے چاؤ سے سنبھال کر رکھے ہوئے تھا مگر ''میشی سنڈروم'' کی ذہنیت کا سن کر یہ کارڈ بڑے بے جان لگے۔ خیر یہ ان کا آپسی یا تجارتی معاملہ تھا مگر میزبانی میں جاپانی کسی طرح کم نہیں۔ وہ بات جتنا کم کرتے ہیں' تحفے اسی قدر زیادہ دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تحفے دے کر وہ بات چیت سے بچنا چاہتے ہوں۔ میں جس سے ملا دوسری ملاقات میں موصوف ایک خوبصورت پیکٹ لیے چلے آ رہے ہیں۔ میں خانہ بدوش کیا دے سکتا تھا۔ اکثر کو اپنی کتابیں اور کیسٹ دلکش جاپانی کاغذ میں لپیٹ کر پیش کر دیتا۔ اس کے جواب میں ایک اور پیکٹ کوئی پکڑا جاتا۔ ریڈیو جاپان والوں کے تحائف اتنے خوبصورت کاغذ میں اس نفاست سے بندھے تھے کہ ابھی تک میں نے اسے کھولنے کی ہمت

نہ کی تھی۔اوروں کو چھوڑ یئے میرے میزبان انور میاں نے بھی مجھے ایک پیکٹ تھما دیا تھا۔میری اماں جان کی یہ ''حصہ'' اور''تحفہ'' دینے کی خاصیت جاپانیوں میں بدرجۂ اتم موجود دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس بھی ہوتا گیا۔

ایک اور تہذیبی مسئلہ ''نہیں'' کا ہے۔جاپانی میں لفظ''نہیں'' غائب ہے۔اس کا استعمال عموماً نہ ہونے کے برابر ہے۔کسی بات سے انکار کرنا ہوتو جاپانی تمام وضع داریوں سے اسے ٹالتے رہیں گے مگر منہ سے ''نہیں'' بڑی مشکل سے کہہ پائیں گے۔باہر والے''عموماً'' امریکنوں کے لیے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔اکثر جاپانی کوئی بزنس کی ڈیل نہ بنانی ہوتو پوی شرافت سے اگلے کو بات گھما گھما کر اشارے اور استعارے میں سمجھاتے رہیں گے مگر برجستہ انکار نہیں کریں گے۔ امریکن جو عموماً صاف گو اور''اسٹریٹ فارورڈ'' ہوتے ہیں' مہینوں خط وکتابت میں اس امید پر لگے رہتے ہیں کہ شاید کام بن جائے۔جاپانیوں کی یہ قومی شرافت اور وضع داری اکثر گل کھلاتی ہے۔عجیب بات یہ ہے اگر بادل ناخواستہ جاپانی لفظ انکار بھی کرتے ہیں تو انگریزی لفظ''نو'' کا سہارا لیتے ہیں۔شاید واقعی جاپانی لفظ میں لفظ''نہیں'' موجود ہی نہیں۔

مجھے شدید حیرانگی کہ تھی کہ جاپانیوں کی انکار نہ کرنے کی خاص خصلت' میرے جگر خالد سہیل میں کیسے حلول کر گئی تھی جب کہ بندہ ابھی تک جاپان پہنچا نہیں تھا۔اس میں دورائے نہیں کہ سہیل کی مسکراہٹ بھی خاص عارفانہ ہے۔کہیں پچھلے جنم میں میرا یار جاپان میں تو نہیں تھا۔ یہ حسین اتفاق غور طلب معاملہ ہے ـــــ یہ قصہ پھر کبھی! مگر اس امر سے انکار نہیں کہ خالد سہیل روحانی طور پر جاپانی نکلے۔

جاپانیوں کو "Perfect" ہونے کا مالی خولیہ ہے' خواہ وہ کام ہو یا تفریح' جس میں وہ لگتے ہیں اسے اس کی معراج تک پہنچا دیتے ہیں اور کام کو عبادت سمجھ کر ایسا کرتے ہیں کہ عابد شرمائیں۔جب ہی تو ترقی یافتہ قوموں کی ریس میں جاپان سب سے آگے نکل گیا ہے۔میں نے لوگوں کو دفتروں میں رات ۹ ر بجے تک کام کرتے دیکھا ہے۔واقعی جاپانی بڑے محنت کش ہوتے ہیں مگر تمام محنت اور جدید تکنالوجی اور کمپیوٹر کے ساتھ جاپانی توہم پرست بھی خوب ہوتے ہیں۔میں نے سنا اکثر جاپانی''ڈاروما'' نام کی ایک گڑیا خرید کر کسی منت یا مراد کی خاطر اس کی ایک آنکھ میں رنگ بھرتے ہیں یا کاجل سے خوبصورت بناتے ہیں۔جب مراد برآتی ہے تو دوسری آنکھ کی آرائش پوری کی جاتی ہے۔سیاسی پارٹی والے الیکشن آفس میں ایسی گڑیا خوب سجاتے ہیں۔دکانوں میں ایک ہاتھ اٹھائے تن کر بیٹھی ہوئی بلی کی مورت بہت نظر آتی ہے۔معلوم ہوا یہ''مانے کی نیکو' ہے اور اس کی موجودگی سے کاروبار اچھا ہوتا ہے۔زیارت گاہوں میں نئے سال کی آمد پر پرانی گڑیا بدل کر نئی گڑیا خریدنے کا رواج بھی عام ہے۔یہ خوش بختی کی علامت سمجھی جاتی

ہے۔ایک لال پیپر ماشی کی گائے یا لومڑی جسے ''آ کا بیکو'' کہتے ہیں' اسے بدقسمتی دور کرنے کے لیے گھروں میں رکھا جاتا ہے۔زچہ و بچہ کی حفاظت کے لیے''اینو ہاری'' کو نامی پیپر ماشی کا کتا بھی ولادت میں آسانی کی نشانی سمجھا جاتا ہے!

جاپانی ترقی وتوہم پرستی کی بین بین روش کو دیکھ کر خیال آیا کہ ہمارے گنڈہ تعویذ کے قدردان بھی گر چاہیں تو اپنے عقیدوں کے ساتھ اتنی ہی ترقی کر سکتے ہیں۔ ہاں! تھوڑی سی وسیع القلبی ہو تو کیا کہنا! کئی جگہ شام کے جھٹپٹے میں سڑک کے کنارے کیمونو میں ملبوس کسی عورت کو''جوتش ودیا'' کے جوہر دکھاتے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جاپانی مرد وزن بڑے شوق اور سنجیدگی سے قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے بے حال رہتے ہیں۔اب کمپیوٹر کی ترقی سے قسمت کا حال بھی کمپیوٹر سے معلوم کیا جا رہا ہے۔قسمت آزمانے کے لیے جاپانیوں نے ایک کھیل ایجاد کرلیا ہے جس کا نام ہے''پچنکو''۔ سننے میں یہ مجھے کسی زود ہاضم گولی کا نام لگا۔''پچنکو پارلر'' ہر گلی میں موجود ہیں۔سنا آزاد صاحب اس کے بہت شوقین ہیں۔ مجھے اکثر شام کو پچنکو پارلر کی دعوت دے ڈالتے ہیں مگر مصروفیت ایسی تھی کہ میں قسمت آزمائی کے لیے وقت نکال نہ پاتا ۔ایک شام آزاد صاحب موڈ میں تھے۔ کہنے لگے آج چلے چلئے' موسم بھی خوش گوار ہے' صبح سے کسی بلی نے راستہ بھی نہیں کاٹا' نہ ہی کسی کو چھینک آئی ہے' میں بھی تیار ہو گیا کہ شگون تو آزاد صاحب کے سارے اچھے لگتے ہیں۔مگر''پچنکو پارلر'' دیکھ کر بڑی بوریت ہوئی۔ میں نے کہا یار یہ تو''پن بال گیم مشین'' ہے اور شمالی امریکہ میں کافی دنوں سے موجود ہے۔مگر جس اہتمام سے یہاں اسے قمار بازی کے طور پر سنجیدگی سے کھیلا جا رہا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔خیر پانچ سوین کے بال لے کر آزاد صاحب نے جوں ہی ہینڈل گھمایا کہ کھیل شروع ہو' پتہ نہیں کیسے خود انھیں ایک بے آواز چھینک آئی اور پھر بھائی جتنا مجھے اس کھیل کے فوائد بتاتے رہے اتنی ہی بازی ہارتے رہے۔ میں نے دیکھا جوش میں بندہ خرچ ہوا جا رہا ہے۔ میں نے کہا ''بس ہم اکسپرٹ ہو گئے۔اب اگلی بار کھیلیں گے۔آج قسمت آپ کو آزما رہی ہے۔مشین کے ذریعہ یہاں کچھ لوگوں کو تاش کی بازی میں رمی اور بلیک جیک پر بھی طبع آزمائی کرتے دیکھا۔ظالم پیسے کے لیے بیچارہ انسان خود سے کیا کچھ نہیں کروالیتا ہے۔ جیک پاٹ والی مشین دیکھ کر مجھے اپنا جگر سحر فتح پوری (نیویارک) بھی بہت یاد آیا۔ایک زمانے تک تاش کے پتے اس کے غلام رہے ہیں۔سنا ہے آج کل وہ ان جیک پاٹ مشینوں کا مطیع ہوتا جا رہا ہے مگر اس کی تمام مہمان نوازیاں خصوصاً اردو والوں کی خاطر داریاں''سحر کی سرائے'' میں بدستور قائم ہیں۔اس وقت مجھے اپنی ایک مختصر نظم یاد آ گئی :

ہم

کہ شطرنج کے مہروں کی طرح

وقت

سنگین بساط

اور قدرت کی یہ طرفہ چالیں

کھیل ہی کھیل میں بس کام تمام!

آزاد صاحب جب بھی گمبھیر ہوتے جذبات سے مغلوب ہو کر بنگلہ زبان یعنی اپنی مادری بھاشا بولنے لگتے۔ پچنکو پارلر کی چھینک کے بعد موصوف بنگلہ میں شروع ہو گئے۔ میں بھی ایسے نادر موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی بنگلہ کا آموختہ درست کر لیتا تھا۔ آزاد نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجا چاہتے تھے۔ ہم لوگ ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک لاؤڈ اسپیکر سے زوردار کان پھاڑ موسیقی کی آواز آئی اور آزاد صاحب کو غموں سے آزاد کر گئی۔ مجھے اپنے زمانے کے محلے کے لاؤڈ اسپیکر اور اس کے شائقین اور کرتا دھرتا بہت یاد آئے۔ ایک زمانہ تھا جب میں ان کرفرماؤں کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی رائج الوقت فلمی نغموں کا حافظ ہو چلا تھا اور ہمارے گھر اور پڑوس کے بچے ''ا-ب'' اور ''اے-بی-سی'' سے پہلے ''بندیا چمکے گی' چوڑی کھنکے گی'' جھوم جھوم کر با آواز بلند سناتے۔ تمام کوشش کے باوجود ان فلمی نغموں سے چھٹکارا اسی وقت ملا جب میں مسلسل سفر میں رہنے لگا۔ مگر پچھلے سال میں کلکتہ گیا تو اہلِ محلّہ جو اب ہمیں اپنا مہمان تصور کرتے ہیں۔ میرے استقبال کے لیے دو ہفتے تک ہالی ووڈ کے نغمے بڑے زور و شور سے بجاتے رہے۔ مائیکل جیکسن کے وہ نغمے جو میں دس برس باہر رہنے کے باوجود یاد نہ رکھ پایا تھا' دو ہفتوں میں فرفر گانے لگا۔ اب اس شور میں سر سے سر ملانا کون سی بڑی بات تھی۔ پہلی بار لاؤڈ اسپیکر مجھے اتنا برا نہ لگا۔ آزاد صاحب نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا ''آشون کچھو انٹرٹینمنٹ ہوک'' (آیئے! کچھ تفریح ہو جائے) اس سے پہلے کہ میں ان سے کہتا ''دادا! (بھیا)! اسی چیخ و پکار کی وجہ سے وطنِ عزیز سے ہاتھ دھونا پڑا تھا —— جب تک آزاد صاحب اس میوزیکل بار میں داخل ہو چکے تھے۔ اندر مدھم روشنی میں سائے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ ہمیں ہال کے بیچ میں ایک ٹیبل مل گیا۔ ہم اسٹیج کو اور لوگ ہمیں تاک رہے تھے۔ میں نے آزاد سے پوچھا یار کیا ڈراما ہے؟ انھوں نے سرگوشی میں کہا اسے ''کارااوکے'' کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا مطلب! کہنے لگے ''کارا'' یعنی ''خالی'' اور ''اوکے'' یعنی آرکسٹرا'' کا مخفف ہے۔ میں پھر بھی نہیں سمجھا۔ پھر انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ ایسے بار یا کلب میں ایک ٹیپ ڈیک میں مشہور نغموں کی اور لوک گیتوں کی بیک گراؤنڈ میوزک ہوتی ہے۔ ایک مائیکروفون تیار رہتا ہے۔ ساتھ ہی زبردست

قسم کے لاؤڈ اسپیکر رکھے ہوتے ہیں۔ تفریح کے لیے مہمان یا گاہک اپنی پسند کے نغمے اپنی آواز میں ان کی موسیقی کی مدد سے سناتے ہیں۔ ابھی ہم ''کاراوکے'' کی تفصیلات جان رہے تھے کہ ایک مجھ سے بھی گیا گزرا، دبلا پتلا جاپانی جوان اسٹیج پر نمودار ہوا اور بڑی جاں فشانی سے مائک ہاتھ میں لے کر مشہور ''فرانک سناٹرا'' کا نغمہ نیویارک ـــــ سٹی دیٹ نیور سلیپ'' لہرا کر ناک سے گانے لگا۔ اس کا زرد چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن کی رگیں پھٹی پڑتی تھیں۔ مگر وہ جب تک موسیقی ختم نہ ہوئی' گاتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کم گو اور شرمیلے جاپانی گانے کے اس قدر شوقین ہوتے ہیں۔ پتہ چلا جوان طبقہ ''مائیکل جیکسن''، ''سناٹرا''، ''مڈونا'' اور ''بوائے جارج'' کے گانے سنتا اور پسند کرتا ہے۔ جب کہ عام طور پر ''کاراوکے'' کے استعمال ''اینکا'' یعنی جاپانی لوک گیتوں کے لیے مخصوص ہے۔ کچھ کلب ایسے بھی ہیں جہاں ٹیپ کے ساتھ ساتھ اسکرین پر گانے والے کی ویڈیو بھی دکھائی جاتی ہے۔ اب چاہے گانے والا سریلا ہو یا بے سرا ان لوازمات کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔ بس ذرا لاؤڈ اسپیکر کی آواز میرے محلے کی طرح نہ ہو تو کیا کہنا صاحب اس تفریح کا۔

ہم گھنٹہ بھر مشکل سے بیٹھے ہوں گے کہ تیز موسیقی اور سگریٹ کے دھوئیں سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے آزاد صاحب سے چلنے کی گزارش کی جو ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر گنزا کی سنہری شاہ راہ پر بھٹکتے رہے۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ جاپانی ادب و ڈرامے کی کتابیں خریدنی ہیں جنھیں میں پچھلے دو ہفتوں سے ڈھونڈ رہا تھا مگر ہر گلی میں کتب فروش ہونے کے باوجود انگلش کتابیں عنقا تھیں۔ جاپانی واقعی خود کفیل ہیں۔ انھیں انگریزی بیساکھی کی ضرورت قطعی نہیں۔ ان لوگوں نے دنیا کے بیشتر ادب کا جاپانی میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ جب تک کوئی مغرب کا نقاد یا ناشر دیسی کتابوں کی تعریف نہ کر دے اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ بہت کھوج کے بعد پتہ چلا کہ گنزا میں ''مارازون'' نامی کتب فروش کے یہاں انگریزی کتابیں دستیاب ہیں۔ اس تین منزلہ دکان میں دوسری منزل صرف انگریزی کتابوں کے لیے مخصوص تھی۔ میں نے اپنی پسند کی کتابیں اور چند ویو کارڈ خریدے اور آزاد صاحب مختلف ہوش ربا پوسٹروں میں مصروف رہے۔ آخر انھیں ایک روسی ماڈل ''شاشا'' کا پوسٹر پسند آ گیا اور ہم لوگ اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔

''ہیگاشی جوجو'' اسٹیشن سے نکل کر انور کا فلیٹ کوئی دس منٹ کی دوری پر تھا۔ ابھی ہم پہلی گلی سے گزر رہے تھے کہ آزاد صاحب ایک وینڈنگ مشین کے آگے رکے۔ اس میں چند سکے ڈالے اور اپنی پسند کی سگریٹ حاصل کر لی۔ ایسی مشینیں یورپ اور امریکہ میں بھی کافی مقبول ہیں مگر جتنی ورائٹی ٹوکیو میں دیکھی اور نہ کہیں دیکھی تھی۔ اسے مقامی لوگ ''جی ڈوہام بائیکی'' کہتے ہیں۔ میں روزانہ آتے جاتے

بھانت بھانت کی ایسی مشینوں کو دیکھا کرتا تھا۔آج رک کر اس کی حرکات دیکھنا چاہتا تھا۔ پاس ہی ایک مشین نظر آئی جو دو حصوں میں بٹی تھی ۔ایک گرم مشروب، چائے،کافی، چاکلیٹ اور دوسرا کوک، اور یخ سوڈا وغیرہ کے لیے تھا۔ہم لوگ آگے بڑھے۔ میں آج اس محلے کی تمام مشینوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اگلی گلی میں ایک نیلے رنگ کی قد آدم مشین لگی تھی ۔جس کے قمقمے پلک جھپکا کر گاہک کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔اس میں ہزار ین کے نوٹ کے عوض چھ ڈبے بیئر کے یا ایک بوتل سنٹری وہسکی یا ایک بوتل فرنچ وائن دستیاب تھی۔اس پر سرخ روشنی میں جلی حرفوں میں لکھا تھا ’’صرف اٹھارہ سال سے اوپر والے کسٹمروں کے لیے‘‘ میں نے آزاد سے یہ پوچھا برادر یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ مشین کا استعمال کرنے والا بالغ بھی ہے یا نہیں۔ان سب سے پرے سب سے مضحکہ خیز مشین وہ لگی جس میں مانع حمل کی گولیاں، افزائشِ نسل کے چینی نسخے، تعلیم بالغان کے لیے کارآمد میگزین اور جنسی رہبری کے ویڈیو تک حاضر تھے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان مشینوں کی بھرمار محض تجارتی مقابلے کے لیے ہے یا یہ جاپانیوں کی برقی مشینوں سے جنون کی حد تک انسیت کا نتیجہ ہے۔یا پھر اس سخت جان قوم نے نئی نسل کی اخلاقیات کا امتحان لینے کے لیے ان کے آگے مشینوں اور سنہری مواقع کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ جو بھی ہو اس خصوصی مراعات سے سیاح خصوصاً امریکی سیاح بہت دعا دیتے ہیں اور جاپانی مشینوں کی ۲۴ گھنٹے والی خدمت سے خاصے خوش نظر آتے ہیں۔

کمرے میں پہنچے تو دیکھا میاں انور کچھ بھوجن تیار کر رہے ہیں۔ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگے ’’اچھا ہوا! آپ لوگ جلدی آ گئے۔‘‘ میں نے پوچھا خیر تو ہے؟ کہنے لگا ہاں‘ آج میں بھی جلدی آ گیا تا کہ آپ کو ’’سینتو‘‘ کی سیر کرائی جائے۔ بھائی یہ سینتو ہے کیا بلا؟ آج آزاد صاحب نے ویسے ہی بڑی باکمال چیزوں سے متعارف کرایا ہے۔اچھا! انور خوش ہو کر بولے ’’سینتو‘‘ یعنی پبلک باتھ۔بس کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے چلتے ہیں —— توبہ ہے‘ چھوڑ و یار۔ میں نے ٹالنا چاہا۔مگر انور بضد تھے کہ بڑا مزہ آئے گا۔ یار نہاتے تو ہم روز ہیں۔آج صبح بھی ماشاءاللہ غسل کیا ہے۔اب اس میں مزا کا عنصر آپ پیدا کر لیتے ہوں گے۔ میں تو صرف شاور لیتا ہوں‘ زیادہ سے زیادہ گنگنا لیتا ہوں —— بھائی یہ صرف نہانا نہیں ہے۔آپ چل کر تو دیکھیں —— ویسے بھی انور پہلے روز سے اسی پبلک باتھ کی بات کر رہا تھا۔ میں نے سوچا ایک تجربہ اور سہی! میں کپڑے تبدیل کرنے لگا تو انور نے پھر ٹوکا۔ بھائی صاحب کھانا کھالیں اور اسی کپڑے میں چلیں۔وہاں چینج کر لیں گے۔

کھانا کھا کر ہم لوگ کچھ دیر ٹی وی دیکھتے رہے۔ پھر انور میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔ایک بیگ میں دو تولیہ، صابن، کنگھا وغیرہ رکھا اور مجھ سے اٹھ جانے کو کہا۔ چلتے ہوئے آزاد نے بھی کہا‘ اچھا ہے دن بھر

کی تھکن دور ہو جائے گی۔ راستے میں انور نے بتایا کہ ہر محلے میں ''سینتو'' ہوتا ہے کیوں کہ یہاں کے کچھ گھروں میں شاور نہیں ہوتا اور یہ لوگ اس پبلک باتھ یا حمام کو روزمرہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عموماً جاپانی شام کو نہاتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں سینتو بڑی مصروف اور شام کی گپ شپ اور رسم وراہ بڑھانے کی جگہ ہوتی تھی۔ اس کا مقام وہی تھا (اور آج بھی وہی ہے) جو ہمارے گاؤں کے چوپال اور شہر کے ٹی ہاؤس کا ہوتا ہے۔ ویسے ہمارے یہاں گرم حمام کی ضرورت زیادہ تر ان شہروں میں ہوتی تھی (یا اب بھی ہے) جہاں پانی کی قلت ہے مگر ''سینتو'' صفائی سے زیادہ گپ کا اڈہ تصور کیا جاتا ہے۔

ایک پرانی وضع کے مکان کے آگے انور رک گئے۔ دروازے پر پردہ پڑا تھا' جس طرح یوپی کے مکانوں میں اب بھی پڑا ہوتا ہے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اندر سارے بے پردہ ہوں گے۔ گیٹ سے متصل کاؤنٹر پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ انور نے ۵۰۰ ر ین ادا کیے۔ ہمیں ایک لاکر کی چابی دے دی گئی۔ کپڑے بدل کر تولیہ لپیٹے جب ہم اکھاڑے میں آئے تو پیرس کی پہلی نہان والا منظر دوبارہ نظروں کے سامنے تھا۔ بامحاورہ اس حمام میں بھی سب ننگے تھے۔ ایک بات میں نے فوراً محسوس کی کہ باذوق فرنچ لوگوں کی طرح یہ لوگ بے دھڑک اور بے پرواہ غسل خانوں میں کھلے گھوم نہیں رہے تھے۔ ہر ایک نے ایک چھوٹے سے تولیے سے چھوٹا موٹا پردہ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا تمام ماڈرن ازم کے باوجود ہیں تو یہ لوگ مشرقی ــــ خیر ــــ ''سینتو'' کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہال میں لگے شاور سے اچھی طرح نہا لیا جائے' پھر ساتھ والے گرم تنور ''سوآنا'' بوتھ میں چند منٹ بیٹھ کر پسینہ پسینہ ہو جایئے پھر باہر ایک بہت بڑے ٹب میں' جس میں گرم پانی (۴۵ ر ڈگری سنٹی گریڈ) کھول رہا ہے' اتر کر بیٹھ جایئے اور پھر کیجیے دنیا بھر کی بکواس' ہوگئی فرصت۔ اس طرح ''سینتو'' کے تمام لوازمات سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ باہر نکلے تو تروتازہ ہو چکے تھے۔ انور نے بڑے اشتیاق سے پوچھا' کیوں صاحب مزہ آیا۔ میں نے آہستہ سے کہا' شہزادے جس مزے کے لیے تم نے ۵۰۰ ر ین پھونک ڈالے' اسے ہم لوگ بغیر خرچ کیے گاہے بگاہے آزماتے رہتے ہیں۔ کیا مطلب' انور نے پوچھا؟ یار تمہارا ''سینتو'' ہمارے کینیڈا میں ''ہاٹ اسپا'' کہلاتا ہے اور اتفاق سے میری بلڈنگ کے تہہ خانے میں موجود ہے۔ مگر مفت ہونے کی وجہ سے ہم لوگ روز اتنے اہتمام سے اس سے مستفید نہیں ہوتے۔ ساتھ ہی اس میں گپ شپ والی سہولت بھی نہیں۔

آج کا دن رنگا رنگ تجربات کا یادگار دن تھا۔ آج میں نے جاپانیوں کے کلچر کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا۔ آج کی نیرنگیاں مجھے عرصۂ دراز تک یاد رہیں گی۔

☆☆☆

فیئر ویل ڈنر

''سایونارا''

۲۰ ؍مارچ کی پُر بہار اور مصروف ترین صبح ہے۔ آج ٹوکیو میں میرے قیام کا آخری دن ہے۔ کل صبح مجھے ٹوکیو کے دوستوں کو ''سایونارا'' یعنی الوداع کہنا ہے۔ اتنا گھومنے، سیکھنے اور سمجھنے کے باوجود بہت کچھ دیکھنا اور بے شمار چیزیں سیکھنا اور سمجھنا باقی تھیں۔ صبح سے میں ٹیلی فون میں الجھا دوستوں کو اپنی روانگی کی خبر دے رہا تھا —— اتفاق سے آج سارے پروگرام بھی ایک ساتھ آن پڑے تھے۔ آج بہت سے دوستوں نے دعوت پر بلا رکھا تھا۔ ٹریسی کا فون کئی بار آ چکا تھا۔ اس نے مجھے فارن اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی ''پارٹی آف دی ورلڈ'' میں آج شام مدعو کر رکھا تھا جہاں وہ مجھے نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے ملوانا چاہتی تھی۔ ''مینوری دائی'' نے بھی آج ہی شام کسی ''فارنر ہائیکو کمپٹیشن'' میں میرا نام دیا ہوا تھا۔ آزاد صاحب مشہور زمانہ استاد امجد علی خان کے سرود کانسرٹ کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ انور نے بھی میری نوٹنکی والی رگ کو پھڑکانے کے لیے کسی ''پینٹو مائم'' کا شو سوچ رکھا تھا۔ مجھے تھوڑی شاپنگ بھی کرنی تھی، کیوں کہ لکھ پتی والے ٹائٹل سے آج ہم سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ ان سب سے پرے حضرت ''اسادا یوتاکا'' نے آج شام اپنے گھر پر فیئر ویل ڈنر کے لیے مدعو کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا فون کر کے پتہ کریں شاید وہ ڈنر کا بھول گئے ہوں، کیوں کہ پچھلے کئی دنوں سے میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ فون کی گھنٹی پر کسی محترمہ نے فون ریسیو کیا۔ میں نے انگلش میں اپنا نام بتایا اور پوچھا کیا اساؔدا صاحب گھر پر ہیں؟ محترمہ فوراً سلیس اردو میں گویا ہوئیں۔ میں مسز اسادا بول رہی ہوں، وہ تو گھر پر نہیں ہیں مگر دانش صاحب آج کا ڈنر تو آپ کو یاد ہے۔ میں نے کہا یاد ہے حضور۔ میں نے بس آپ کو یاد دلانے کے لیے ہی فون کیا تھا۔ پھر شام ملنے کا وعدہ کر کے میں نے فون رکھ دیا —— اب میں شش و پنج میں تھا کہ آج کیا کیا اور کس طرح کیا جائے۔ پھر ایک ایک کو فون کر کے معذرت کرنا چاہی کیوں کہ ''اسادا'' صاحب کے پُر خلوص ڈنر کو ٹالنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ ویسے بھی جاپانی عموماً بہت روایتی ہوتے ہیں۔ ساری وضع داریاں دفتر تک یا پھر ریستوران تک رہتی ہیں۔ گر کسی نے گھر بلا لیا تو سمجھ لیجیے آپ بڑے وی آئی پی ٹھہرے اور اگلا دل و جان سے آپ پر نثار ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اساؔدا صاحب کی فیملی کے ساتھ شام گزاری جائے۔

سب سے پہلے میں نے ''تھائی ایرویز'' کو فون کر کے اپنا ٹکٹ ری کنفرم کرایا پھر سوزوکی صاحب کا

نمبر ملایا۔ پتہ چلا موصوف دو روز کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ جانے سے پہلے ان سے ملاقات نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔ پھر رئیس بھائی کو فون کیا' وہ بھی شام آخری بار ملنا چاہتے تھے۔ ان سے بھی معذرت چاہی —— ان سے فون پر ہی خوب باتیں ہوئیں' خطوط کا وعدہ ہوا۔ انھیں ٹورانٹو آنے کی دعوتِ خاص دی اور پھر اجازت طلب کی۔ رئیس بھائی کی یادیں اس سفر کا بہترین اثاثہ تھیں۔ ان کی محبت' خلوص اور مہمان نوازی تاعمر یادر ہے گی۔ غرض سارا دن کمرے میں بیٹھا فون کے ذریعہ معاملات نپٹاتا رہا۔

وقت سبک رفتاری کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ سہ پہر چار بجے' میں کچھ شاپنگ کے لیے نکلا۔ ''ہیگاشی جوجو'' کے علاقے میں ہی ایک بڑا اسُپر مارکٹ تھا۔ اس کے باہر ہی ایک '' آرٹ کارنر'' اسٹور تھا جس میں ہر وضع کی مصوری کے نمونے لگے تھے۔ میں شاپنگ بھول کر اس میوزیم نما اسٹور میں گھس گیا۔ ''فیوجی یاما'' کے مختلف موڈ اور اشکال کی مصوری آویزاں تھی۔ ایک اور طرح کے عکس وہاں نمایاں تھے۔ پتہ چلا یہ ''یوکی اوئے'' کی مصوری ہے جو سترہویں صدی میں شروع ہوئی تھی۔ اسے ''ووڈ بلاک پرنٹ'' بھی کہتے ہی جو لکڑی کے بلاک سے تہہ در تہہ آبی رنگ جما کر بنائی جاتی ہے۔ مجھے یاد آیا ہمارے یہاں رنگ ریز اسی طرح کی چھپائی سے دوپٹوں اور ساریوں پر بیل بوٹے بناتے ہیں کیوں کہ اس سے کوئی تخلیقی کام نہیں لیا جاتا۔ شاید اسی لیے اسے آرٹ فارم تصور نہیں کیا گیا مگر پچھلی دہائی سے اس سے ملتی جلتی ''باٹک پرنٹ'' ان دنوں ہمارے یہاں آرائش کے لیے بھی استعمال میں ہے اور اسے ایک طرح کا آرٹ فارم بھی تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اس اسٹور میں زیادہ تر معروف مصوروں کے شاہ کار کی نقل موجود تھی۔ مشہور جاپانی آرٹسٹ ''ہوکوسائی'' نے ''فیوجی یاما'' کے چھتیس رنگ کو پیش کیا تھا جو ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اسی دور کے ایک اور مصور ''اوتامارو'' نے صرف خوب صورت عورتوں کو اپنے عکس کا موضوع بنایا ہوا تھا۔ مگر جن دوشیزاؤں کو موصوف خوبصورت تسلیم کر رہے تھے وہ بھی دیدنی تھیں۔ ایک طرف آبی رنگوں والی ''واش تکنیک'' کی مصوری کے کچھ بہت ہی ستھرے نمونے رکھے تھے۔ جاپانی شاعری اور مصوری خاص طور پر ''امپریشنسٹ'' تھی اور آج بھی ہے۔ لطیف اور مدھم رنگوں سے نازک کاریگری جاپانیوں کو خوب آتی ہے۔ جاپانی مصور مناظرِ فطرت کا عاشق ہے۔ یہاں کی مصوری نے انیسویں صدی کے آخر میں یورپ میں ''امپریشنسٹ مصوری'' کی پوری تحریک کو آگے بڑھایا اور ان کو تاثرات کی ایک نئی دنیا دریافت کر کے دی تھی۔ اس مصوری نے بنگال کے مصوروں کو بھی متاثر کیا —— ربندر ناتھ ٹیگور اور نندن لال بوس وغیرہ نے آبی رنگوں کی ''واش تکنیک'' کو بنگالی اسکول میں رائج کیا۔ عبدالرحمٰن چغتائی بھی اس دور کے بنگال اسکول کے ہونہار شاگرد تھے۔ انھوں نے ''واش تکنیک'' کو مغل پس منظر میں نیا رخ عطا کیا جسے چغتائی آرٹ بھی

کہتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے سال (جولائی ۱۹۸۸ء) میں ٹورانٹو میں میرے دوست اشفاق حسین کے ''رائٹرز فورم'' اور عابد جعفری کے ''میڈیا کیمپ'' کے تعاون سے ایک یادگار ''اقبال صدی'' منائی گئی تھی جس میں سیمینار، فلم، کتابوں کی نمائش اور عالمی مشاعرے کے ساتھ ایک شامِ اقبالؔ کے کلام پر مصوری کی نمائش بھی ہوئی تھی۔ کراچی سے دلاور مرزا (جو چغتائی اسکول کے آخری شاگرد کہے جاتے ہیں) اپنے ''واش تکنیک'' والے بہترین عکس لے کر آئے تھے۔ اسے نہ صرف بہت سراہا گیا بلکہ بیشتر عکس ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ میں یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا کہ دکاندار کے کھنکارنے پر چونکا۔ موصوف مجھے تاک رہے تھے کہ یار دھندے کی بات کرو، تعریفیں تو سب کرتے ہیں۔ میں نے خود کو آرٹ کا قدردان سمجھتے ہوئے ایک جاپانی حسن کا آبی رنگ والا عکس خرید ہی لیا۔ قیمت صرف ۴۰۰۰ ین ادا کر کے باہر نکلا تو پانچ بجا چاہتے تھے۔ مجھے ۶ بجے اسادا صاحب سے ''اوجی'' اسٹیشن کے باہر ملنا تھا۔ شاپنگ کا وقت نکل چکا تھا مگر مجھے کوئی تحفہ اپنے میزبان کے بچوں کے لیے پسند بھی کرنا تھا۔

میں سپر مارکٹ میں کوئی مناسب تحفہ تلاش کر رہا تھا کہ ایک اسٹیشنری کی دکان نظر آئی۔ میں اس میں داخل ہوا۔ جاپان جہاں اپنی گاڑیوں، گھڑیوں اور کھلونوں کے لیے مشہور ہے، وہیں بہترین کاغذ اور کاغذی اشیاء کے لیے دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں کاغذی گڑیاں، پنکھے، پرندے اور کشتیاں قابلِ دید تھیں۔ کچھ پیپر ماشی کے لیمپ، پھول دان، قلم دان، ڈبیہ وغیرہ بھی بھری پڑی تھیں مگر بچوں کے مطلب کی چیز نظر نہ آئی۔ مجھے جاپانی کاغذ کے لفافے اور لیٹر پیڈ بہت بھاتے ہیں۔ بہت ساری ورائٹی کی اپنی پسند کی چیزیں لے کر غالبؔ کے مصرعہ ''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا'' پر سر دھنتے دکان سے باہر آئے۔ میرے پاس صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ وقت کی تنگی کے باعث مناسب تحفے کا خیال چھوڑ کر میں ایک مٹھائی کی دکان میں داخل ہوا۔ بچوں کے لیے لڈو نما مٹھائی کا ڈبہ خریدا۔ پتہ نہیں مٹھائی کیسی تھی۔ مگر ڈبے اور پیکنگ پر دل نثار ہو گیا۔ جاپانی مٹھائی کو ''واگاشی'' کہتے ہیں جو عموماً چاول یا گیہوں کے آٹے' چینا گھاس (اگر اگر) اور شکر سے تیار کی جاتی ہے۔ ہر موسم اور تہوار کی ایک الگ طرح کی مٹھائی ہوتی ہے۔ کچھ ہماری طرح جیسے عید پر سوئیاں، میلاد میں بالوشاہی اور ہر موسم میں لڈو۔ میں جاپانی لڈو لے کر تقریباً بھاگتا ہوا اسٹیشن پہنچا اور ''اوجی'' کے لیے ٹرین پر سوار ہوا۔

اسٹیشن کے باہر حضرت ''اسادا یوتاکا'' اپنی پروفیسرانہ شخصیت اور قلندرانہ جیکٹ میں میرے منتظر تھے۔ بڑی گرم جوشی سے ہم نے ایک دوسرے کو آداب کیا اور ان کی کار سے جناب کے دولت کدے کی طرف روانہ ہوئے۔ کار میں بیٹھتے ہی میں نے پوچھا کہ سنا ہے یہاں عام طور پر لوگ گاڑیاں نہیں رکھ سکتے۔ اس کی

کیا وجہ ہے حالاں کہ جاپانی گاڑیاں ساری دنیا میں دندناتی پھر رہی ہیں۔ اسادا صاحب نے بتایا کہ کار خریدنے سے پہلے ہر کسی کو یہ ثبوت مہیا کرنا پڑتا ہے کہ اس کے پاس گاڑی پارک کرنے کا معقول انتظام ہے۔ ٹوکیو کی آبادی اور جگہ کی تنگی کے باعث ہر کوئی چاہتے ہوئے بھی گاڑی خرید نہیں پاتا ہے۔ مگر ریل سروس اتنی عمدہ ہے کہ عام شہری کو آمد و رفت کا مسئلہ بھی نہیں ہے ـــــ اسادا صاحب کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ میں پچھلے دو روز سے ''ہکونے'' میں جاپانی تہذیب و ثقافت سے سرشار ہو رہا تھا۔ اس دوران اسادا صاحب بھی اپنی فیملی کے ہمراہ ''ہکونے'' ہی میں موجود تھے۔ کاش ہم لوگ ساتھ ہوتے۔ انھیں اس بات کا قلق تھا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ اسادا صاحب ساتھ ہوتے تو وضع داریاں آڑے آتیں اور میں جاپانی سرائے والے تجربے سے محروم رہ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ان کا فلیٹ آ گیا۔ پتہ چلا یہ یونیورسٹی پروفیسرز کوارٹرز ہیں۔

دروازے کی گھنٹی پر ایک نازک سی صبیح خاتون نے دروازہ کھولا اور بڑی شائستگی سے آداب کیا۔ میں جواب میں جاپانی کورنش بجالایا۔ اسادا صاحب نے بڑھ کر بچوں کو بلایا۔ دو شرمیلے بھولے بھالے بچے سامنے آئے اور (باپ کے اشارے پر) السلام علیکم کہا۔ میں نے بھی زور سے وعلیکم السلام کہتے ہوئے جاپانی لڈو والا ڈبہ ان کے آگے کر دیا۔ انھوں نے شرماتے ہوئے تحفہ قبول کیا۔ اس پر ان کی والدہ نے جاپانی میں کچھ یاد دلایا۔ بچوں نے ایک ساتھ ''شکریہ'' کہا۔ ان کی اردو سن کر میں بہت خوش ہوا اور انھیں پیار کیے بغیر رہ نہ سکا۔ اس سے پہلے کہ دونوں اپنے کمروں کو بھاگ جاتے میں نے اپنا کیمرہ نکال کر جاپان کے دو سب سے کم عمر اردو دانوں کی تصویر کھینچ لی۔ جب ہم بچوں سے فارغ ہوئے تو بیگم اسادا نے سلیس اردو میں خیریت پوچھی اور چائے یا ٹھنڈے کا دریافت کیا۔ میں نے چائے کی گزارش کی مگر ساتھ ہی یہ یاد بھی دلایا کہ دیسی چائے، محترمہ جاپانی چائے سے ہمیں معاف رکھیں۔

میں نے اسادا صاحب کی قرینے سے سجی کتابوں کو دیکھتے ہوئے ان سے پوچھا، حضرت وہ آپ کے نوبل انعام یافتہ ناول ''سنو کنٹری'' کا مصنف کون تھا۔ انھوں نے بتایا ''کاوا باتا''۔ میں نے امریکہ میں اس ناول کا بڑا نام سنا تھا مگر پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جاپانی کلاسیکل شاعری سے تو ہمیں کچھ واقفیت تھی مگر کلاسیکی نثر سے ہم بے بہرہ تھے۔ آپ کے یہاں ایسا کوئی ناول ہے جسے کلاسک کا درجہ دیا جاتا ہو۔ میں نے مزید پوچھا؟ جی ہاں ـــــ کوئی ۱۰۰۰ء کے قریب ''فیوجی دارا'' خاندان کی ایک خاتون جن کا نام ''مراسا کی تیکی بوُ'' تھا، انھوں نے ایک عشقیہ ناول ـــــ ''گنجی مونو گا تاری (گنجی کی سرگزشت) تصنیف کیا۔ یہ اس دور کا سب سے بڑا شاہکار تصور کیا جاتا ہے جو چار ہزار صفحات پر مشتمل

ہے۔اس ناول کو جاپانی ادب کا کلاسک کہا جاتا ہے۔بیگم اسآدا نے ہماری توجہ چائے کی طرف کرائی جو وہ بے چاری تھوڑی دیر پہلے ہمارے سامنے رکھی گئی تھیں ۔ میں نے ''دوموآری گاتو گزائی ماس'' کہتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھالی۔میں نے جاپانی ادب کو پرے رکھ کر بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا جو کچن میں ڈنر کے اہتمام میں مصروف تھیں ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اسآدا صاحب کی طرح آپ بھی کچی مچھلی کھلانے کے موڈ میں تو نہیں ہیں' کیوں کہ میں بڑا بدذوق واقع ہوا ہوں۔کمرے میں ایک ہنسی کا طوفان ابل پڑا۔بیگم اسادا نے کہا آپ تسلی رکھیں ۔ مجھے معلوم ہے آپ کی پسند کیا ہے اور میں وہی تیار کر رہی ہوں۔اسادا نے تو خواہ مخواہ آپ پر طبع آزمائی کر دی تھی۔اسادا صاحب نے ہنستے ہوئے کہا بھئی ادیب لوگ ہیں' تجربہ بیکار کب جاتا ہے۔پھر جناب نے بیگم اختر کا کیسٹ لگا دیا :

آپ کہتے تھے کہ رونے سے نہ بدلیں گے نصیب

عمر بھر آپ کی اس بات نے رونے نہ دیا !

ایک عرصے کے بعد سدرشن فاکر کی غزل سنی تھی اور جاپان میں اختری بائی فیض آبادی کی آواز کچھ زیادہ ہی اچھی لگی ۔ان لوگوں کے پاس غزلوں کا خاصہ ذخیرہ تھا۔جوان کے ذوق کے غمازی کر رہا تھا۔مجھے ٹیپ اور ریڈیو میں الجھا دیکھ کر اسادا صاحب نے کہا بھئی آپ عرصہ دراز تک نیویارک ٹی وی سے وابستہ رہے ہیں' شاید میرے پسند کی ایک فلم ''مرزا غالب'' آپ کے پاس ہو۔حضور آپ نے یہ کس طرح اندازہ کر لیا کہ ہم نیویارک ٹی وی پر ''مرزا غالب'' کی نمائش کرتے تھے۔اسادا صاحب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے کہ آپ ریڈیو، ٹی وی سے منسلک رہے ہیں' ڈرامے سے تعلق ہے آپ کا۔ایسی کلاسیکل فلم ضرور ہو گی آپ کے پاس۔میں نے دوبارہ ہنستے ہوئے کہا ''حضور سو سال بعد آپ کو غالب کی یاد ستائی ہے۔اس پر ہم سب ہنس پڑے۔انھوں نے پھر صفائی پیش کی کہ میں تو غالب کا طرف دار ہوں۔ فلم بھی میری دیکھی ہوئی ہے' بیگم کو دکھانا چاہتا تھا۔میں نے کہا اسادا صاحب آپ تو صفائیاں پیش کرنے لگے' میں یوں ہی مذاق کر رہا تھا حضرت۔اسادا صاحب نے کہا مگر میں مذاق نہیں کر رہا' مجھے واقعی اس فلم کی تلاش ہے۔خیر یہ بھی اتفاق ہے کہ اس فلم کا ویڈیو میرے پاس ہے' مگر شمالی امریکہ کے دوستوں نے اب تک کوئی سو کاپیاں بنالی ہوں گی۔آپ کو میں ایک سو ایک والی کاپی بصد تکریم روانہ کروں کر دوں گا' وعدہ رہا! مگر فلم اتنی گھس چکی ہے کہ غالب ذوق لگیں گے اور ذوق بہادر شاہ ظفر تو شکایت نہ کیجیے گا۔

بات پھر اردو ادب اور ادیبوں کی شروع ہوئی۔ پتہ چلا سب سے پہلے انشاء جی جاپان آئے تھے۔ پھر مسعود مفتی نے حاضری دی۔اس کے بعد مجتبیٰ حسین تشریف لائے اور اس سال میں حاضر ہوا تھا۔بیگم

اسادا نے کچن سے آواز لگائی کہ ''آپ پہلے ہیں جو ہمارے اس گھر پر تشریف لائے ہیں۔'' میں نے کہا زہے نصیب کہ آپ لوگوں نے عزت افزائی کی۔ خاکسار ممنون و مشکور ہے اور تاعمر رہے گا۔ اسادا صاحب نے بتایا کہ جب مجتبیٰ صاحب آئے تھے، وہ لوگ ''اوساکا'' میں رہتے تھے اور وقت کی تنگی کے سبب ان سے بھرپور ملاقاتیں نہ ہوسکیں۔ بیگم صاحبہ نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے، آپ لوگ بھی تیار ہو جائیں — کچھ ہی دیر میں میز پر ''ٹمپورا'' پکوان کے بہترین نمونے چن دیے گئے۔ تلے ہوئے سوختہ جھینگے، مچھلی کے قتلے، آلو اور بینگن کے قتلے، پیاز کے لچھے، تلی ہوئی گوبھی، شکرقند، غرض بہت کچھ! بچوں کو بلا کر ہم لوگوں نے کھانا شروع کیا۔ بیگم صاحبہ گرم گرم تلی ہوئی نعمتیں حاضر کر رہی تھیں اور ہم کھا رہے تھے۔ میں نے احتجاج کیا کہ صاحب آپ کے بغیر ہم نہیں کھاتے، مگر محترمہ خالص مشرقی بیگم تھیں۔ شوہر اور اس کے مہمان کی خاطر داریوں میں مگن تھیں۔ میں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا کہ جب تک آپ ساتھ نہ دیں گی، ہم نہیں کھائیں گے۔ آخر انھوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ اس لذیذ پکوان سے ہم جی بھر کے شکم سیر ہوئے۔ مجھے حیرت تھی کہ پیرس میں فرانسیسی زبان و ادب کی طالبہ رہنے کے باوجود بیگم اسآدا کس قدر وضع دار خاتون تھیں۔ اردو انھوں نے کراچی میں اپنے قیام کے دوران سیکھی تھی اور خوب سیکھی تھی۔ کھانے کے دوران اسآدا صاحب کراچی یونیورسٹی کی باتیں کرتے رہے۔ معلوم ہوا جناب ابوالخیر کشفی ان کے استاد تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سوزوکی صاحب حضرت ''سوگا مو'' کے شاگرد رہے ہیں۔ ''سوگا مو'' کو جاپان کا بابائے اردو کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان و ادب کے لیے وقف کر دی تھی۔

ڈنر کے بعد بیگم اسادا نے کافی کا پوچھا اور دوبارہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ میں نے بیگم صاحبہ کو سناتے ہوئے اسادا صاحب کو بتایا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ خالص مشرقی بیگم کے طفیل مہمان نوازیوں میں مست ہیں! شمالی امریکہ کی بیگمات اتنی وضع داری روا نہیں رکھتیں۔ پھر شوہروں کو برتن دھونا پڑتا ہے اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی ہے۔ بیگم اسادا نے ہنستے ہوئے اپنے شوہرِ نامدار کی طرف داری کرتے ہوئے کہا — یہ اتنے برے بھی نہیں ہیں۔ مجھے ''اسادا یوتاکا'' کا چھوٹا سا خوش حال اور وضع دار کنبہ بڑا اچھا لگا۔ اردو کے پل سے گزر کر یہ لوگ میرے دل میں گھر کر چکے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ ان کی رہائش خالص جاپانی نہ تھی۔ اس میں کچھ دہلی کی بوباس اور تھوڑی فرنچ نفاست موجود تھی۔ مختلف تہذیبیں صحیح معنوں میں ایک دوسرے میں مدغم ہوں تو زندگی مثالی بن سکتی ہے۔

بیگم اسادا کافی کے ساتھ کچھ چاکلیٹ نما میٹھا بھی لے آئیں، پھر بڑی دیر تک انڈیا، پاکستان اور شمالی امریکہ کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی، رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔ باتوں باتوں میں

وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میں نے اجازت چاہی کیوں کہ مجھے روانگی کی پیکنگ بھی کرنی تھی۔ اساداصاحب چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اٹھنے سے پہلے میں نے دوبارہ کیمرہ نکالا اور کچھ یادگار تصویریں اتاری گئیں۔ میں نے بیگم اسادا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔ اساداصاحب نے کہا چلئے میں آپ کو چھوڑے دیتا ہوں۔ کچھ دیر اور آپ کے ساتھ بات ہو جائے گی۔ اساداصاحب نے ہمیں انور کے مکان پر چھوڑا، میں نے کہا، حضور! جلد ہی آپ کو مرزا غالب کی وِڈیو روانہ کر دوں گا اور کوشش کروں گا کہ چند جاپانی ''نوہ'' ڈراموں کا ترجمہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ انھوں نے مجھے شب بخیر اور میں نے ''سایونارا'' کہا ـــــ میں نہ صرف ایک مخلص دوست بلکہ ایک نفیس انسان سے رخصت ہو رہا تھا۔

انور میاں اپنے کچھ پاکستانی دوستوں کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ وہ لوگ مجھ سے مل کر خوش ہوئے اور انور کو برا بھلا کہا کہ پہلے کیوں نہیں ملوایا ـــــ انور نے جان چھڑاتے ہوئے کہا کہ ان کو فرصت ہو تب نا کسی سے ملوایا جائے۔ پتہ چلا انور صاحب نے مشاعرے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ ایک تو میں تھکا ہوا تھا پھر رات کے بارہ بج رہے تھے، مجھے پیکنگ بھی کرنا تھی۔ مگر لڑکوں کے اصرار پر چند نظمیں سنا کر میں نے گلو خلاصی کی۔ اس دوران چائے کا دور چلا اور پھر میں نے معذرت چاہی۔ سارے کمرے میں بکھری کتابیں، تحائف اور سامان کو یکجا کیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا!

گھڑیال نے بارہ کا اعلان کیا۔ میں شب بخیر کہتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، پھر دوسرے کمرے سے انور کی آواز آئی ''بھائی آپ کا فون ہے۔'' میں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف کسی ''جانی'' نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک صحافی ہے اور ٹریسی میک لین سے میرا نمبر ملا تھا اور وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے ـــــ میں نے کہا بھئی آج تو کافی دیر ہو چکی ہے اور کل صبح گیارہ بجے میں واپس جا رہا ہوں ـــــ سر، صبح کچھ دیر بات ہو جائے تو...... میں نے بیچ میں بات کاٹتے ہوئے پوچھا، برادر، معاملہ کیا ہے، ذرا کھل کر بتاؤ۔ اس نے کہا آپ ادیب ہیں۔ سنا جاپان پر کچھ لکھ رہے ہیں اس لیے آپ کو کچھ باتیں بتانا تھیں اور کچھ آپ کے تاثرات معلوم کرنا تھے۔ میں نے کہا میرے عزیز! سیاست میرا موضوع نہیں اور یہاں کے اندرونی مسائل......اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا مگر انسانیت تو آپ کا موضوع ہوگا۔ میں نے کہا اس کا احترام تو بہر حال میرے دل میں ہے۔ مگر کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں اردو میں لکھتا ہوں، انگلش میں نہیں ـــــ اس نے کہا ہمارا کام بس لوگوں تک بات پہنچا دینا ہے، میڈیا کوئی سا ہو! میں شش و پنج میں تھا کہ پتہ نہیں بندہ کیسی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ میری خاموشی سن کر اس نے کہا سر! صبح آٹھ بجے میں آپ سے ملنے آتا ہوں مگر آپ تنہا ہوں تو بہتر ہوگا اور ہاں! اس بے وقت فون کے لیے

معذرت خواہ ہوں۔ میں انکار نہ کر سکا۔فون رکھ کر دوسرے کمرے میں آیا اور انور سے صبح کا پروگرام پوچھا ۔انور نے کہا صبح ایک کلاس ہے مگر دس بجے تک آجاؤں گا۔ پھر گیارہ بجے کے قریب ایئر پورٹ کے لیے نکلیں گے! کیوں خیر ہے؟ صبح میرے کچھ دوست ملنے آئیں گے۔ یہ کہتے ہوئے میں اپنے بستر پر آ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور اور ذہن خلا میں بھٹک رہا تھا ـــــ تو بھولی بھالی ٹریسی میک لین پڑھائی کے علاوہ کسی تحریک سے بھی وابستہ ہے!

صبح انور نے اسکول جاتے ہوئے مجھے اٹھایا۔کوئی ساڑھے سات بج رہے تھے۔ میں ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہو رہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی، میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا ایک پستہ قد جاپانی لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''گڈ مارننگ'' کہہ کر وہ تعظیماً جھکا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا میں جانی ہوں۔ میں نے جھک کر اپنا تعارف کرایا اور اسے اندر آنے کو کہا۔ وہ شکریہ کہتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا۔ میں نے چائے پہلے سے بنا رکھی تھی۔ دو کپ بنا کر میز پر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ مجھے اتنا اندازہ ہو چکا تھا کہ لڑکے کا اصلی نام کچھ اور ہے مگر میں نے مزید پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔اس نے بات شروع کی ۔''کل شام کی پارٹی میں ہم لوگوں نے آپ کو بہت مس کیا۔ میں نے اپنی مصروفیت کا سبب بتایا اور ساتھ ہی معذرت چاہی۔اس نے کہا ہماری انجمن ''پارٹی آف دی ورلڈ'' امن پسند لوگوں سے رابطہ رکھتی ہے۔ جب ٹریسی نے بتایا کہ کینیڈا سے ایک جوان ادیب یہاں آئے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں نے آپ سے ملاقات کرنا چاہی۔ خیر اب جو وقت ہاتھ میں ہے، یہی بہت ہے! اس نے بیگ سے کسی اخبار کا تراشہ نکالا اور مجھے بڑھایا ـــــ اس میں لکھا تھا ''شہنشاہ ہیرو ہیٹو کی وفات سے بہت پہلے چند عیسائی پادریوں اور تقریباً سو ترقی پسند افراد نے ایک خط ولی عہد' آ کی ہیٹو' کے نام روانہ کیا جس میں اگست ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگِ عظیم کی شکست اور ہیروشیما و ناگاساکی کی تباہی کا ذمہ دار شہنشاہ کو ٹھہرایا تھا۔ پھر جنگ سے پہلے شہنشاہ کے نام اور اشارے پر جاپان نے کوریا اور تائیوان پر حکومت کی تھی اور تقریباً پورے ایشیا میں دہشت انگیزی پھیلا رکھی تھی۔ ایسے حالات میں مناسب ہوگا کہ شہنشاہ اپنے عوام بلکہ ساری دنیا کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرلے۔'' اس خط کا جواب خاموشی سے دیا گیا۔ ہاں ـــــ خفیہ پولس اور جاسوس حرکت میں آ گئے۔ساتھ ہی محل کا حفاظتی دستہ زیادہ مضبوط کر دیا گیا۔ میں نے پوچھا عام جاپانیوں کا اس میں کیا ردِ عمل ہے؟ عام لوگوں کے ذہن میں تو بھر دیا گیا ہے کہ شہنشاہ ''زندہ خدا'' ہے۔ پھر پرانے رسوم اور عقیدوں کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ عام آدمی شاہی تخت پر کیچڑ اچھالنا گناہ سمجھتا ہے۔انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ شاہی فرمان کے اعتراض پر فوراً پبلک سیکوریٹی پولس والے رات گئے ان کے یہاں حاضری

دینے لگیں گے۔ گو کہ شاہی تخت پر نکتہ چینی کرنے والے ''نہیں'' کے برابر ہیں' اس لیے نہیں کہ شہنشاہ بے گناہ تھا بلکہ اس لیے کہ عوام کی نفسیات میں تابع داری رچ بس گئی ہے۔ آج دوسری جنگ عظیم کے ۴۴ر سال اور شہنشاہ کی وفات کے بعد کچھ لوگ شاہی تخت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیرو ہیٹو کی وفات پر مسیحی جاپانیوں کی ایک بڑی جماعت نے شہنشاہ کو جنگ کی تباہ کاریوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کسی طرح کے ''سوگ'' میں حصہ نہ لیا۔ ان کا ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی دیا تھا۔ میں نے پوچھا کسی مخصوص طبقے کی نکتہ چینی کے علاوہ کسی سیاسی لیڈر نے ایسا کوئی بیان دیا؟ اس نے بتایا ''لیبرل ڈیموکریٹک پارٹی'' کے سکریٹری جنرل ''سنٹا روابے'' کا کہنا ہے کہ شہنشاہ بے قصور ہے۔ وہ حالات کے آگے مجبور تھا اور فوج کی تباہ کاریوں کو روکنے سے قاصر تھا۔'' حالاں کہ شہنشاہ سپریم ملٹری کمانڈر بھی تھا ـــــ ہاں! ناگاساکی کے میئر ''ہیٹوشی موٹوجی ما'' نے شہنشاہ کی وفات سے پہلے ہی ایک بیان دیا تھا کہ ''میرے خیال میں جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری ''ہیرو ہیٹو'' پر جاتی ہے۔'' اس بیان پر بڑی چیخ پکار ہوئی ـــــ سینکڑوں رائٹ ونگ والے میئر کے آفس کے سامنے لاؤڈ اسپیکر پر ''غدار اور جہنم رسید'' کے نعرے بلند کرتے رہے۔ یہی نہیں میئر اور اس کے خاندان والوں کو جان سے مارنے کی دھمکی دی گئیں۔ یہ شور شرابہ اس لیے زیادہ تھا کہ ''ناگاساکی'' کو عالمی امن کا نشان بنا کر ساری دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے! میں نے محسوس کیا کہ جانی تمام باتیں بڑے صبر وتحمل سے بتا رہا تھا۔ نہ اس میں غصہ تھا اور نہ ہی کسی قسم کا جوش۔ میرے خیال میں یہ ایک کہنہ مشق کارکن کی نشانی اور پہلی شرط ہے! میں نے بتایا کہ بیشتر لوگوں سے جب میں نے ہیروشیما یا ناگاساکی کے متعلق بات کرنا چاہی تو لوگ کترا گئے۔ کچھ نے گول مول سا جواب دیا ـــــ ایسا کیوں ہے؟ اس نے بتایا کہ ہمارے بزرگوں کو اپنی شکست کا احساس ہے اس لیے وہ اس موضوع پر بات کر کے شرمندہ ہونا نہیں چاہتے۔ میں نے کہا مگر اس خاموشی سے تو اس دور کی پوری نسل نفسیاتی طور پر متاثر بھی ہوئی ہوگی ـــــ ہاں! خاموش رہنے میں یہ مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں' مگر اب لوگوں نے اس کے متعلق اپنے غم وغصے کا اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ ''ہیرو ہیٹو'' کی وفات پر تین ماہ کے قومی سوگ اور اس کے کارناموں کو سنہری حرفوں میں لکھنے والوں پر بھی نکتہ چینی ہوئی ہے اور جاپان کی تاریخ میں پہلی بار شہنشاہیت کے خلاف دبی دبی آوازیں ابھرنا شروع ہوگئیں۔ ایسے افراد ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے۔ نئے شہنشاہ '' آ کی ہیٹو'' کی تاج پوشی پر بھی جوان طلباء کے ایک گروپ نے احتجاج کیا تھا کہ یہ اقرباء پروری اور موروثی حکومت اب نہیں چلے گی! مگر اب بھی جاپانی عوام تذبذب میں ہیں' کیوں کہ ۵۲ر فی صد شاہی تخت کے خلاف ہیں تو ۵۲ر فیصد اپنے ''زندہ خدا'' پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ بقیہ نے کہا''

انھیں نہیں معلوم کیا کہنا اور کرنا چاہئے ـــــ پارلیمانی ممبر ''کیوشی موری'' نے ایک مقامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ـــــ ''کمیونسٹ اور چند عیسائی شاہی تخت کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں' یہ سب قوم کے غدار ہیں ـــــ مجھے یقین ہے کہ ہمارے نئے شہنشاہ اپنے باپ کی طرح ایک ''زندہ خدا'' کے طور پر قوم کی رہنمائی کریں گے ـــــ اب اس طرح کی ذہنیت کو آپ کیا کہیں گے؟ میں نے کہا پہلے تمھیں اپنے دوست خالد سہیل کی ایک مختصر نظم ''کلونیل ازم'' کا ترجمہ سناتا ہوں :

ہم نے اپنے آقاؤں سے
نفرت کی ہے
لیکن ان کے نقشِ قدم پر
سر بھی جھکایا
ان کے منہ پر تھوکا لیکن
طرزِ عمل کو دل سے لگایا
ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں

اسے نظم نہ صرف پسند آئی بلکہ اس نے ترجمہ نوٹ بھی کرلیا۔

جانی بڑی سنجیدگی سے خانگی مسائل پر گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے کہا' آپ کسی جاپانی تاریخ کی کتاب کو اٹھائیں ـــــ ''ہیروہیٹو'' کے جنگی کارناموں کو سنہری حرفوں میں لکھا پائیں گے۔ پچھلے دنوں کوریا کے عوام اور حکومت نے جاپانی تعلیمی اداروں اور مؤرخوں کو سخت سست کہا کہ ان کی تاریخ کی کتابوں میں جاپان کے کالے کرتوت پر سفیدی پھیر کر شہنشاہ کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جاپانی مؤرخ نے لفظ ''حملہ'' یا ''محاصرہ'' کی بجائے لکھا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں کوریا کو جاپانیوں نے جنگ جیت کر حاصل کیا تھا۔ یہ بات کتابوں میں نہیں ملتی کہ جاپان کی شاہی پالیسی نے مقبوضہ کورین علاقوں پر جاپانی زبان اور شنتو مذہب زبردست مسلط کر دیا تھا۔ انھیں اپنے کلچر کی سنگینی کا خوب اندازہ ہے' ہم لوگ بھی برطانوی راج کی کرم فرمائیوں کو جھیل چکے ہیں۔ خود برٹش انڈیا کے مؤرخوں نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی تحریک کو ''بغاوت'' کے نام سے مشہور کیا ہے' حالاں کہ اسی تحریک اور جدوجہد سے آگے چل کر ہندستان کو آزادی حاصل ہوئی تھی۔ خیر یہ تو ہوتا آیا ہے۔ نپولین کے جنگی کارناموں کو جس طرح فرانسیسی مورخ پیش کرتے ہیں' یورپ کے دوسرے ملکوں میں قصہ اس کے برعکس ہے۔ امریکہ ویت نام کی جنگ کا ذکر اپنے ڈھنگ سے کرتا ہے مگر اس حقیقت کی ننگی تصویر ویت نام کے مؤرخوں نے کھینچی ہے۔ میرے خیال میں مؤرخوں کو اپنے ملک یا

کسی ملک کی تاریخ بڑی ایمان داری سے رقم کرنی چاہیے۔ گو ایسا عام طور پر نہیں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی بات زیادہ دن چلتی بھی نہیں ہے!

اندھیرا لاکھ روشن ہو اجالا پھر اجالا ہے

اچانک جانی نے پوچھا شہنشاہیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا' اول تو میں اس کے حق میں نہیں' ہوسکتا ہے دورِ جاہلیت میں بادشاہت نے چند کارنامے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے انجام دیے ہوں' مگر آج کے مشینی دور میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جمہوریت اور شخصی آزادی ہی آج دنیا کی ضرورت ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دس بجا چاہتے تھے۔ میں نے جانی سے کہا' مجھے اپنی ایک مختصر سی نظم اس وقت یاد آرہی ہے۔ اس کا ترجمہ اپنے دوستوں کو میری طرف سے سنا دینا۔ یہی ہمارا تحفہ تمہارے لیے ہے۔ نظم کا عنوان تھا ''پرورتن''

''سنا تھا
خموشی ہر بلا کو ٹالتی تھی
اس لیے چپ ہوں!
مجھے چپ سادھ لینے دو
مگر سن لو ـــــ

کہ موسم اب بدلنا چاہتا ہے!''

حالاں کہ یہ نظم میں نے جاپان کے لیے نہیں لکھی تھی' مگر اس وقت برمحل تھی اور جانی کو یہ نظم بہت پسند آئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔ گو ہماری ملاقات بہت مختصر سی تھی مگر تھی یادگار۔ میں نے کہا ٹریسی کو میری طرف سے ''سایونارا'' کہہ دینا۔ جانی مسکراتا ہوا ہم سے رخصت ہوا مگر ذہن میں بہت سارے سوالات چھوڑ گیا۔

میں اپنا سامان یکجا کر رہا تھا کہ انور میاں آگئے' وقت بہت کم تھا' اس نے فون کر کے ٹیکسی بلائی اور ہم لوگ قریبی ریلوے اسٹیشن چل پڑے۔ وہاں سے ٹرین لے کر ''وینو'' آئے۔ میں یہاں سے انور کو الوداع کہنا چاہ رہا تھا مگر وہ ایئر پورٹ چلنے کے لیے بضد تھا۔ ''اسکائی لائن'' ٹرین ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں ایئر پورٹ لے آئی۔ راستہ بھر انور کلکتہ کے دوستوں، اپنی متوقع شادی اور کچھ کچھ کینیڈا کے ویزے کے متعلق پوچھتا رہا جسے میں ہاں' ہوں میں جواب دیتا رہا کیوں کہ میرا ذہن اب بھی جانی کے ساتھ جنگ کے ہولناک منظر میں الجھا ہوا تھا۔ ایئر پورٹ پہنچ کر ہم لوگوں نے آخری کافی لی اور چسکیاں لیتے ہوئے انور کو

بتایا کہ یہ سفر مجھے کافی عرصہ تک یاد رہے گا۔ ساتھ ہی تمہاری مہمان نوازی اور خلوص، رئیس بھائی اور استاد صاحب کی اپنائیت، مینوری دائی کی مسکراہٹ، ٹریسی میک لین کا بھولپن اور جانی کی باتیں میں شاید ہی بھلا پاؤں ـــــ انور نے ہنستے ہوئے کہا اور جاپانی پکوان؟ میں نے مسکرا کر کہا' میرے بدلے کچی مچھلی تم کھالینا۔ ہم دونوں ہنس پڑے!

جب تک آخری کال نہ کی گئی انور نے مجھے روکے رکھا۔ پھر میں انور سے بغل گیر ہو کر تین بار جھک کر آخری جاپانی آداب عرض کیا اور ''چیک اِن'' کی طرف روانہ ہوا۔

پندرہ گھنٹے کی کمر توڑ پرواز میں ''تھائی ایئر'' کی نازک اندام اور زرق برق لباس والی دلکش ایئر ہوسٹس کی مہمان نوازیوں کو بھی میں عرصہ تک بھولنا نہیں چاہتا تھا ـــــ گویا ہر طرح سے سفرِ جاپان یادگار، معلوماتی اور مسحور کن تھا ـــــ!

☆☆☆

شہرِ خوباں ہانگ کانگ

برطانیہ عظمیٰ کے ڈوبتے ہوئے امپیریل سورج کی آخری کرن ہانگ کانگ کو واقعی شہرِ خوباں کہا جاسکتا ہے ـــــ ابھی ابھی تھائی ایئر کی ریشمی ہوسٹس نے مسافروں کو خبردار کیا ہے کہ "اپنے بھرے پرے بٹوؤں کو سنبھالیں اور دلِ نامراد کو تھامیں۔ہم لوگ بس "کائی ٹاک" طیرانگاہ پر اترا چاہتے ہیں۔" ـــــ میری طرح ہر کوئی جہاز کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگا۔ہانک کانگ اور مضافات کے جزیروں کی روشنی اور چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کررہی تھیں۔ہانک کانگ سے متصل کاؤلون کا جزیرہ سمٹا ہوا دلِ عاشق لگ رہا تھا۔ان جزیروں کی اسکائی لائن قابلِ دید تھیں۔رات کے اندھیرے میں "کائی ٹاک" طیرانگاہ پر اترنے میں اتنی وحشت نہیں ہورہی تھی جتنی دو ہفتے قبل اسی جگہ دن کی روشنی میں ہوئی تھی۔اچھے اچھوں کا دل اچھل کر حلق کو چھو گیا تھا۔معاملہ یہ ہے کہ کاؤلون کا طیرانگاہ لبِ سمندر واقع ہے اور یہاں کہنہ مشق پائلٹ اپنی پرواز اور اترنے کا کمال دکھاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ جہاز رن وے کی بجائے پانی میں اتر رہا ہے۔میں نے یہ سین دیکھ رکھا تھا پھر بھی جی کڑا کر کے کھڑکی سے جو دیکھا تو جہاز فلک بوس عمارتوں سے اس قدر قریب تھا کہ بس ـــــ ساتھ ہی کہرے کی دبیز چادر نے طیرانگاہ کو ڈھانپ رکھا تھا۔مجھے لگا کسی طور اگر ہم ان عمارتوں سے بچ نکلے تو بھی زمین کی جگہ پانی میں اترتے چلے جائیں گے۔مگر یہ سوچ کر تسلی تھی کہ تھوڑی بہت تیراکی تو ہمیں بھی آتی ہے۔میرا شریفانہ مشورہ ہے کہ ہانگ کانگ اول تو آپ دن کو نہ جائیں (ویسے بھی ہانگ کانگ شب بیداری کی جگہ ہے) اور اگر بہ حالت مجبوری جانا پڑے تو تیراکی کے لیے تیار رہیں ـــــ یا پھر سیدھی طرح کھڑکی کے قریب نہ بیٹھیں وحشت کم ہوگی۔جب ہم لوگ بچتے بچاتے نیچے اتر رہے تھے تو کچھ عمارتوں کی چھتوں سے اس قدر قریب تھے کہ ان پر سوکھتے کپڑوں کے لیبل پڑھے جاسکتے تھے۔یہ منظر مجھے بڑا مانوس لگا۔ٹی وی کے انٹینا سے بندھے تار پر جھولتے رنگ برنگی کپڑے جھنڈیوں کی طرح لہرارہے تھے۔یہاں کا رن وے سنا دو میل لامبا ہے۔پھر سنا یہ سارا طیرانگاہ سمندر سے زبردستی حاصل کی ہوئی زمین پر کھڑا ہے۔دلکش منظروں اور دلدوز اعلانات کے ساتھ ہم لوگ آخرکار صحیح سلامت رن وے پر دوڑتے ہوئے ایک جھٹکے سے رکے۔کچھ عورتوں کی چیخ نکل گئی۔پھر چند سیلانی امریکنوں نے تالیاں پیٹنا شروع کیا۔ان کی دیکھا دیکھی سب تالی بجارہے تھے بلکہ سیٹی بجا کر پائلٹ صاحب کو شاباشی دے رہے تھے کہ جوان نے ہم سبھوں کو بھیگنے سے بچالیا۔

کائی ٹاک طیرانگاہ کے گھڑیال نے ہمارے اترتے ہی رات گیارہ کا اعلان کیا۔ ہم خراماں خراماں ساری وحشت سمیٹے کسٹم کے حکام کی طرف بڑھے' امید کے خلاف چند نوجوان چینی افسروں نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم بھی ایک طرح سے ان کے کامن ویلتھ بھائی (کینیڈین) تھے۔ بنکاک کے سیدھے مگر بدتہذیب افسروں کے مقابلے میں ہانک کانگ کے چاق و چوبند، خوش لباس وخوش اخلاق افسروں نے ہمیں بڑا متاثر کیا۔ آخر کلونیل ازم کی کچھ اچھائیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کا طیرانگاہ بھی ضرورت سے زیادہ صاف اور جدید طرز کا تھا۔ میں کاؤلون کے میزبانوں کو دعائیں دیتا اپنا مال واسباب سمیٹے ''لگیج کلیم' والے ہال میں آیا۔ یہاں بھیڑ بہت تھی۔ شاید اسی وقت ایک اور جہاز آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیگ اور سوٹ کیسوں کی وہ نوچ کھسوٹ ہوئی کہ مجھے کلکتہ کا ''دمدم' ہوائی اڈہ یاد آ گیا ـــــ میں اُچک اُچک کر اپنے سوٹ کیس کو دیکھ رہا تھا کہ میرے آگے والے چینی نے ایک زوردار کہنی مجھے بلا تکلف رسید کر دی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ جب مطلع صاف ہوا تو دیکھا ایک ساڑھے چار فٹ کی چینی بڑی بی میرے سوٹ کیس کو اپنا سمجھ کر جھپٹ پڑی تھی۔ درد کو دبائے' سپاٹ چہرہ لیے میں اپنے سوٹ کیس کو ٹرالی پر لاد کر چینی وضعداری کے متعلق سوچتا گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا ـــــ مین ہال میں ہزاروں چینی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے' بیشتر کی آنکھیں نم تھیں۔ معلوم ہوا چائنا ایئر کے ذریعہ شنگھائی سے آئے ہوئے مسافر اپنے رشتہ داروں سے برسوں بعد مل رہے تھے ـــــ ملن کا ایسا منظر میں نے بچپن میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے مسافروں میں دیکھ رکھا تھا۔ میری بڑی بہن رضیہ بھی مجھ سے مل کر زاروقطار رودیا کرتی تھی۔ بٹوارے نے کتنے دلوں کو دکھی کیا تھا۔

میں دنیا کے مہاجروں کا رونا روتے باہر نکلا تو اچانک سرد لہر نے کپکپا دیا۔ میں بنکاک سے ہو کر آرہا تھا جہاں موسم گرم تھا اس لیے میں ہلکے پھلکے لباس میں تھا۔ مگر یہاں موسم خاصا خنک تھا۔ ۸/ مارچ ۱۹۸۹ء کی اس خنک رات میں کائی ٹاک طیرانگاہ سے باہر ٹیکسی کی لائن میں کھڑا ہانپ رہا تھا۔ کوئی ۵/ منٹوں کے بعد ایک خوبصورت چمچماتی گولڈن ''والوؤ'' میرے آگے رکی۔ میں نے بیٹھتے ہی اسے ''چن کنگ مینشن'' بتایا ـــــ گاڑی سبک رفتاری سے شہر کی طرف چل پڑی ـــــ رات بارہ بج چکے تھے مگر شہر کی زندگی جاگ رہی تھی بلکہ تیزی سے بھاگ بھی رہی تھی۔ کاؤلون شہر کی سڑکیں کشادہ اور نیون لائٹ میں نہائی ہوئی تھیں۔ نیتھن روڈ پر ہزاروں نیون سائن بورڈ پلکیں جھپکا رہے تھے۔ شاید یہی کاؤلون کی خاص شاہراہ یا مین اسٹریٹ تھی جس کے دونوں جانب بے شمار ریستوران، شبینہ کلب اور بار کے اندر اور باہر لوگ مٹر گشتی کر رہے تھے۔ میں راستے اور قد آدم اشتہار والے قمقموں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ

ساتھ ہانک کانگ اور کاؤلون کے نقشے کو بھی دیکھے جا رہا تھے جسے میں نے طیرانگاہ سے اٹھایا تھا۔ دنیا کے کسی بھی ایئرپورٹ پر یہ سہولتیں نہ دیکھی تھیں ــــ کائی ٹاک طیرانگاہ سے نکلتے وقت صدر دروازے سے پہلے ایک جگہ بے شمار پلاسٹک کے تھیلے لٹک رہے تھے۔ اس پر لکھا تھا ''معلومات کے لیے مجھے ساتھ لے چلو''۔ اس تھیلے میں ہانک کانگ کا نقشہ، ٹورسٹ انفارمیشن کا کتابچہ، مختلف ہینڈ بل وغیرہ وغیرہ مسافروں کی سہولت کے لیے یکجا کر دیے گئے تھے۔ ہانک کانگ کے نقشے کے ایک طرف روزمرہ کی بول چال کی چینی یا کنٹونیز کی فہرست درج تھی۔ ابھی میں شکریہ کا ترجمہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے گھوم کر بتایا ''چن کنگ مینشن''۔ میں نے میٹر کی طرف دیکھا۔ ۲۷ر ڈالر بنے تھے۔ میں نے ۳۰ر ڈالر دیتے ہوئے ''مگوئی''، یعنی شکریہ کہا۔ ڈرائیور خوش ہوتے ہوئے ''دوربے'' کہنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے سامان نکال کر بلڈنگ کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے چلتے چلتے اپنے چینی ڈرائیور کو 'جوئے گین'، یعنی خدا حافظ کہا اور اپنے عارضی مسکن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''چن کنگ مینشن'' کا ٹھکانہ مجھے طارق اور نیاز چودھری نے بتایا تھا کہ یہاں کمرہ ستامل جائے گا۔ رات ساڑھے بارہ بجے اس سپر مارکٹ نما بلڈنگ کے سامنے سیاحوں ،خوانچہ والوں، سڑکی قمار بازوں اور ٹھیلے پر گھڑی، ٹرانسسٹر اور قلم وغیرہ بیچتے لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں بھول ہی گیا کہ میں یہاں قیام کرنے آیا ہوں اور مجھے ایک عدد کمرہ بھی چاہیے۔ میں سڑکی تماشہ اور دلکش چہروں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک دیسی لڑکا قدرے قریب آ کر کہنے لگا کہ کیا کمرہ چاہیے؟ــــ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر گرن ہلائی ــــ اس نے بھی اتنی ہی لاپرواہی سے کہا ''آج تو سارے کمرے فل ہیں۔'' اس پر میں چونکا ــــ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے بڑے اطمینان سے کہا' قریب کے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ مل سکتا ہے' چلو میں لیے چلتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ میرا سوٹ کیس اٹھا چکا تھا۔ میں نے ایک ہی سانس میں پوچھا ــــ بھائی تم مہربانی کچھ زیادہ کر رہے ہو۔ تمہیں کتنا دینا ہوگا؟ ــــ اور کمرہ کتنے کا ہوگا؟ ــــ اس نے کہا کمرہ ۲۰۰ر ڈالر کا اور مجھے دس ڈالر دے دینا۔

بس! ایک تو نئی جگہ' دوسرے رات آدھی بیت چکی تھی' پھر میں تھکا ہوا بھی تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیسے اس فریبی کے ساتھ ہولیا۔ دو تین گلیاں گھما کر وہ ایک پرانے مکان میں داخل ہوا۔ دوسری منزل پر ایک فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے گھنٹی دبائی۔ ایک چینی بڑی بی نے سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اس فلیٹ نما گیسٹ ہاؤس میں صرف دس کمرے تھے جن میں آٹھ اٹھ چکے تھے۔ باقی کے دو کمروں میں سے ایک مجھے دکھایا گیا۔ کمرہ کیا تھا ایک کوٹھری تھی جس کا دروازہ مجھ سے کافی چھوٹا تھا۔

کمرے میں ایک سنگل بیڈ، ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔شاید یہ فرنیچر کمرے کے اندر ہی بیٹھ کر بنایا گیا تھا کیوں کہ اس دروازے سے تو پلنگ کا گزارنا مشکل تھا۔ میں نے دیکھا میرا ایجنٹ بڑی بی سے چینی یا کنٹونیز میں فرفر باتیں کررہا ہے اور کسی بات پر الجھ بھی رہا ہے۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ مجھے کمرہ پسند نہیں کہیں اور چلو۔ مجھے جاتا دیکھ کر بڑی بی نے فوراً ۱۸۰رڈالر کہا۔ میں پھر بھی تیار نہیں ہوا تو لڑکے نے ۱۵۰رڈالر دے کر معاملہ پکا کیا۔ میں نے کہا میں مزید اور کچھ نہ دوں گا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اتنے میں بھی یہ جگہ مہنگی ہے۔۱۵۰رڈالر دے کر میں نے کمرہ اندر سے بند کرلیا' لباس تبدیل کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا مگر نیند نہیں آئی۔سوچا غسل کرلیا جائے پھر آرام سے سوئیں گے۔کمرے کے اندر ہی ایک چارفٹ کا باتھ روم تھا۔کسی طرح گرم پانی سے نہا کر میں باہر نکلا اور آخر کار سو گیا!

صبح کوئی آٹھ بجے میرے بازو کے کمرے میں کوئی زور زور سے کھانس رہا تھا یا شاید منہ دھو رہا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی ۔ بادلِ ناخواستہ جلدی تیار ہو کر باہر نکلا —— مجھے بارہ بجے کمرہ خالی کرنا تھا۔ابھی میرے ہاتھ میں چند گھنٹے تھے۔اس دوران مجھے نیا ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔ چند گلیوں سے ہوتا ہوا میں واپس چن کنگ مینشن آیا۔صبح نو بجے یہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔ پہلے میں نے اچھی طرح پورے مینشن کا چکر لگایا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ''چن کنگ مینشن'' ایک عمارت کا نام نہ تھا۔اس دیوزاد کمپلیکس میں تقریباً چھ مکان یکے بعد دیگرے کھڑے تھے جن کا صدر دروازہ ایک تھا مگر اوپر جانے کے لیے چھ سے زائد لفٹ کام کر رہے تھے۔ یہ مکان تقریباً ۲۲رمنزلہ تھا۔اس میں کچھ نہیں تو ہزار کمرے موجود تھے ۔ یہاں بے شمار گیسٹ ہاؤس کے علاوہ سینکڑوں اسٹور، ریستوراں، کلب بار اور بینک کاؤنٹر موجود تھے۔ میں نے ایک کیفے میں چائے پینے کا پروگرام بنایا۔ کیفے ایک سردار جی کا تھا۔ وہ مجھے بھی سردار سمجھ کر پنجابی میں شروع ہو گیا مگر میری اردو سن کر مسکرانے لگا اور فوراً پوچھا تسی پاکستان سے آئے ہو؟ میں نے ''نا'' کہتے ہوئے چائے اور آملیٹ کا آرڈر دے دیا۔مصروف ہوتے ہوئے بھی سردار میرا خاص خیال رکھ رہا تھا ۔چائے کا گلاس بڑھاتے ہوئے بولا —— ''کوئی خریداری کرنی ہو تو واجب قیمت پر مال ہمارے اسٹور سے مل جائے گا۔ جی! ویسے کس بلاک میں ٹھہرے ہو؟ میں نے بتایا' ابھی ابھی آیا ہوں —— سردار جی کھل اٹھے۔''بے فکر پہلوان' اپنا گیسٹ ہاؤس' مہاراجہ رنجیت سنگھ ہے نا —— سامان کہاں ہے؟'' میں نے چائے کا گرم گھونٹ اتارتے ہوئے پوچھا کرایہ کیا ہوگا —— سردار نے الٹا سوال کیا' پہلی بار آئے ہو؟ میں نے کہا نہیں —— سردار نے بڑی بے نیازی سے کہا'' چلو سو ڈالر دے دینا۔اب تم سے کیا

دھندا کریں۔‘‘میں ناشتے سے فارغ ہوکر سردار کے ایک لڑکے کے ساتھ دسویں منزل پر کمرہ دیکھنے چلا گیا ۔چینی گیسٹ ہاؤس کی طرح کمرہ کیبن نما تھا مگر یہ پہلے سے زیادہ گندا تھا۔مینیجر کرم جیت سنگھ نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا’’یہاں رکو گے تو ہمارے کیفے میں کھانے پر۲۰ر فیصد کی چھوٹ ملے گی۔میں نے سوچا کفایت شعار یوتھ ہوسٹل اور مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل میں بہت قیام کیا۔ذرا یہ لوور مڈل کلاس غلیظ گیسٹ ہاؤس کا تجربہ بھی کیا برا ہے۔میں نے مینیجر کو ایک رات کا کرایہ سوڈالر دیا(یعنی ہمارے پندرہ ڈالر اور دیسی ۲۰۰ر روپے)اب مینیجر صاحب چابی ڈھونڈ رہے تھے۔معلوم ہوا گزشتہ رات کوئی پٹھان اس کمرے میں تھا۔وہ شاید غلطی سے چابی لے گیا تھا۔میں نے رسید لی اور اپنا سامان لانے چلا گیا۔چینی بڑی بی نے مجھے کمرہ چھوڑتے دیکھ کر کہا تم آج رکو گے تو کرایہ سوڈالر کا ہوگا۔میں نے بغیر کچھ کہے کمرہ خالی کیا اور واپس مہاراجہ رنجیت سنگھ گیسٹ ہاؤس پہنچا۔اس دوران مینیجر نے نئی چابی کمرے کی بنوا رکھی تھی۔میں نے سامان کمرے میں رکھا اور باہر نکل پڑا۔

’’چن کنگ مینشن‘‘بذاتِ خود ایک جزیرہ تھا اور اسے پوری طرح دیکھنے کے لیے کئی دن درکار تھے ۔ابھی میں ایک ہی بلاک میں الجھا ہوا تھا۔اندازہ یہ ہوا کہ سیاحوں کے علاوہ کاروباری یا تیسری دنیا کے اسمگلروں اور ہیرا پھیری کرنے والوں کی یہ خاص پناہ گاہ تھی۔لوگ دو تین دنوں کے لیے اس مکان میں قیام کرتے ہیں اور یہیں گھڑی سے لے کر ہیرے تک کی خریداری کر کے کھا پی کر رخصت ہوجاتے ہیں۔ انھیں اس عمارت کے علاوہ نہ کسی کی خبر ہے نہ ضرورت۔سیاحوں میں امریکی،کینیڈین،آسٹریلین اور جیم شحیم عربوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم اب اتنی بری جگہ بھی نہیں ٹھہرے جتنا سمجھ رہے تھے۔مزے کی بات یہ تھی کہ ہر فرقے،رنگ اور ملک کے کاروباریوں نے اپنے مسلک کا گیسٹ ہاؤس کھول رکھا تھا۔یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ،دلّی دربار،اسلام آباد کلب،جئے بنگلہ ہاؤس،سری لنکا کارنر،مدراس سینٹر،بیجنگ ہوٹل، ویتنام پیلس،کیلی فورنیا کلب،فیوجی یاما ہوسٹل وغیرہ وغیرہ —— جتنے گیسٹ ہاؤس تھے اتنے ہی قماش کے کیفے،ریستوران اور بار خدمت گزاری میں مصروف تھے۔پہلے ہی روز چن کنگ مینشن کی ملٹی کلچرل طبیعت نے میرا دل جیت لیا۔یہاں بھانت بھانت کے خریدار اپنی پسند کی چیزیں تیز طرار اور چرب زبان دکانداروں سے خرید رہے تھے۔

کینٹونیز میں’’کاؤ‘‘کے معنی ہوتے ہیں’’نو‘‘اور’’لون‘‘کا مطلب’’ڈراگون‘ہوتا ہے۔کاؤلون کا نام اس طرح پڑا کہ چین کا ایک نوعمر بادشاہ اپنے بادبانی جہاز سے اس جزیرے کے پاس سے گزر رہا تھا ۔اس نے جزیرے پر سلسلہ وار پہاڑیاں دیکھیں جس کی آٹھ چوٹیاں تھیں۔شاہ نے اپنے محافظ سے کہا‘

دیکھو آٹھ ڈراگون'' ـــــ محافظ نے سرخم کرتے ہوئے کہا میرے آقا آٹھ نہیں نو ڈراگون ـــــ کیوں کہ چینی اپنے بادشاہ کو بھی ڈراگون ہی تصور کرتے ہیں۔ڈراگون ان لوگوں کے لیے طاقت کی نشان دہی کرتا ہے اور ''نو'' کا ہندسہ ''درازیٔ عمر'' کا نشان سمجھا جاتا ہے۔کاؤلون گرچہ ہانگ کانگ سے چھوٹا جزیرہ ہے مگر اس کی آبادی دگنی ہے۔ایک سروے کے مطابق کسی کسی علاقے میں آبادی اتنی گھنی ہے کہ ایک اسکوائر کیلومیٹر پر ڈیڑھ لاکھ لوگ کلبلا رہے ہیں۔مگر زندگی تیز رفتار ہے۔بھیڑ اور گھنی آبادی کے باوجود ہر وقت ٹریفک جام نہیں رہتی۔پھر کلکتہ، بنکاک یا نیویارک کی طرح وحشت زدہ ٹریفک بھی نہیں۔آمد و رفت کے لیے بس، ٹرام، ٹیکسی، زمین دوز سب وے اور موٹر لانچ لوگوں سے بھری مگر آرام سے حرکت کرتی نظر آتی ہے ۔چن کنگ مینشن سے نکلتے ہی میں نے سڑک پر لوگوں اور سروں کا دریا رواں دیکھا۔ساتھ ہی نفیس ترین گاڑیاں قطار اندر قطار دیکھیں۔ساری دنیا میں کہیں بھی میں نے ایک ہی جگہ قطار میں رولس رائس، مرسیڈیز اور جاگوار گاڑیاں نہیں دیکھی تھیں جتنی کہ یہاں نظر آ رہی تھیں۔میں نے سن رکھا تھا کہ ایک میل کے رقبے میں جتنی ''مرسیڈیز بینز'' ہانگ کانگ میں نظر آتی ہے کہیں اور نہیں آسکتی۔آج یہ منظر دیکھ رہا تھا۔سڑک ''مرسیڈیز پارکنگ لاٹ'' لگ رہی تھی۔فٹ پاتھ پر ٹھیلے والوں کی بھیڑ تھی۔ہر کوئی بھاگا جا رہا تھا۔اس تگ و دو میں سڑک کی ٹھیلے والے ٹی شرٹ، جینز، کیمرہ، نقلی زیورات اور چینی دستکاری کے نمونے بڑی مناسب قیمتوں پر بیچ رہے تھے۔ہر دوسرا راہ گیر ایک لمحے کو رک کر چیزیں الٹ پلٹ بھی کر لے رہا تھا۔ساتھ ہی خوانچہ والے پتہ نہیں کیا کیا بیچ رہے تھے۔لوگ جسے خریدتے راہ چلتے ہوئے منہ بھی چلا رہے تھے۔

پہلی نظر میں ایئر پورٹ پر ہی مجھے ہانگ کانگ والے بڑے خوش اخلاق، خوش لباس اور محنتی نظر آئے۔ظاہر ہے پچھلی پوری صدی ان لوگوں نے انگریزی تہذیب اور تعلیم سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ مگر ان خوش اخلاق اور خوش لباس چہرے پر آج مجھے تازگی نظر نہ آئی۔کام کاج اور ذمہ داریوں میں یہاں کے باشندوں کا جواب نہیں۔مگر اسکول میں ہی انھیں کامیابی کی پیہم کوشش اور پریکٹس کی جو عادت ڈالی جاتی ہے وہ سنِ بلوغت تک پہنچتے پہنچتے مادی زندگی اور ڈالر سے رغبت کی ایک علت بن جاتی ہے۔

اس مادی آنکھ مچولی میں ان کی زندہ دلی ماند پڑ جاتی ہے۔ساتھ ہی روح کی معصومیت جاتی رہتی ہے۔بے حد کامیابی اور بے پناہ دولت کے باوجود کچھ ہے جو یہاں کی زندگی میں کم ہے۔غریب تو کہیں بھی خوش نہیں رہتا۔یہاں کے امیر بھی ناخوش نظر آئے۔حالاں کہ وہ ہنس بول بھی رہے تھے اور جی کھول کر خرچ بھی کر رہے تھے۔اس لحاظ سے دیسی عوام خوش لباس نہ سہی مگر اندر سے خوش ضرور ہیں۔گو ان کا پیٹ پوری طرح نہیں بھرتا مگر روح پوری طرح زندہ اور مطمئن ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کاروباری

ضرورت کے تحت ہانگ کانگ والوں نے اپنے چہروں پر سپاٹ پن کے نقاب لگا رکھے ہوں مگر اپنے گھروں میں یہ لوگ بھی ہماری طرح کھل کر ہنستے بولتے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ پھر تو یہ ہماری نوٹنکی برادری والوں سے بھی بڑے اور پُر اثر فن کار لوگ ہیں۔

''کاؤلون'' کے جزیرے پر آباد ''سم شا سوئی'' کا علاقہ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف مصروف ترین کمرشیل ڈسٹرکٹ ہے بلکہ یہیں سارے فائیو اسٹار ہوٹل، فلک بوس عمارتیں، نفیس ترین فیشن پارلر، شاپنگ پلازا اور شبینہ کلب کی بھرمار ہے۔ چن کنگ مینشن سے دو فرلانگ پر ہی عظیم الشان ''پینسولا ہوٹل'' (Peninsula Hotel) کی عمارت ہے جس کے باہر ایک بڑا سا چینی پوسٹر ''چینی خطاطی'' کی نمائش کا لگا تھا۔ کتاب کے سلسلے میں کاتب حضرات سے تو اردو کے ادیبوں کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے اور دیکھیے کب تک رہے گا۔ میں کسی پروگرام کے بغیر نمائش میں یہ دیکھنے کے لیے چلا گیا کہ چینی کاتب ہمارے کاتبوں کی طرح کیا کچھ گل کھلاتے ہیں۔ ایک بڑے سے بینکٹ ہال میں مختلف خوش نویسوں کی کتابت شدہ تحریریں، پوسٹر اور کتابیں بڑے قرینے سے سجی تھیں۔ بھیڑ خاصی تھی۔ میں آڑی ترچھی تحریروں کو اور لوگ مجھے کر دیکھ رہے تھے۔

''چینی'' دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان و ادب نے ہزاروں سال کی تاریخ و تہذیب کو نہ صرف رقم کیا بلکہ محفوظ بھی کر دیا ہے۔ اس زبان کا ہر لفظ یا کردار ایک خاص خیال یا تصویر پیش کرتا ہے۔ عام زبانوں کے حروف کی طرح صرف آواز نہیں۔ اس لیے اس کردار کو کیسے رقم کیا جاتا ہے یہی اس کی اہمیت ہے۔ چینی اساتذہ خطاطی یا خوش نویسی کو بڑی سنجیدگی سے ایک آرٹ فارم تصور کرتے ہیں۔ اردو کے کاتب کی طرح نہیں جو اپنی مرضی (یا گھریلو الجھن کی وجہ سے) ادیب کا مضمون بدل دیتے ہیں۔ (اسی لیے میں پہلے کاتب سے دوستی کرتا ہوں پھر کتابت کراتا ہوں۔) چینی زبان کے کردار ایک کو لکھنے کے لیے کبھی کبھی ایک قلم سے لے کر ۳۳ قلم یا برش کے خط کی ضرورت پڑتی ہے۔ بول چال کی زبان لکھنے سے زیادہ مشکل ہے، کیوں کہ مختلف لہجہ اور "Tone" سے معنی بدلتے چلے جاتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں چینی لوگ کنٹونیز بولتے ہیں مگر سنا یہاں بھی سات مختلف سروں یا لہجہ میں بات کی جاتی ہے۔ مجھے بہت حیرت نہیں ہوئی۔ اب اردو بھی تو لکھنؤ یا دہلی سے نکل کر بہار، بنگال اور بمبئی میں ہر وضع قطع، اسٹائل اور آہنگ میں بولی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں زبان کی ترقی میں اس کا استعمال میں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ چاہے جس خطے میں رہے۔ ''ش-ق'' کے ساتھ محدود رہنے سے بہتر ہے ہر خاص و عام کے مصرف میں رہے۔ اب ہماری طرح دیگر اردو دوست جو وطن سے دور ڈیرہ جما چکے ہیں، کب تک اپنی

زبان کو "Anglican" ہونے سے بچا پائیں گے۔ یہ کیا کم ہے کہ اردو ادب اب دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکی ہے۔ میں کوئی بیس منٹ نمائش میں گھومتا رہا پھر باہر نکل رہا تھا کہ دیکھا ہوٹل کے گیٹ پر ایک قد آدم (غصہ میں لال پیلی) چینی دیوی کا عکس لگا ہے۔ لوگ بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں نے قصہ معلوم کیا۔ پتہ چلا یہ سب ''فینگ شوئی'' کا کمال ہے۔ میں نے پوچھا یہ فینگ شوئی کیا بلا ہے؟ ہوٹل کے ایک شریف دربان نے' جو اس وقت قصہ سنانے کے موڈ میں تھا' بتانے لگا کہ ''فینگ شوئی'' ایک قدیم نسخہ نجات دہندہ یا دافعِ بلا ہے۔ چینی کردار فینگ کے معنی ہوتے ہیں ''ہوا'' اور ''شوئی'' کے معنی ''پانی''۔ دراصل اس سے مراد ہوتا ہے کمرہ، مکان یا نئی تعمیرات میں چھپی طاقت کو دریافت کرنا یا اسے شر سے بچا کر رکھنا۔ اور یہ قدیم نسخہ ایک چھوٹے سے شیشے کی شکل میں مکان کی کھڑکی یا برآمدے میں لگا دیا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی جب اس شیشے پر پڑتی ہے تو اس کی چمک سے کوئی بدروح مکان میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہی نہیں اس شیشے کو کہاں' کیسے اور کس رخ سے کھڑکی یا مکان میں نصب کرنا ہے' یہ بھی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے ماہر پنڈت بلائے جاتے ہیں جو اس کام کا ہزار ڈالر تک وصول کر لیتے ہیں۔ فینگ شوئی کی ضرورت صرف غریبوں کو نہیں پڑتی امیر کبیر، کاروباری، ہوٹل اور بینک والے بھی اس کے بغیر دھندہ نہیں شروع کرتے۔ فینگ شوئی کا رخ ہمیشہ پانی کی طرف ہوتا ہے اور اس کی پشت پر پہاڑ ضروری ہے۔ مگر جب اس رخ کے سامنے کچھ اور آجائے یا تعمیر ہو جائے تو اس کا علاج پھر کسی دیوی یا عکس یا مورت نصب کر کے کیا جاتا ہے۔ اس لیے جب پینسولا ہوٹل کے مقابل ایک دوسری بڑی عمارت اور اس کا گنبد آ گیا تو ہوٹل والوں نے اپنے گیٹ پر غصہ والی چینی دیوی کو بٹھا دیا۔ کبھی کبھی ''فینگ شوئی'' کے رخِ زیبا کو ٹھیک جگہ نصب کرنے کے چکر میں کافی پریشانی ہوتی ہے۔ چند برسوں پہلے یہاں ہانگ کانگ شنگھائی بینک کی نئی عمارت کھڑی ہوئی تو اس کے صدر دروازے پر فینگ شوئی کے قاعدے کے مطابق دوڑ راگون کو ہٹا کر پھر سے نیا گیٹ بنایا گیا۔ اس ردو بدل سے نہ صرف وقت برباد ہوا بلکہ بینک کے افتتاح کا دن بدلا گیا اور اس کے اخراجات کا تو کچھ نہ پوچھیں۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ تمام پریشانیوں کے باوجود چینی اس نسخے کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چینی فطرتاً توہم پرست ہوتے ہیں۔ انگریزی تعلیم و تربیت کے باوجود قدیم رسومات آج بھی ہانگ کانگ کی روزمرہ زندگی میں شامل ہیں اور رہیں گی۔ برا بھی کیا ہے؟ ان رسومات پر ایک طبقے کا پیٹ پلتا ہے۔ یعنی معاملہ کچھ ہمارے یہاں کے تعویذ گنڈوں کی طرح ہے۔ جب ہمارے یہاں کٹھ ملے اور پنڈت مزا کر سکتے ہیں تو ہانگ کانگ کے فینگ شوئی والے بے چارے کیوں نہ کریں؟ مگر مجھے حسد اس بات کی ہو رہی ہے کہ یہاں والے ہمارے

غریب مولوی سے زیادہ مزا کر رہے ہیں۔

ہوٹل ''پینِنسولا'' کے سامنے ''اسٹار فیری'' یعنی کاؤلون کی بندرگاہ ہے۔ یہاں سے ہانگ کانگ کے لیے ہر ۵/منٹ پر اسٹیمر یا فیری چلتی رہتی ہے۔ میں آج کاؤلون میں وقت گزارنا چاہتا تھا اس لیے فیری سے داہنے ہاتھ پر چل پڑا۔ کچھ ہی فاصلے پر ہانگ کانگ کا اسپیس میوزیم تھا۔ اس علاقے میں نئی تعمیرات کا کام زوروں پر تھا۔ فضا میں گردوغبار اور مشینوں کا شور تھا۔ اس سے کچھ آگے ہی ایک گھنٹہ گھر نظر آیا جس پر گرد کی دبیز تہہ جمی تھی اور یہ اس علاقے کے توڑ پھوڑ میں تنہا کھڑا تھا۔ ہاں' گھنٹہ اس کا اس ماحول میں بھی صحیح وقت بتا رہا تھا۔ دوپہر سوا بجا چاہتے تھے۔ یہ گھنٹہ گھر کسی زمانے میں کاؤلون کینٹون ریلوے کا پُر وقار حصہ تھا۔ ٹرمینل کی عمارت کو منہدم کر کے ایک میل کی دوری پر ''ہنگ ہوم'' کے علاقے میں ایک عظیم الشان اور جدید ریلوے اسٹیشن میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہاں سے ریل سروس سرحد پار چین کے لیے ملتی ہے۔ اسٹیشن سے متصل نیا ''ہانگ کانگ کالیزیم'' ہے جسے ایشیا کا سب سے بڑا ''انڈور آڈیٹریم'' کہا جاتا ہے جس میں اسپورٹس اور میوزک کے دلدادوں کے لیے ۱۲،۵۰۰ آرامدہ نشستیں ہیں۔ آج کل ہانگ کانگ اور قرب و جوار کے جزیروں پر ایک کریش پروگرام کے تحت ۱۹۹۰ء کے اخیر تک تقریباً تمام برطانوی جاہ و جلال والی پرشکوہ عمارتیں منہدم کر دی جائیں گی اور سارے برٹش مجسّمے ہٹا دیے جائیں گے کیوں کہ ۱۹۹۷ء میں ہانگ کانگ واپس چین کی تحویل میں چلا جائے گا۔ پھر نوآبادکاری کی تمام عظمت اور یادگار تعمیرات قصۂ پارینہ ہو جائیں گی۔ قدیم عمارتوں میں ۱۸۷۹ء کا ہانگ کانگ کلب' ہانگ کانگ شنگھائی بینک اور ریپلس ہوٹل کی اب صرف تصویریں اور یادیں لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ اس ریلے میں ہانگ کانگ کا قدیم اور پُر وقار (Anglican) اینگلیکن چرچ کو بھی خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ مگر اس کی حفاظت کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ شاید تاریخ اسی کو کہتے ہیں۔ جب انگریزوں نے یہ کالونی بسائی ہوگی انھوں نے بھی پرانی یادگاروں کو مسمار کیا ہوگا۔ بقول شاعر ٹینی سن :

"Old order chengeth yielding place to new!"

یہی حال انگریزوں کے رخصت ہو جانے پر بھارت کا ہوا اور ابھی تک برٹش مجسّموں کو پارکوں اور چوراہوں سے ہٹا کر عجائب گھروں میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اسی گردش کا نام زندگی ہے۔ آخر ہانگ کانگ میں جو دولت جمع ہو رہی ہے' اس پر جمود طاری ہونے سے بہتر ہے' خاندانی بیگمات کی طرح پرانے زیور توڑ کر نئے زیورات بنائے جائیں۔ اس طرح مزدوروں' معماروں اور سناروں کی روزی روٹی چلتی رہتی ہے اور سیاست دانوں اور بیگمات کا وقت اچھی طرح گزرتا رہتا ہے۔ ہر تخریب میں تعمیر کا عنصر تلاش کر لینا

اچھا مشغلہ ہے۔

علاقے کا گشت لگانے کے بعد میں واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ہانگ کانگ اسپیس میوزیم دکھائی دیا۔ اس کا شو ڈھائی بجے تھا۔ ٹکٹ ۱۵ رڈالر اور کوئی چالیس منٹ کا شو تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، ابھی دس منٹ ہاتھ میں تھے۔ ٹکٹ لے کر میں اس گنبد نما ہال میں داخل ہوا۔ آرامدہ ایئر کنڈیشنڈ نشست پر بیٹھ کر بڑا سکون حاصل ہوا، کیوں کہ صبح سے میں پیدل گھوم رہا تھا۔ سیٹ کے ساتھ ہی ہیڈ فون لگے تھے۔ اسے کانوں سے لگا رہا تھا کہ گھپ اندھیرا ہو گیا۔ پروگرام کی تفصیلات کنٹونز میں بتائی جا رہی تھیں جس کا ساتھ ساتھ ترجمہ ہمیں انگریزی میں ہیڈ فون کے ذریعہ سنائی دے رہا تھا۔ آج کے شو کا نام تھا ''دنیا کے عجائب'' ۔ زمانۂ قدیم کے سات عجائب اور نظامِ شمسی کے عجوبوں پر مشتمل ایک فلم دیواروں اور چھتوں پر رینگنا شروع ہو گئی تھی۔ فلم کافی دلچسپ تھی کیوں کہ قدیم عجائبات میں سے آج صرف مصر کے عظیم مخروطی مینار اور ابوالہول باقی رہ گئے تھے۔ باقی چھ عجائبات وقت کے ساتھ ناپید ہو چکے تھے۔ بیشتر عجائب قدیم یونان کے تھے۔ سب سے پہلے والا ''آرٹیمیس'' کے مندر کا شان و شوکت والا عکس دیواروں پر زندہ ہوا۔ اس کی تفصیلات بتائی گئیں۔ پھر یونان کے ''زیوس'' دیوتا کا ظہور ہوا۔ اس کی دیومالائی حیثیت بتائی گئی۔ اس کے بعد ''ہارلی کارناسیس'' کے مقبرے کی عظمت پر روشنی ڈالی گئی۔ ان مناظر کے ساتھ ان کے ماحول کی عکاسی اور اس دور کی موسیقی کا بھی خوب خیال رکھا گیا تھا۔ منظر نامہ بدلتے ہی مصر کی سریلی اور مدھر موسیقی سے عظیم جاہ و جلال والے فرعون کے محل کی سیر کرائی گئی اور آخر میں بابل کے جھولتے باغوں کی بہار کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھولوں پر بھنوروں کا منڈلانا اور جھرنوں کی موسیقی سے دل و دماغ نے تازگی اور فرحت محسوس کی ـــــ وقت کتنا ظالم ہے، زمین کے سینے میں کیسے کیسے نادر جواہر اور منظر نامے دفن کر دیتا ہے ـــــ تاریخ کا پہیہ گھوم رہا ہے، گھومتا رہے گا ـــــ دنیا میں پیغامبروں اور فن کاروں کے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہے گا مگر رفتہ رفتہ ہر کوئی، ہر یادگار مٹی میں گم ہو جائے گی۔ وقت نے نہ کسی کو بخشا ہے نہ بخشے گا! پھر نظامِ شمسی کے پیچیدہ رموز سے آگاہ کیا گیا ـــــ مریخ کے آبی درّوں سے ہمیں گزارا گیا ـــــ میرانڈا سیارے کی یخ بستہ پہاڑیوں کی سیر کرائی گئی ـــــ اور ''آئی.او'' کے لاوا اگلتے آتش فشاں پہاڑوں سے بچا کر چاند کی ٹھنڈی سطح پر اتارا گیا ـــــ آخیر میں سورج سے بہت قریب پہنچ کر آنکھ مچولی کرتے ہوئے ہمیں دوبارہ زمین پر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ۴۰ رمنٹوں میں ہم نے ماضی، حال اور مستقبل کا آموختہ دہرا لیا تھا۔ مجھے یہ مختصر مگر مرصع پروگرام اور معلوماتی خاکے بہت پسند آئے ـــــ خوش لباس اور چہکتے

چہروں کے جلو میں ہم خراماں خراماں قدیم عجوبوں کو چھوڑ کر ہانگ کانگ کے نئے عجائبات کو ڈھونڈنے باہر نکلے۔

دوپہر ساڑھے تین بج چکے تھے۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک کیفے نظر آیا۔ میں منہ اٹھائے اس میں گھس پڑا ـــــ مگر فوراً سنبھلا کیوں کہ کیفے کوئی چھوٹا موٹا چڑیا خانہ لگ رہا تھا۔ بے شمار پنجروں میں طرح طرح کی رنگ برنگی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میز کرسیاں بھی لگی تھیں اور لوگ بھی بیٹھے چائے کی پیالیاں پکڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ویٹرس کے ہیلو پر میں چوکنا ہوا۔ اس نے کنارے کی ایک سنگل ٹیبل کی طرف اشارہ کیا ـــــ میں پورے کیفے کا جائزہ لیتا ہوا کرسی پر ٹک گیا ـــــ وہی ویٹرس دوبارہ مسکراتی ہوئی نازل ہوئی۔ میں نے کہا آرڈر تو ہم بعد میں دیں گے، پہلے بتاؤ یہ کیفے ہے یا چڑیا خانہ ـــــ لڑکی ہنسنے لگی ـــــ پتہ چلا ہانگ کانگ کے چینیوں کو چڑیا پالنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے بیچ میں لقمہ دیا کہ یہ شوق تو میرے گھر والوں کو بھی ہے لیکن اس سے کیفے کا تعلق؟ اس نے بتایا کہ ہر شخص دوپہر یا شام کی چائے کے لیے چڑیا کے پنجرے کو ہاتھ میں اٹھائے گھر سے نکلتا ہے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں ـــــ اس لیے کسی بھی سڑک پر یا چائے خانے میں ایک سے زیادہ پنجرہ نظر آنا کوئی بڑی یا بری بات نہیں۔ خیر اس کیفے چڑیا گھر میں کچھ زیادہ ہی چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور اتنے ہی زور سے ان کے مالکان یا پھر عاشقان گفتگو بھی کر رہے تھے۔ اس عجیب و غریب شوق پر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ پھر خیال آیا کہ جب مغرب والے ہر جگہ کتے کے پلے کو چمٹائے گھوم سکتے ہیں تو یہ لوگ چڑیا اٹھائے کیوں نہ گھومیں۔ میں نے ایک برگر اور گرم کافی کا آرڈر دیا اور جلد از جلد اس چڑیا خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا!

اپنے نقشے کی مدد سے میں شام ہونے سے پہلے ''لائی چی لوک'' روڈ پر واقع ایک قدیم ''سنگ سلطنت'' کا تمثیلی گاؤں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے وقت کی تنگی کے سبب اشارے سے ایک ٹیکسی روکی اور مطلوبہ جگہ بتائی ـــــ ڈرائیور موڈی اور باتونی تھا۔ مگر خود کو اور ٹیکسی کو بنا سنوار کر رکھا تھا ـــــ ناتھن روڈ سے گزرتے ہوئے اس نے ایک بازار کی طرف اشارہ کیا ـــــ ہم فلائی اوور پر سے گزر رہے تھے اور بازار نیچے لگا تھا۔ ہزاروں لوگ راستے پر بچھی دکان اور دکانداروں سے ''جیڈ'' (Jade) (ایک ہلکا سبزی مائل پتھر) کی خرید و فروخت میں لگے تھے۔ صدیوں سے چینی اس پتھر کے بڑے دلدادہ ہیں۔ اور اس کے زیورات کو بڑی عقیدت سے پہنتے ہیں۔ اس پتھر کے چھوٹے چھوٹے مجسّمے، خاص کر بدھا کے مجسّمے لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ پتہ چلا یہ بازار روزانہ صبح دس بجے سے چار بجے اسی جوش و خروش سے لگتا ہے

۔ایسے فٹ پاتھ والے پتھر اور نگینے کے بازار میں نے جے پور میں دیکھے تھے۔مگر وہاں سیاح اور عام آدمی کم نگینے کے کاروباری زیادہ نظر آتے ہیں۔

دس منٹوں کے سفر کے بعد ہم بارہویں صدی کے ''سنگ سلطنت'' کے ایک دل کش اور روایتی گاؤں میں پہنچ چکے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کی الگ ہی چیز تھی۔ اب تک فلموں اور عجائب گھروں میں زمانۂ قدیم کی طرزِ زندگی اور رہائش ہم نے دیکھی تھی۔آج بارہویں صدی کے گاؤں کا زندگی سے بھرپور ماڈل پہلی بار دیکھ رہے تھے۔اس علاقہ میں داخل ہونے کے بعد سیاح خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔یعنی یہاں لوگوں کی بودوباش' لباس' عمارات' دکان' بازار' مندر اور باغات سب قدیم طرز کا تھا —— یعنی پورا گاؤں ایک نوٹنکی میں مگن تھا۔ میں سمجھتا ہوں زندگی ایک ڈراما ہے۔ یہاں اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔ ہر ایک اپنے کردار اور زمانے کو بڑے حسن وخوبی سے ادا کر رہا تھا —— ایک چبوترے پر ایک بوڑھا چینی مصور ایک شہزادے کا عکس بنانے میں محو تھا —— راستے میں ایک پرانے طرز کی بگھی بھی چلی جارہی تھی۔ کچھ فاصلے پر چند کمہار مٹی کے برتن پرانے طرز پر بنانے میں مگن تھے۔ایک خوش نویس چینی خطاطی میں مست تھا —— قریب ہی ایک مومی مجسمہ ایستادہ تھا —— مجھے یہ مومی عجائب گھر اس کی تمام صناعی کے باوجود اچھا نہ لگا۔ جب یار لوگوں نے پورے گاؤں کو زندہ کر رکھا تھا تو ان شاہی کرداروں کا سوانگ بھی دکھانا تھا۔ خیر یہ میری نوٹنکی والی رگ پھڑکی تھی یہ ضروری بھی نہیں —— ہاں اگر ایسا ہوتا تو واقعی بارہویں صدی کی سنگ سلطنت پھر سے زندہ ہوگئی ہوتی۔ سیاحوں کے لیے یہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی تھیں جن میں چینی دست کاری اور سلک قابلِ دید تھی۔ چھوٹے چھوٹے پھوس کے ڈھابے بھی چینی خوردونوش کا سامان مہیا کر رہے تھے۔ میں گھنٹہ بھر اس گاؤں میں بھٹکنے کے بعد واپسی کے لیے چل پڑا۔

شام بھیگ چلی تھی۔راستے پر بھیڑ کی وحشت کو قرار آ گیا تھا۔اب لوگ کچھ آرام سے آ جا رہے تھے ۔میں نے دو ایک سے پوچھ کر بس پکڑی اور اپنے ڈربے کی طرف روانہ ہوا۔ ناتھن روڈ پر روشنی کا سیلاب مچل رہا تھا۔کاؤلون کی ساری کشش اسی میل بھر لانبی شاہراہ پر ہے۔ ہانگ کانگ کے گورنر سر میتھیو ناتھن نے اس شاہراہ کا پلان بنایا تھا جو اس وقت لوگوں کو بڑا عجیب سا لگا تھا مگر آج تقریباً ۹۰ سال کے بعد اس شاہراہ کو ''گولڈن میل'' کہا جاتا ہے۔اس پر نفیس ترین ہوٹل اور ریستوران —— ہوش ربا یا شبینہ کلب اور دل کش شاپنگ پلازا آج ہزاروں سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ پندرہ بیس منٹوں میں ہم ایک بار پھر چن کنگ مینشن کے گیٹ پر کھڑے یہاں کے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ ٹھیلے پر دیگر لوازمات کے

علاوہ سوختہ، ٹڈی اور جھینگے بھی بک رہے تھے۔ گیٹ سے لگا ایک چینی ڈسکو بھی تھا جس کے باہر جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے پارٹنر کے انتخاب میں سرگرداں تھے۔ ایک ہنگامہ تھا جو دن رات جاری تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جتنا چست و چوبند ان میلے ٹھیلے والوں کو میں نے دیکھا تھا سارا دن دھندے پر لگے رہنے کے باوجود یہ لوگ ابھی تک ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ کم از کم ہمارے دیسی دکاندار اتنا دم خم نہیں رکھتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پلنگ پر چڑھ جانا پڑتا تھا یا پھر پھلانگتے ہوئے باتھ روم (جسے سردار جی نے شاید خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا) میں داخل ہونا پڑتا تھا کیوں کہ اس کے درمیان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے لباس تبدیل کر کے تھوڑی دیر آرام کیا۔ ٹی وی پر کوئی چینی پروگرام آرہا تھا۔ اسے زبردستی دیکھا پھر تازہ دم ہو کر باہر نکل پڑا —— اس ڈبے نما کمرے سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ پندرہویں منزل پر کسی انڈین ریستوران ''دہلی دربار'' کا اشتہار میں نے گیٹ پر دیکھا تھا۔ میں نے اس وقت باہر جانے کی بجائے دہلی دربار کا رخ کیا۔ ریستوران چھوٹا مگر برا نہ تھا۔ ویٹر کو تندوری چکن کا آرڈر دے کر میں ہال کا معائنہ کرنے لگا۔ زیادہ تر دیسی کاروباری لوگ تھے۔ چند ٹورسٹ فیملی بھی کھانے میں مگن تھی۔ ڈنر سے فارغ ہو کر میں نیچے ٹہلنے کی غرض سے آ گیا —— شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے بس پکڑی اور ٹیمپل اسٹریٹ چل پڑا۔

ٹیمپل اسٹریٹ اور جارڈن روڈ کی چورنگی پر ایک بہت بڑا میلہ روزانہ رات نو بجے کے بعد لگتا ہے جس میں دنیا بھر کی سستی چیزیں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی بھانت بھانت کے مقامی آرٹسٹ اپنے ساز کے ساتھ سڑکی پروگرام پیش کرتے ہیں۔ دونوں اطراف بازار کے ساتھ جگہ جگہ گانے والے اور والیاں —— جادو کے کرتب دکھاتے جادوگر اور چینی سوانگ کھیلتے کہنہ مشق اداکار' بجلی گراتی رقاصائیں اور بیئر بیچتے لڑکھڑاتے نوجوان ساتھ ہی طرح طرح کی بدبو اور خوشبو سے ملے جلے خوانچے —— ان سب سے پرے ہر دس قدم پر جیوتشی اپنے تاش کے پتوں اور لوبان کے دھوئیں میں قسمت کا حال سمجھاتے' نادان لوگوں کو ان کی من چاہی مراد بتاتے' بھاری رقمیں وصول کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کم از کم دس ہزار لوگ مقامی اور سیاح بڑے جوش و خروش کے ساتھ محوِ خرام تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی سالانہ نمائش ہے مگر یہ اس میلے کے روز کا معمول تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے میں کرتب دکھاتے فنکار ایک ہیٹ کو تماش بینوں کے آگے سے گزار دیتے ہیں اور پیسہ پیسہ کر کے انھیں خاصی بخشش مل جاتی ہے۔ اس میلے کو "Poor Man's Night Club" کہا جاتا ہے۔ غرض اس بھیڑ بھاڑ' چیخ و پکار اور گانے بجانے سے کئی گھنٹہ میں لطف اندوز ہوتا رہا —— چینی سوانگ میرے پلے نہیں پڑا مگر ان کی دل خراش آواز اور مکالمے سمع

خراج تھے۔ اداکاری ان کی بے شک منجھی ہوئی تھی ۔ جب ڈراما روز رات کرنا پڑے تو عادت (اور پرفیکشن) ہو ہی جاتی ہے۔ یہاں چند رقاصائیں غضب کا ناچ رہی تھیں۔ پتہ نہیں یہ لوگ پروفیشنل گروپ کے ساتھ تھیٹر میں کیوں نہیں شامل ہو جاتے —— کیا پتہ یہاں بھی آرٹسٹوں کی زندگی صبر طلب اور مقابلہ سخت ہو۔ یہ فن کار ہر جگہ کیوں پریشان رہتا ہے؟ یا پھر جب پریشان نہیں رہتا' دوسروں کو پریشان کیوں کرنے لگتا ہے؟

رات گیارہ بجے میں کمرے میں پہنچا۔ دن بھر کی گردش سے تھک چکا تھا' پڑتے ہی سو گیا۔ ابھی گھنٹہ بھر بھی نہ سویا ہوگا کہ ایسا لگا جیسے کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میری آنکھ کھل ہی رہی تھی کہ کمرے کی بتی جل گئی اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میرے سامنے ایک لمبا تڑنگا پٹھان' کاندھے پر ایک چرمراسا بیگ ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے اور کیوں میرے منہ سے نکلا ''السلام علیکم خان صاحب —— آپ......'' پٹھان غصے میں وعلیکم بولتا پاؤں پٹختا باہر نکل گیا —— میں ابھی پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ پٹھان مینیجر کو لیے دوبارہ کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ دونوں میں خوب زوروں کی بحث ہو رہی تھی ۔ پتہ چلا کہ پٹھان صبح چابی اس لیے لے گیا تھا کہ اسے واپس آنا تھا۔ مینیجر کہہ رہا تھا کہ تم نے آج رات کا کرایہ نہیں دیا اس لیے کمرہ دوسرے کو دے دیا۔ پٹھان نہ صرف مینیجر کو بڑی تندرست گالیاں دے رہا تھا بلکہ چیلنج بھی کر رہا تھا کہ ''بلاؤ پولس کو بلاؤ ہم بھی دیکھے گا'' پھر اس نے میری طرف گھوم کر کہا: ''خوچے یہ ہمارا داڑھی والا بھائی اسے اس لیے چھوڑ دیا' نہیں تو خدا کی قسم اس کو بھی مارتا تھا۔'' میں سارا تماشہ ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مینیجر نے پٹھان کو قابو میں کیا۔ وہ تو کہیے ایک کمرہ خالی تھا ورنہ شاید مجھے ہی بستر چھوڑنا پڑتا —— میں سردار جی پر لعنت بھیجتا دوبارہ بستر پر دراز ہوا۔ نیند غائب ہو چکی تھی اور خواہ مخواہ ہنسی آ رہی تھی۔ ساتھ ہی کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کروٹ بدلتے بڑی کوششوں سے نیند آئی تھی کہ لگا پھر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس بار مجھے سردی میں پسینہ آ گیا۔ میں نے اونچی آواز میں پوچھا —— کون؟ —— ''اوئے برادر کھولو دروازہ' ہم سلطنت خاں ہے' تم سے معافی مانگنے آیا ہے!'' میں نے دروازہ کھولا۔ پٹھان دروازے پر کچھ شرمسار سا کھڑا تھا —— ''ہم کو عشاء کا دیری ہوتا تھا' پہلے نماز ختم کیا پھر دعا کر کے تم سے معافی مانگنے آیا' تم تو ہمارا داڑھی والا برادر ہے' ہم بے کار میں تمہارا نیند میں خلل کیا —— تم اب سو جاؤ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پٹھان کو شب بخیر کہا اور دوبارہ لیٹ کر سوچنے لگا کہ ہانگ کانگ کی مادی زندگی اور مشینی بھاگ دوڑ میں یہ سلطنت خاں کیا کرنے آ گیا۔ کافی دیر میں اس

گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر یہ سوچ کر سو گیا کہ اس بار پٹھان سے سامنا ہوا تو یہ سوال کروں گا کہ مجاہدین کی صف چھوڑ کر وہ اس جزیرے پر کیا کر رہا ہے؟ ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مہمان نوازی ختم، کل کوئی اور مسکن ڈھونڈا جائے گا ـــــ آخر ہم ٹھہرے آوارہ گرد ـــــ ایک ٹھکانے پر کب تک؟

☆☆☆

ذکر کچھ کوچہ و بازار کے ہنگاموں کا!

سردار کرم جیت سنگھ کے ٹیپ ریکارڈر پر صبح صبح گربانی کا کیسٹ پوری ترنگ میں بج رہا تھا اور سونے والوں کے لیے الارم کلاک کا کام بھی کر رہا تھا۔ میں بھی کچی نیند سے آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ رات سلطنت خاں کی بات یاد آتے ہی مجھے خود پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی۔ ''میں کہاں سے یہ کہاں آ پہنچا'' گنگناتا ہوا میں باتھ روم میں گھس گیا کہ آج باہر جانے سے پہلے دوسرا کمرہ ڈھونڈنا تھا۔

مدراس اکسپریس کیفے میں مسالہ ڈوسا کا ناشتہ کرتے ہوئے میں تیسری منزل کے بازار کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ صبح ساڑھے سات بجے تھے، دکانیں ابھی ساری کھلی نہیں تھیں۔ مگر ریستوراں اور کیفے پوری طرح مصروف تھے، ۶۱ رڈالر کا بل دیتے ہوئے میں نے کیشئر سے کمرے کے بارے میں پوچھا ہی تھا کہ بندے نے ایک لڑکے کو آواز دیا ''سوامی ناتھن صاحب کو اوپر لے جاؤ۔'' میں نے پوچھا یار کمرہ ہے کتنے کا ؟'' کیا ہے، آپ اسّی ڈالر دے دو۔'' مجھے لگا اس گیسٹ ہاؤس والے دھندے میں کوئی فکسڈ ریٹ نہیں تھا ۔خیر راما شیٹی کے مدارس سینٹر میں مجھے کمرہ مل گیا۔

آج میں ہانک کانگ دیکھنے کے موڈ میں جلدی نکلا تھا۔ کاؤلون سے ہانگ کانگ کے لیے اسٹیمر چل رہے تھے مگر زمین دوز ریل بھی سمندر کی تہہ میں ایک سرنگ سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسٹیمر سے جانے کا پروگرام بنایا۔ کچھ ہی فاصلے پر ''اسٹار فری'' تھی۔ موسم کچھ خنک تھا پھر بھی میں چل پڑا۔ اسٹار فری سے ہر دس منٹ پر اسٹیمر مختلف مقامات کے لیے جا رہے تھے۔ ایک قطار ٹکٹ کی لگی تھی۔ میرا نمبر آیا۔ کاؤنٹر کی لڑکی نے پوچھا۔ فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس؟ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ ایک ڈالر کا فرسٹ کلاس ٹکٹ لے کر میں جب اسٹیمر کے نچلے حصے میں داخل ہوا تو خیال آیا انگریز جہاں گئے اپنی کارستانی اور اونچ نیچ ساتھ لے گئے۔ سمندر کی صاف مگر خنک ہوا چہرے میں چبھ رہی تھی۔ اس جزیرے سے سامنے والے جزیرے کا سفر مشکل سے دس منٹ کا تھا۔ اس طرف سے ہانگ کانگ کی اسکائی لائن قابلِ دید تھی۔ دھند میں لپٹی فلک بوس عمارتیں اور پہاڑیاں بڑی جاذبِ نظر تھیں۔ تقریباً ہر سیاح اس خوبصورت منظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر رہا تھا۔ میں نے بھی کئی تصویریں مختلف اینگل سے اتاریں۔ خاص کر سمندر کی لہروں سے کھیلتے بادبانی جہاز اور پس منظر میں فلک بوس عمارتیں اس منظر کو اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم ہانگ کانگ کے جزیرے پر لنگر انداز ہوئے۔ سینکڑوں لوگ پہلے سے ہی کاؤلون جانے کے لیے اس اسٹیمر کے انتظار میں قطار سے لگے تھے۔ فرسٹ کلاس سے پہلے سیکنڈ کلاس کو موقع دیا گیا۔

کارخندار، مزدور، مچھیرے، طالب علم،کلرک یعنی مڈل کلاس کے لوگ دھکم پیل کرتے باہر کو ابل پڑے۔ پھر فرسٹ کلاس کے شرفا سوٹ میں ملبوس کاروباری، انگریز سیاح، بینکر اور فیشن ایبل لڑکیاں خود کو لیے دیے بڑے ناز و انداز سے باہر نکلیں' گویا روزانہ پسنجر نہیں کوئن ایلزبیتھ جہاز کے مسافر لندن کی بندرگاہ سے اتر رہے ہوں۔ میں نے باہر نکلتے فیصلہ کیا کہ واپسی سیکنڈ کلاس سے ہوگی! اس طرح ہم نہ صرف کھلے عرشے پر ہوں گے بلکہ باہر بھی جلد نکل سکیں گے۔

ہانگ کانگ ہاربر سے باہر نکلتے ہی صاف سمندری ہوا اچانک غائب ہوگئی۔ سامنے شہر کی پُرشکوہ عمارتیں ایک سے بڑھ کر ایک قدم قدم پر راستہ روک رہی تھیں۔ بندرگاہ کے باہر ہاتھ رکشہ پر نظر پڑتے ہی میں رک گیا۔ برٹش راج کی یہ لعنت آج تک کلکتہ میں جونک کی طرح' شہر کا خواب لے کر آنے والے غریب لوگوں کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ جسے کوئی کام نہیں ملتا وہ رکشہ کھینچنے لگتا ہے۔ ہانگ کانگ میں اب یہ سواری عام تو نہیں مگر تفریحی سواری ضرور ہے۔ بیشتر سیاح کچھ دیر کے لیے سواری کرتے ہیں۔ زیادہ تر رکشے پر بیٹھ کر تصویر اترواتے ہیں جس کے لیے ہر رکشہ والا ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ صاحب بہادر چند ڈالر بخشش ضرور عطا کرے گا۔ میں رکشہ اور اس کے مریل مالک کو دیکھ رہا تھا کہ ایک چمچماتی ہوئی کالی رولس رائس سامنے سے گزری جس پر لہراتا یونین جیک کا پرچم انگریزوں کی تاریخ دہرا رہا تھا۔

ہانگ کانگ کو''خوشبوؤں کی بندرگاہ'' کہا جاتا ہے۔۴۰۰/اسکوائر میل پر پھیلے ان جزیروں کی آبادی ساٹھ لاکھ سے کچھ اوپر ہو چکی ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھ کے قریب لوگ بندرگاہوں پر کشتیوں میں رہ رہے ہیں۔ پانی پر ڈولتی ہوئی اس آبادی نے مرنا، جینا، بچے کی پیدائش، کاروبار، نوکری، گرمی، سردی، تہوار، بچے، بوڑھے، کتے، بلی اور پالتو چڑیوں کے ساتھ زندہ اور خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔ ایک طرف ہانگ کانگ کے وہ رئیس بھی ہیں جو نفیس ترین ''اوشن ویو مینشن'' میں رہتے ہیں اور اپنی لیموزین گاڑیوں کی لائسنس پلیٹ نمبر کے لیے حکومت کی نیلامی میں منہ مانگی بولی لگا کر لاکھوں ڈالروں میں ''خوش قسمت نمبر'' حاصل کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ کے رئیس اور کاروباری انتہا پسند اور وہمی ہیں۔ کاؤلون کی سڑکوں کی طرح یہاں ۲۴/گھنٹے والا تماشہ جاری تھا۔ سڑک کے کنارے ٹھیلے پر دنیا بھر کے لوازمات بک رہے تھے۔ خوانچے والے بھی مصروف تھے۔ ایک کنارے پل کے نیچے ایک حجام بھی اپنی قینچی چلا رہا تھا۔ ایک فٹ پاتھ چھاپ پہلوان نما ڈاکٹر ہڈی' پٹھا اور جوڑ کے درد کا نسخہ بتا رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک مظلوم کی کہنی بٹھانے میں اس کی جان نکالے دے رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مالشیہ چینی مساج کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے

ایک بوڑھے کی چمپی بھی کر رہا تھا۔ ایک قصہ گو اپنی درد بھری آواز میں کوئی آپ بیتی یا جگ بیتی سنا رہا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بے پناہ بھیڑ اور بھاگ دوڑ میں بھی لوگ اپنے اپنے مطلب کی جگہ کچھ دیر کو رک کر اور تماشہ دیکھ کر پھر بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ میں ایک فلائی اوور پر ٹکا یہ سب گورکھ دھندا دیکھ رہا تھا۔ ان جزیروں کی آبادی میں ۸۹ ر فی صد چینی ہیں۔ ۲ ر فیصد ملے جلے ہندستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، سری لنکن وغیرہ ہیں۔ سڑک پر عموماً چینی نظر آتے ہیں یا پھر سیاح۔ دیسی اپنے ٹھیئے سے لگا کسی کونے میں ڈالر جمع کرنے کے طریقے پر غور کرتا نظر آتا ہے یا پھر غیر قانونی طور پر رہتے ہوئے کسی ریستوران میں پلیٹ اٹھاتا نظر آتا ہے۔

میں ٹہلتا ہوا سینٹرل اسٹیچو اسکوائر کی طرف نکل گیا۔ ایک گرجا کے سامنے تقریباً پانچ سو جوان لڑکیاں اور عورتیں زرق برق لباس میں خوش گپیوں میں مصروف نظر آئیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیا یہ گرجا گھر صرف عورتوں کا ہے۔ معلوم ہوا ہر اتوار کی صبح یہاں فلپینی اماں یا آیا لڑکیوں کا شاندار اجتماع ہوتا ہے۔ ایک رسم کے مطابق یہ عورتیں یہاں جمع ہو کر گرجا جانے سے پہلے اور بعد میں ایک دوسرے کی خیریت، گاؤں کی خبر اور دوست احباب کی مزاج پرسی کر لیتی ہیں۔ یہ منظر لندن کے ٹرفل گر اسکوائر کی یاد دلا رہا تھا جہاں کبوتر جمع ہو کر غٹر غوں کیا کرتے ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ صرف اچھے صاف ستھرے ملبوسات زیب تن کیے تھیں بلکہ خوش بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہانگ کانگ حکومت کی طرف سے طے کی ہوئی کم از کم تنخواہ کے مطابق انھیں تین چار ہزار روپیہ ماہانہ مل جاتا ہے جو فلپائن میں ایک اسکول ٹیچر یا نرس کی تنخواہ ہوتی ہے۔ اتنے پیسے سے آیا لوگ اپنے گاؤں والوں کو بھی کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہیں۔ ایشیا میں بے ہنر کام کرنے والوں نے برٹش راج کے زمانے میں ہجرت کرنا شروع کیا تھا۔ ایک زمانے میں سینکڑوں ہندستانی اور چینی مختلف کام کاج کی تلاش میں برطانیہ کی نوآبادکالونی میں منتقل ہوئے تھے۔ برٹش راج کے بعد امریکن گرین کارڈ کا زمانہ آیا۔ پھر عربوں کے پیٹرو ڈالر نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کے بعد کینیڈا اور آسٹریلیا توجہ کا مرکز بنے۔ آج کل جاپانی ین جوانوں کا منظورِ نظر ہے۔ امیگریشن کی تمام سختیوں کے باوجود ہانگ کانگ میں کوئی ۳۰ ہزار فلپینو نوکر چاکر کام کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب فلپائن کے اپر کلاس رئیس اپنے گھروں کے لیے آیا اور نوکر ہانگ کانگ سے درآمد کرتے تھے۔ یہ بہت پرانی نہیں ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ وقت کتنی جلدی کیسے رنگ بدلتا ہے۔

سنٹرل ہانگ کانگ کانکریٹ کا جنگل ہے۔ ہر جگہ فلائی اوور، ریلنگ لگے فٹ پاتھ، زمین دوز راستے اور اوپر کو چڑھتی سیڑھیاں جو عموماً پہاڑی علاقوں میں نظر آتی ہیں۔ ان سب کوششوں کے باوجود

لوگوں کا اژدہام اپنے اپنے طریقے سے جلد از جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا چاہتا ہے۔

ٹیکسی، بس، منی بس، زمین دوز ریل، رکشہ اور اسٹیمر لانچ کے علاوہ ایک قدیم سواری ''ٹرام'' آج بھی روزانہ ہانگ کانگ کے مسافروں کے استعمال میں ہے۔ کلکتہ، سان فرانسسکو اور ٹورانٹو میں تو ہم نے سنگل ٹرام دیکھی تھی۔ یہاں دو منزلہ ٹرام چل رہی تھی۔ ایک مخصوص رنگ کی ٹرام اپنی پیشانی اور پیٹھ پر رنگ برنگی اشتہار سجائے ہر علاقے کے لیے کھڑ کھڑاتی بھیڑ میں رینگ رہی تھی۔ شاید ۱۹۰۴ء میں برٹش سرکار نے ہانگ کانگ میں ٹرام کار کی شروعات کی تھی۔ اس زمانے میں لوگ حیرت سے اس بجلی سے رینگنے والی سواری کو دیکھتے تھے۔ لوگ آج بھی اسے حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اس جیٹ سیٹ دور میں ایسی رینگنے والی سواری کیوں راستہ جام کر رہی ہے۔ مگر ٹرام جس قدر مقبول مقامی لوگوں میں ہے اسی قدر پسندیدہ سیاحوں میں ہے۔ ہانگ کانگ کی سیر کے لیے میں بھی ایک ٹرام پر سوار ہو گیا۔ ۸۰ سینٹ کا ٹکٹ لے کر میں اوپر کی منزل پر چلا گیا اور سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسی طرح مجھے راستے کے تماشے کے علاوہ پہلی منزل کے فلیٹ میں ہونے والے دھندے بھی نظر آنے لگے۔ ہانگ کانگ کا تقریباً ہر فلیٹ ایک چھوٹا موٹا کارخانہ ہے۔ کوئی بسکٹ، مسالے اور اناج کے پیکٹ بنا رہا تھا۔ کوئی نقلی گھڑی، نقلی کیسٹ، چھتری اور نقلی زیورات کو خوبصورت ڈبوں میں اور کیس میں لگا رہا تھا۔ غرض جدھر دیکھو کاروبار کی فضا گرم تھی۔ ہر کوئی مصروف ہر ایک مگن۔ ہر ایک مکان اور ہر ایک کھڑکی پر فینگ شوئی کا شیشہ بھی چمک رہا تھا۔ چینی عموماً توہم پرست ہوتے ہیں۔ قسمت کا حال جاننے کے لیے ہر مقامی بے تاب رہتا ہے۔ اسی لیے جیوتشی اور فال نکالنے والوں کی چاندی رہتی ہے۔ مادی اور مشینی تگ و دو نے جہاں ہانگ کانگ والوں کو بڑا محنتی اور پروفیشنل بنا دیا ہے وہیں ڈالر کی للک نے انھیں قسمت آزمائی کے لیے جوا اور قمار بازی میں یکتا کر دیا ہے۔ تاش، ماہ جونگ، لاٹری اور ریس کی جولت میں ہانگ کانگ میں ہر خاص و عام دیکھی کہیں اور مشکل ہے۔ یہاں کنٹونیز مقامی زبان ہے مگر انگریزی عام طور پر بولی جاتی ہے۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہانگ کانگ میں تقریباً سو اخبارات چینی زبان کے اور چار انگریزی کے شائع ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کس قدر تعلیم یافتہ قوم ہے۔

ہم یہاں کے کوچۂ و بازار کے ہنگاموں میں یہ بھول ہی گئے کہ آج مجھے کچھ لوگوں سے ملاقات بھی کرنی ہے۔ میں ایک اسٹاپ پر ٹرام سے اتر پڑا اور نقشے کی مدد سے فلپ روڈ کی طرف چل پڑا۔ کچھ دور جا کر راستہ ایک پُر پیچ چڑھائی سے اوپر جا رہا تھا۔ کافی دیر چلنے کے بعد میں ایک مکان کے سامنے ستانے کو رکا۔ چڑھائی کافی تھی اور میں کچھ تھک سا گیا تھا۔ میں اپنے اسکول کے ساتھی ٹونی سے ملنے

جارہا تھا جو ہانگ کانگ میں ڈیرہ ڈال کر کپڑوں کے کاروبار اور ایکسپورٹ میں مصروف تھا۔ میں نے پہلے فون سے اپنے آنے کی اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ قریبی فون بوتھ سے نمبر ملایا۔ میری آواز سن کر ٹونی خوشی کے مارے چیخ اٹھا۔ گو میں اس کے فلیٹ اور فیکٹری سے تھوڑی دور ہی تھا مگر وہ بضد تھا کہ میں اسی جگہ انتظار کروں۔ وہ گاڑی لے کر پہنچ رہا ہے۔ اتنی دیر میں ایک اسٹور میں لگی گھڑیاں دیکھنے لگ گیا۔ دس ڈالر سے لے کر دس ہزار ڈالر تک کی گھڑیاں شوکیس میں سجی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ٹونی پھلوانی صاحب گہرے کائی سوٹ میں مسکراتے ہوئے آئے اور کچھ دیر مجھ سے بغل گیر رہے۔ آج کوئی پندرہ برسوں بعد ہم لوگ ملے تھے۔ مگر دونوں کو دیگر دوستوں سے ایک دوسرے کی خیر خبر ملتی رہتی تھی۔ ٹونی بڑے جوش میں تھے۔ کہنے لگے چلو پہلے ''ڈم سم'' ہو جائے۔ جس طرح شمالی امریکہ میں ''برنچ'' کی وبا عام ہے، ہانگ کانگ میں بھی ناشتہ اور دوپہر کے کھانے کو ملا کر ڈم سم رائج کر لیا گیا ہے۔ کوئن اسٹریٹ سنٹرل پر ایک ''لک یوٹی ہاؤس اینڈ ریستوران'' تھا۔ ہم لوگ اس میں داخل ہوئے۔ بھیڑ خاصی تھی۔ ہم لوگوں کو ایک ٹیبل بالکل بیچ میں ملی۔ ہر طرف خوش اخلاق مسکراتی ہوئی ویٹرس ایک چھوٹی ٹرالی پر ہر رنگ اور وضع کے پکوان سجائے آواز لگا رہی تھیں اور ایک ٹیبل سے دوسری پر گشت کر رہی تھیں۔ بیٹھتے ہی ہمارے سامنے چینی چائے کی کیتلی اور چھوٹے فنجان رکھ دیے گئے۔ ہمیشہ کی طرح نہ چاہتے ہوئے میں نے رسماً سادی چائے زہر مار کی۔ کچھ ہی دیر میں ایک ٹرالی ہمارے سامنے رکی۔ ویٹرس سے ٹونی کینٹونیز میں گفتگو کرنے لگا۔ بانس کی مختلف ٹوکریوں میں طرح طرح کے پکوڑے، چینی کوفتے، اسپرنگ رول اور تلی ہوئی مچھلی کے قتلے کا میں معائنہ کرنے لگا۔ ''ڈم سم'' کھانے میں خاص آرڈر دینے کی بجائے ہر پھیری پر ٹرالی سے اپنی پسند کی چیز حاصل کر لی جاتی ہے۔ مجھے کلکتے کی بنگالی دعوت یاد آ گئی جس میں برہمن ہر پھیری پر مہمان کے آگے بچھے کیلے کے پتے پر کچھ رکھ جاتا ہے۔ ایسی دعوتوں میں بچپن میں ہم نمکین سے زیادہ میٹھے کی پھیری پر زور دیتے تھے۔ ہائے! وہ رس گلے اور چم چم —— ٹونی کے ٹوکنے پر میں واپس ڈم سم کی ٹرالی کی طرف متوجہ ہوا۔ ہم لوگوں نے دو تین طرح کے پکوڑے، چند اسپرنگ رول اور سمندری قتلے لیے اور کھانے سے زیادہ باتوں میں لگے رہے۔ کھانا کوئی بہت خاص نہ تھا مگر یہ اسٹائل اور ماحول مجھے اچھا لگا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کس نے کیا کھایا۔ معلوم ہوا کہ ویٹرس خالی پلیٹ گن کر بل بناتی ہے۔ ''ڈم سم'' سے فارغ ہو کر ٹونی مجھے اپنے کارخانے کی سیر کرانا چاہتا تھا۔ ٹونی نے ہانگ کانگ آ کر کسی بھی محنتی سندھی کی طرح خاصی ترقی کی تھی۔

مجھے خوشی تھی کہ دولت نے اس کی خوش مزاجی نہیں چھینی تھی۔ میرے خیال میں سندھی جو انڈیا میں

ہیں اور باہر نکلے ہیں، بہت خوش مزاج اور بڑے محنتی ہیں۔ شاید یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ ہمارے عام کاروباریوں کی طرح بدمزاج اور کاہل نہیں ہیں۔

ٹونی کی گارمنٹ فیکٹری بہت بڑی نہ تھی مگر ۵۰ ورکر ڈبل شفٹ کام کر رہے تھے۔ بندہ انچی ٹیپ لیے بضد تھا کہ میں اپنے سوٹ کا ناپ دے دوں۔ میرے سنجیدگی سے منع کرنے پر بھی وہ کہنے لگا۔ اچھا مجھ سے نہیں بنواتے نہ بنواؤ، مگر یہاں سلوانا ضرور —— معلوم ہوا سو امریکی ڈالر میں ۴ اچھے سوٹ تیار ہوسکتے ہیں۔ میں خود یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہانگ کانگ وغیرہ میں کپڑے اس قدر سستے کیسے ہیں؟ پتہ چلا آدھی آبادی درزی کے کام میں مست ہے۔ گھر گھر کپڑا اسلائی ہوتا ہے۔ سلائی سستی ہے تو لباس بھی سستا ہے اور سوٹ ۲۴ گھنٹے میں تیار ہوجاتا ہے۔ مگر ان تمام وجوہات کے باوجود سمجھ میں نہیں آیا کہ سو ڈالر میں چار سوٹ کیوں کر ممکن ہے جب کہ ہم ٹورانٹو میں سیل کے انتظار میں رہتے ہیں۔ سیل پر بھی ایک سوٹ ایک سو ننانوے ڈالر سے کم نہیں۔ اسے بھی ہم ٹھونک بجا کر، پہن کر اور سیلز گرل سے آدھ گھنٹے راہ و رسم بڑھانے کے بعد خریدتے ہیں۔ مگر جو مزہ ایک اسٹور سے دوسرے اسٹور بھٹک کر اور سیل کی تاک میں رہ کر اور نئی دوستیاں گانٹھ کر سوٹ خریدنے میں ہے وہ ایک جھٹکے میں چار سوٹ سو ڈالر میں خریدنے میں کہاں —— اس لیے تمام کوششوں کے باوجود ہم چار سوٹ نہ خرید سکے۔

ٹونی کامیاب اور مصروف زندگی گزارنے کے باوجود ہانگ کانگ کے مستقبل سے مطمئن نہ تھا اور اپنے مالِ غنیمت سمیت نیویارک منتقل ہونا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے سنجیدہ مشورہ مانگا تو میں نے بتایا کہ اس کی پوزیشن عام مہاجر سے بہت بہتر ہے اور وہ چوں کہ ڈالر کے عوض شمالی امریکہ کی شہریت حاصل کر رہا ہے تو مناسب یہ ہوگا کہ وہ کینیڈا کے بارے میں سوچے۔ کچھ دیر ہانگ کانگ میں ۱۹۹۷ء کے بعد کیا ہوگا، اس پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا پھر میں نے اسے ''چن کنگ مینشن'' کے قصے سنائے —— ہانگ کانگ کے بلڈروں نے لگتا تھا مکان کھڑا کرنے میں زمین کا کوئی چپہ نہ چھوڑا تھا۔ جسے جہاں تھوڑی سی جگہ خالی ملی تھی، ماچس کی ڈبیہ کی طرح چپٹی فلک بوس عمارت کھڑی کر دی گئی تھی۔ جگہ جگہ پہاڑیوں کو کاٹ کر نفیس ترین کانڈومینیم بھی کھڑی کر دی گئی تھی۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اب پرانی عمارتوں کو گرا کر نئی عمارتیں تیار ہو رہی تھیں۔ دنیا کی سب سے مہنگی بینک کی عمارت ''ہانگ کانگ شنگھائی بینک'' بھی یہیں موجود ہے اور ''بینک آف چائنا'' کی عمارت ہانگ کانگ کی سب سے اونچی عمارت بتائی جاتی ہے۔ فلک بوس عمارتوں میں نیویارک کے بعد ہانگ کانگ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں کے مقابلے میں ٹورانٹو کی اسکائی لائن بہت سادہ ہے۔ یہ سادگی

پرسکون بھی ہے۔مگر دیکھیے کب تک۔ٹورانٹو کی آبادی میں ہانگ کانگ کے رئیس مہاجر جس تیزی سے منتقل ہورہے ہیں بہت جلد یہاں بھی سانس لینے کو کھلی فضا نہ ہوگی۔

ٹونی نے اچانک پروگرام بنایا کہ ''چلو آج تمھیں ٹائیگر بام گارڈن لے چلیں۔''میں ٹائیگر بام کے نام اور استعمال سے خوب واقف تھا مگر اس گارڈن کا مجھے علم نہ تھا۔ہم ایک بس سے روانہ ہوئے۔راستے میں ''سٹی ہال'' پر نظر پڑی۔معلوم ہوا ہانگ کانگ کے سٹی ہال میں سیاست دانوں کا جمگھٹا نہیں رہتا۔ حکومت کے دفاتر شہر کے مختلف گوشوں میں آباد ہیں۔سٹی ہال تو ایک جدید کلچرل سینٹر ہے۔اس میں ''ہانگ کانگ میوزیم آف فائن آرٹس'' ہے۔ساتھ ہی ایک مرقع لائبریری ہے جہاں ساری دنیا کا ادب محفوظ ہے۔اس سے متصل ایک ''کانسرٹ ہال'' ہے جس میں ۱۵۰۰ نشستیں ہیں۔اس پورے علاقے میں چارٹر گارڈن اور اسٹیچو اسکوائر کے علاوہ ہر سو جنگلی گھاس یا مشروم کی طرح فلک بوس عمارتوں کا جال پھیلا تھا۔ایک بات غور طلب تھی کہ نئی تعمیرات میں آج بھی یہاں تمام میکانیکل ترقی کے باوجود پچاس منزلہ عمارت کے لیے بانس باندھ باندھ کر مزدور اوپر نیچے کر رہے تھے۔کوئی مشینی لفٹ استعمال میں نہ تھی ۔میں اس منظر کو دیکھ کر کچھ گھبرایا مگر امریکی سیاح ان مزدوروں کی ہر زاویے سے تصویریں اتار رہے تھے ۔ہانگ کانگ کے مزدور اور معمار نہ صرف اپنے قدیم مشرقی طریقے سے مطمئن تھے بلکہ اس پُر خطر طریقے پر بغیر کسی حفاظتی اقدام کے پچاس منزلہ یا اس سے اونچائی پر چل کر اپنی مردانگی کا مظاہرہ بھی کر رہے تھے جو بے حد خطرناک ہے اور ہر سال کم از کم سو مزدور ضرور اس جھوٹی نمائش کی نذر ہو جاتے ہیں ۔شمالی امریکہ میں حکومت کی طرف سے ایسا کام یا نمائش غیر قانونی ہے مگر ہانگ کانگ اپنے سر پھرے جیالوں پر ناز کرتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں ''ٹائیگر بام گارڈن'' مرحوم ''آبون ہا'' نے بنوایا بلکہ سجایا تھا۔جو سر کے درد کا مشہور زمانہ ٹائیگر بام کے کاروبار سے لکھ پتی بن گیا تھا۔مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہ بام شیر کی چربی سے تیار ہوتا ہے مگر پتہ چلا کہ اس میں تیزی لونگ کے تیل کی ہے۔اس باغ میں چینی دیو مالائی قصوں کو قد آدم مجسّموں میں ڈھالا گیا ہے۔باغ میں جگہ جگہ رنگ برنگی مجسّموں کے سامنے بے شمار بچے اور بوڑھے تصویریں اتروا رہے تھے۔یہ باغ بچوں میں جتنا مقبول ہے اتنا ہی عمر دراز اسے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ہر کوئی اپنے بچوں کو ان مجسّموں، ڈراگون، شیر، پری اور دیو وغیرہ کے قصے سنا رہا تھا۔ایک مقام پر آئندہ زندگی کی منظر کشی بھی کی گئی تھی۔ٹونی صاحب نے ڈراگون کے پس منظر میں میری اس زندگی کا عکس محفوظ کر لیا۔اس باغ میں چند بڑے خوبصورت اور منقش پگوڈا بھی تھے۔ان کے قریب ہی بدھا گیان دھیان میں مست تھا

۔کچھ ہی دیر میں شام ہوگئی اور ہم لوگ وہاں سے نکل پڑے۔

ٹونی نے راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر ایک معبد دکھایا۔معلوم ہوا یہ ہانگ کانگ کا سب سے قدیم معبد ''من موٗ'' ہے۔لوبان کے دھوئیں میں عقیدت مند آنکھیں بند کیے اپنے خیالوں اور مرادوں میں گم تھے۔کچھ لڑکیاں موم بتیاں جلا رہی تھیں۔سونے کی پتر منڈھی ایک پالکی اندر رکھی تھی۔ٹونی نے بتایا کہ تہوار کے موقعوں پر بدھا صاحب کے مجسّمے کو آس پاس کے علاقوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔نیکی کے دیوتاؤں کے علاقے سے ہوتے ہوئے ٹونی ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا جس کے برقی بورڈ اور نیون سائن کے پڑھنے کے لیے چینی زبان کا جاننا ضروری نہ تھا۔یہاں سے گزرتے ہوئے ہر کوئی بتا سکتا ہے کہ یہاں دنیا کا سب سے قدیم پیشہ اپنی تمام تر کثافت ، کشش اور ضرورت کے ساتھ زندہ ہے۔یہ گناہوں کے دیوتاؤں کا علاقہ ''وانچائی'' تھا۔۱۹۶۰ء میں امریکی سپاہی ویت نام کی خوں ریزی سے بچ کر یہاں اپنی تھکن اتارا کرتے تھے۔امریکیوں نے بھی جنگ کے میدان سے لے کر چکلے تک کسی کو نہ بخشا تھا مگر اب یہاں کی تیرہ شبی کو چیر کر نئے فلک بوس آفس کامپلکس صبحِ نو کی نوید دے رہا ہے اور یہ کوٹھیاں رفتہ رفتہ کہیں اور منتقل ہو رہی ہیں۔شاید یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گردش ہے۔

ٹونی نے ہنستے ہوئے ایک بیئر کے اشتہار کی طرف اشارہ کیا جس پر پندرہ ڈالر فی گلاس لکھا تھا۔ میں نے پوچھا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔معلوم ہوا گلاس پندرہ ڈالر کا ہے مگر اسے پیش کرنے والا ساقی سیاح سے ۱۰۰رڈالر تک اپنی مسکراہٹ کا بھی وصول کرتا ہے۔میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔چھوڑو یار' ہر کوئی اپنی قسمت کا کھاتا ہے' میں نے لقمہ دیا! ٹونی نے اچانک جوشیلا فیصلہ کیا کہ ''ٹاک آف دی ٹاؤن'' ڈسکو چلتے ہیں۔ساتھ ہی کچھ ''یم سنگ'' بھی ہو جائے آج! اس سے پہلے کہ میں پوچھتا اس نے خود ہی بتایا کہ ''ڈم سم'' کی طرح ہانگ کانگ میں ''یم سنگ'' یعنی رات ایک کلب سے دوسرے کلب ڈسکو پھیری لگانا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔دو چار گھنٹے بھٹک کر' ڈانس سے تھک کر کسی پرسکون ریستوران میں کھانا کھاتے ہیں ۔میں نے بڑی متانت سے بتایا کہ شہزادے اب ہماری طبیعت میں ٹھہراؤ سا آتا جا رہا ہے' کیوں مجھے بھٹکاتے ہو۔ویسے بھی ڈسکو کی چنگھاڑتی موسیقی سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ہم ملنگ لوگ ہیں۔ مدھم موسیقی اور سادہ کھانا پسند کرتے ہیں۔پھر ٹونی نے ''دی سیریز'' میں کیبرے شو کا مشورہ دیا۔پھر بولا یار تمہارے بہانے میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔چلو'' کاسماس''(Cosmos) چلتے ہیں۔میں نے کہا یہ قصہ پھر کبھی۔بہت سوچ کر ٹونی نے فیصلہ کیا کہ چائنیز اوپیرا چلتے ہیں مگر میں دن بھر کی گردش سے بہت تھک گیا تھا۔بھوک الگ لگ رہی تھی۔میں نے کل پر ٹالنا چاہا مگر ٹونی کہنے لگا' چلو ایک تھیٹر ریستوران

چلتے ہیں۔ڈنراورشو ساتھ چلے گا۔ہم کچھ ہی دیر میں ''کنٹونیز اوپیرا ریستوران'' میں داخل ہوئے۔اندر مدھم نیلی روشنی میں سائے لہرا رہے تھے۔ ہر میز پر ایک قندیل روشن تھی۔سامنے اسٹیج پر ایک بوڑھا موسیقار بانسری نما کوئی موٹا پائپ بجارہا تھا جو نہ بے سرا تھا نہ ہی سر میں لگ رہا تھا۔ویٹرس نے ہمیں ایک اونچی جگہ بالکنی نما باکس والی میز پر بٹھا دیا۔مینو پوری کتاب تھا جس میں انگلش' چائنیز اور جاپانی میں فہرست درج تھی۔کیکڑے کے سوپ کی ٹونی بہت تعریف کر رہا تھا۔ میں نے کہا بھائی کریب میٹ کیوں نہیں بولتے۔کیکڑا سن کر تو ہم کبھی بھی یہ سوپ نہ لیں گے۔خیر مطلوبہ سوپ،لیمن چکن اور جنجر پران یعنی جھینگے کا آرڈر دیا گیا۔سادی چائے سے شروعات ہوئی۔اسٹیج پر ایک بوڑھی رقاصہ جسے گہرے اور تیکھے میک اپ نے تھوڑا بہت جوان بنا دیا تھا' بڑی دل دوز مگر سمع خراش آواز میں اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔دو اس سے کچھ کم بوڑھی نرتکیاں ہولے ہولے ناچ رہی تھیں یا شاید بڑی بی کو پنکھا جھل رہی تھیں۔ موسیقار اس دوران اپنی بے ڈھب بانسری کو رکھ کر کچھ ستا رہا تھا۔دولڑ کے اسٹیج کی دونوں جانب بت بنے کھڑے تھے اور وقفہ وقفہ سے ایک جھانج بجاتا اور دوسرا اپنے ڈھول پر ضرب لگاتا۔اس طرح مجمع کھانے میں محو ہو جانے کے باوجود ان کی آواز پر چونک کر اسٹیج کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ویسے بھی ''اوپیرا'' خواہ انگلش کا ہو یا چینی مجھے کبھی راس نہ آیا تھا۔وضع داری نبھانے یا ڈنر کھانے کے لیے یہ مشغلہ اتنا برا بھی نہ تھا۔اسٹیج پلے میرے نزدیک ایک سنجیدہ کرافٹ اور آرٹ فارم ہے۔اس کے دوران کوئی اور مصروفیت خواہ کھانا ہی کیوں نہ ہو' مجھے پسند نہیں —— خیر یہاں کا ''اوپیرا'' جیسا بھی ہو کھانا لاجواب تھا اور کریب میٹ سوپ کا کیا کہنا۔بس اس کا ترجمہ مجھ سے ہضم نہیں ہوتا۔جھینگے بھی جوان اور صحت مند تھے۔چکن بھی خاندانی —— کھانے کے بعد ٹونی نے چینی آئس کریم اور میں نے خالص کافی کا آرڈر دیا۔ڈنر ختم کر کے ہم لوگ خلال کرتے باہر نکلے۔رات کافی بھیگ چکی تھی۔ہم لوگ اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے ——!

☆☆☆

''آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا''

چن کنگ مینشن کے تمام گیسٹ ہاؤس میں ایک بات مشترک تھی کہ روزانہ ہر کوئی اپنے مہمانوں کو ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ بھجن، گربانی، قوالی یا فلمی نغموں سے صبح بخیر کہتا ہے ــــ آج صبح میری آنکھ راما شیٹی کے ''مدراس سینٹر'' میں ہندی فلمی نغمی سے کھلی۔ صبح صبح ''تیرے ڈیڈی نے دیا پرمٹ مجھے تجھے ستانے کو'' بے حد بھونڈا اور کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک نیپالی جوان میرے سرہانے اپنے ریڈیو کی پرستش کر رہا تھا ــــ مجھے دیکھتے ہی ایک سیلوٹ مارا اور چائے یا کافی پوچھا ۔''ڈیڈی اور پرمٹ'' کی بوریت ایک دم سے کافور ہوگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے چائے کی فرمائش کرڈالی۔ابھی میں برش ہی کر رہا تھا کہ ''گورنگ لاما'' چائے کا گلاس میز پر رکھ کر میرا اجڑا بستر ٹھیک کرنے لگا۔ میں بندے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چائے کی چسکی لینے لگا۔ایک عرصے کے بعد گلاس میں چائے ملی تھی۔دونوں ہاتھوں میں گرما گرم گلاس تھامے میں نے لاما سے پوچھا تم یہاں کب آئے؟ پتہ چلا کہ گورنگ کا پورا خاندان یہاں برٹش انڈیا کے دور سے آباد ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہانگ کانگ پولس اور خاص کر فوج میں نیپالی گورکھا رجمنٹ کو بڑی عزت حاصل ہے۔یہ بھی پتہ چلا کہ ہر اتوار کی صبح آدھے گھنٹے کا ہندی پروگرام ریڈیو پر ہوتا ہے۔ساتھ ہی نیپالی کا ''اسپیشل بلیٹن'' بھی ریڈیو پر بڑا مقبول ہے۔آج اتوار کی صبح تھی اس لیے لاما صاحب صبح سے تیار ہوکر پروگرام نہ صرف خود سن رہے تھے بلکہ سبھوں کو سنا رہے تھے۔اس نے بتایا کہ پہلے وہ ''اسلام آباد کلب'' میں کام کرتا تھا اس لیے اس کے مسلم دوست بے شمار ہیں۔ میں نے پوچھا کیا یہاں اسکولوں میں ہندی، اردو یا نیپالی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی جنرل نالج غضب کی تھی ــــ پتہ چلا اردو، ہندی، نیپالی، گرمکھی اور چینی اکثر اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے ــــ اور ''سرالیاس کڈوری'' ایک اردو میڈیم اسکول ہے جو میٹرک تک فری ہے۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد چائنا لائٹ اینڈ پاور کمپنی کے ایک یہودی نژاد مالک نے یہ اسکول بنوایا تھا۔تقریباً تیس ہزار مسلمان چینی، ہندی، پاکستانی اور سیلونی اور کچھ عرب یہاں آباد ہیں۔ریڈیو پر نیپالی پروگرام شروع ہو چکا تھا۔وہ اٹھتے اٹھتے کہنے لگا' آپ ''اسلام آباد کلب'' میں کھانا کھانے جانا تو میرا نام ضرور بتانا۔وہ لوگ آپ کا خاص خیال رکھیں گے ــــ میں نے گورنگ لاما کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تیاری میں لگ گیا۔نو بجے ٹونی مجھے پک اپ کرنے آرہا تھا۔

ٹونی کے آتے ہی ہم لوگ پانچویں منزل والے ''مدراس ٹفن'' میں مسالہ ڈوسا اور کافی کا ناشتہ کرنے پہنچ گئے۔اتوار کے باوجود صبح صبح کیفے بھراپڑا تھا۔

ہم لوگوں نے ایک کنارے کھڑے ہوکر ناشتے کی رسم ادا کی اور باہر نکل پڑے۔موسم خوش گوار تھا اور ٹونی صاحب اپنی سرخ مرسڈیز لے کرآئے تھے۔ہم لوگ کاؤلون پارک کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ایک عجیب منظر دیکھا۔ٹونی نے بتایا یہ ''تائی چی'' ہے۔قدیم چینی کثرت جس میں بہت ہی دھیمی رفتار سے جسم کے اعضاء کو ہلایا جاتا ہے —— سنا، ذہن اور جسم کی ڈسپلن کے لیے ''تائی چی'' لاجواب ہے۔ آج یہ اکسر سائز ہر خاص وعام میں مقبول ہے اور ''اکوپنکچر'' کی طرح یہ نسخہ بھی بڑے زوروں پر مغرب میں درآمد کیا جاتا ہے۔

کاؤلون کی سڑکوں پر بے شمار سیاح نظر آ رہے تھے۔دکانیں ساری کھلی تھیں۔دفاتر بند تھے مگر ٹریفک کا وہی عالم تھا جو عام دنوں میں ہوتا ہے۔میں پچھلے دوتین دنوں سے ایک بات نوٹ کر رہا تھا کہ سڑکوں، دکانوں اور دیواروں پر طرح طرح کے پوسٹر نظر آرہے تھے۔لگتا تھا کہ الیکشن کا موسم ہے۔پتہ چلا میونسپل کارپوریشن کا الیکشن ہونے والا ہے۔ٹونی نے بڑے فخر سے ایک پوسٹر کی طرف اشارہ کیا۔نام تھا ''گیری —— Garry '' پتہ چلا کوئی سندھی تاجر میئر کے انتخاب میں طبع آزمائی کررہے ہیں۔ٹونی نے پھر بڑے انداز سے مجھے باخبر کیا کہ ہانگ کانگ کی مارکیٹ سندھیوں کے ہاتھ میں ہے۔میں نے پوچھا کیا یہاں بہت سندھی آباد ہیں؟ ٹونی نے سرشار ہوکر کہا بہت زیادہ۔جس کے نام کے ساتھ ''نی'' لگا ہو سمجھ لو سندھی ہے جیسے مرجانی، پھلوانی، ملوانی، گڈوانی وغیرہ وغیرہ —— میں نے بھی بڑی سادگی سے کہا یار ایسا ایک نام بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سندھی نام ہے۔ٹونی نے جھکتے ہوئے پوچھا۔کیا؟ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا ''مہترانی'' —— !ہم لوگ کافی دیر تک ہنستے رہے۔

ہم لوگ گارڈن روڈ پر ''وکٹوریا پیک'' جارہے تھے۔گھنٹہ بھر بعد ''امریکن قونصل'' کے سامنے ٹونی نے گاڑی روکی۔لوگوں کی قطار لگی تھی۔ہم سمجھے جنتا امریکی ویزا کے لیے لائن سے لگی ہے۔مگر معلوم ہوا سیاح اور مقامی شائقین وکٹوریہ پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے لیے ''پیک ٹرام'' کے انتظار میں صبر کے ساتھ قطار میں جمے ہوئے ہیں۔موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹونی جو ان گنت بار اپنے مہمانوں کو لے کر یہاں آیا ہوگا (جس طرح ہم لوگ بڑے چاؤ سے سال میں پندرہ بار اپنے مہمان شعرا اور دوستوں کو نیاگرا فال دکھانے کے لیے لے جاتے ہیں) پہاڑ اور ٹرام کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے لگا —— وکٹوریہ کی چوٹی کوئی ۱۸۵۵ فیٹ بلند ہے۔کہیں کہیں چڑھائی بالکل سیدھی ہے۔موٹر گاڑیوں کے وجود میں

آ جانے سے بہت پہلے ـــــ یعنی ''پالکی ، ہوادار اور رکشہ گاڑیوں کے دور میں پیک ٹرام کا افتتاح انگریزوں نے ۱۸۸۱ء میں کیا تھا۔ پہلے پہل یہ بھاپ اور ایندھن کے زور سے چلتی تھی پھر اسے برقی طاقت سے تیز رو بنا دیا گیا۔ یہ سواری دراصل پہاڑ پر آباد افسروں اور عوام کے لیے تھی جس کے ذریعہ وہ روزانہ زیروزبر ہوتے تھے۔ اپنے آغاز سے آج تک یعنی نوے سال سے یہ ٹرام صرف دوسری جنگ عظیم کے دوران رکی ہے۔ رفتہ رفتہ اس سواری کو تفریح کے لیے استعمال کرنا شروع کیا گیا اور آج یہ سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔ کافی انتظار کے بعد ہمارا نمبر آیا ـــــ ٹرام میں ۸۰ رلوگوں کو بند کیا گیا اور گاڑی اوپر کو کھسکنے لگی۔ پہاڑ پر آباد علاقے نہ صرف خوبصورت تھے بلکہ قیمتی بھی لگ رہے تھے۔ ہمارے داہنے ہاتھ پر لکڑی کے کاٹج ، پھولوں کے تختے ، بانس کے جھنڈ بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایسی ٹرام کا رہم نے نیا گرا فال، ٹورانٹو میں دیکھی تھی اور استعمال کی تھی مگر یہاں چڑھائی کافی تھی۔ نیچے وکٹوریہ ہاربر دھند میں لپٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ کوئی دس منٹوں میں ہم لوگ اپر ٹرمینل پر پہنچ چکے تھے۔ اوپر ایک بھرا پرا گفٹ اسٹور اور ایک کیفے بھی تھا۔ میں نے بڑھ کر دو کافی خریدی' ایک کپ ٹونی کو تھمایا اور ریلنگ سے لگ کر نیچے دیکھنے لگا ۔ نیچے رینگتی گاڑیاں اور لوگ کھلونے لگ رہے تھے۔ فضا ابر آلود اور خنک تھی۔ ٹونی نے کیمرہ ٹھیک کرتے ہوئے چند تصویریں اتاریں۔ دوسری طرف سے طیرانگاہ کو کہرے کی ایک دبیز چادر نے ڈھانپ رکھا تھا ۔ نیچے ''گورنر ہاؤس'' بھی نظر آرہا تھا جسے دوسری جنگِ عظیم نے تباہ کر ڈالا تھا۔ پھر ہانگ کانگ پر قبضہ کر لینے کے بعد انھوں نے اس عمارت کو اپنے طرز پر دوبارہ کھڑا کیا تھا۔ باہر سے یہ بنگلہ جاپانی طرز کا ہے مگر اندر سے امپیریل برٹش وضع کا ہے۔ کچھ منچلے سیاح اور مقامی پیدل بھی اوپر آتے نظر آئے ـــــ پتہ نہیں انھیں چوٹی سر کرنے میں کتنی دیر لگی۔ کچھ دور بوٹانیکل گارڈن اور چڑیا گھر میں جانوروں کے سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ کچھ لوگ اچک اچک کر چین کی سرحد کو دھند میں تاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک ہم دور کے انجان جزیروں کی ہریری، نیلے ساگر کا بے کراں پھیلاؤ اور افق کی دھند میں کھوئے رہے پھر ٹونی کے ٹوکنے پر واپس اپنے خول میں آگئے۔ گھنٹہ بھر کی تانک جھانک کے بعد ہم لوگ ایک بار پھر اسی قطار کی صبر آزما بوریت سے گزر کر نیچے آگئے ـــــ

ہمارے آج کے پروگرام میں ''اوشن پارک'' بھی شامل تھا۔ اس پارک کی بڑی تعریف سنی تھی ۔ وقت کی تنگی کو دیکھتے ہوئے' ٹونی جلد از جلد دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ''آپ لی چاؤ'' کے مقابل ایک جزیرہ نما پر ''اوشن پارک'' آباد ہے۔ آج یہ ہانگ کانگ کا سب سے پسندیدہ اور پُرکشش پارک تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ شہر سے کافی دور پہاڑی علاقے میں یہ پارک

مجھے کسی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ٹونی میری بوریت کو بھانپ رہا تھا' اس نے بتایا اصل پارک اس پہاڑ کی اوٹ میں ہے' تسلی رکھو۔نمبر آنے پر ٹونی صاحب نے پتہ نہیں کتنے کا دو پاسپورٹ یعنی ٹکٹ خریدا۔آگے کا راستہ ایک کیبل کار (تار پر جھولتے ہنڈولے) سے طے کرنا تھا۔چھوٹی سی ایک بند ٹرالی ہمارے سامنے آ کر رکی' دروازہ کھلا۔پہلے ٹونی سوار ہوا پھر میں اس میں سوار ہوا۔ٹرالی خود بخود اوپر کو سرکنے لگی۔تھوڑی دیر میں ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم لوگ کچھ زیادہ ہی اونچائی پر لٹک رہے ہیں حالاں کہ ایسے کیبل کار میں ہم بیٹھ چکے تھے مگر یہاں اس اجاڑ پہاڑی مقام پر پتہ نہیں کیوں بڑی وحشت ہورہی تھی۔میں باہر دیکھنے کی بجائے ٹونی سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا ہوا تھا۔بیس منٹ کی چڑھائی کے بعد ہم لوگ سیدھے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک سرکنے لگے۔نیچے گہری کھائیاں اور جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔دور بہت دور ''ساؤتھ چائنا سٹی'' اور اس کے مختلف غیر آباد جزیرے نظر آرہے تھے۔پھر ٹرالی کا رخ نیچے کی طرف ہوگیا۔اب مجھے آس پاس کا منظر جو پہلے پہاڑ کی اوٹ میں تھا' اچھا لگنے لگا۔خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا اور ہم لوگ صحیح سلامت ''اوشن پارک'' کی زمین پر اترے۔یہاں کا ''اوشن ایریم'' بہت وسیع اور اچھا تھا۔عام ایکویریم کی طرح بڑے بڑے ٹینک میں مچھلیوں کو رکھنے کی بجائے ان لوگوں نے پہاڑ کاٹ کر اس کے اندر بڑے بڑے ایکویریم بنا رکھے تھے۔معلوم ہوا یہ دنیا کا سب سے بڑا اوشین ایریم ہے جس میں ہزاروں اقسام کی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔کہیں کہیں دیوقامت وہیل، چنچل ڈولفن اور قوی ہیکل سیل جسے سمندر شیری بھی کہتے ہیں' مستی کررہے تھے۔اوشین ایریم کا ایک حصہ کھلا تھا۔اس اکھاڑے میں ٹریز کلر وہیل کا کرتب دکھانے والے تھے۔ابھی شو میں کچھ وقت تھا۔ٹونی نے قریب کے کاؤنٹر سے دو چیز برگر اور پیپسی لیا اور ہم لوگ ٹہلتے ہوئے لنچ کرنے لگے۔

جیسے ہی وہیل اور ڈولفن کے شو کا اعلان ہوا ہم لوگ فرنٹ رو کی دو سیٹ پر قابض ہو گئے۔کھلے آسمان کے نیچے تقریباً دو ہزار کے مجمعے کے سامنے ایک خوبصورت پول پر چار ماہر ٹریز نے جھک کر شائقین کا استقبال کیا اور ساتھ ہی دو امریکی نوجوان اور ایک عورت کا تعارف کرایا جو اولمپک کے کہنہ مشق کھلاڑی اور جمناسٹ تھے۔سب مل کر سیٹی بجاتے ہیں اور ایک جھٹکے سے پول کا جھروکہ کھلتا ہے۔ایک دیوقامت وہیل مچھلی مٹکتی ہوئی پول میں داخل ہوتی ہے۔دیکھنے میں یہ ربر کی مچھلی لگ رہی ہے۔اس کے پیچھے ایک چھوٹی وہیل لہراتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔پھر یکے بعد دیگرے پانچ ڈولفن مچھلیاں اچھلتی کودتی اور پرندوں کی طرح آوازیں نکالتی ہوا میں لہراتی پول میں ایک چھپاکے سے گرتی ہیں۔آخیر میں چند قوی ہیکل سیل بھی ڈولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔تماش بین پرزور تالیوں سے ان سمندری عجوبوں کا استقبال کر

تے ہیں۔سب سے پہلے وہیل مچھلی (جو کسی جنگلی درندے سے کم خوفناک نہیں ہوتی) سے قلابازیاں کھلائی جاتی ہیں۔یہ مچھلیاں اچک اچک کرٹرینز کے اشارے پر ناچ رہی تھیں۔پس منظر سے تیز موسیقی بج رہی تھی۔پھر ڈولفن نے ٹرینز کے حکم پر اچھل کود کرنا اور واٹر پولو کھیلنا شروع کیا۔ڈولفن مچھلی انسان دوست ہوتی ہے اور بہت سمجھدار بھی ہوتی ہے۔تمام جانوروں میں شاید ڈولفن واحد مچھلی ہے جو انسانوں کی طرح آواز کے ساتھ ہنس سکتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگلے وقتوں میں ڈولفن خشکی پر ہوتی تھی۔سمندر میں جہازیوں کو یہ طوفان اور خطروں سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ڈولفن کی عقل مندی اور معصومیت نے تماش بینوں کا دل جیت لیا تھا۔پھر بھاری بھرکم سیل نے بھی لوگوں سے خوب تالیاں بجوائیں۔مگر اس شاندار شو کے معصوم کرداروں پر مجھے بڑا رحم آیا —— مانا کہ حضرتِ انسان نے سرکس کے شیر کو اپنا غلام کر لیا ہے اور سمندری حیوانات کو بھی اپنا تابع کر لیا ہے اور انگلی کے اشارے پر طرح طرح کے کرتب کرواتا ہے مگر یہ سب عجیب سا بے ہنگم مذاق لگا۔ان حیوانات کی خوبصورتی ان کے قدرتی مقامات پر ہے، کیا ضروری ہے کہ انھیں نچایا جائے۔آج کل شمالی امریکہ کے ''وائلڈ لائف'' والے اس طرح کے شو کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔خاص طور پر ''ڈولفن بچاؤ کلب'' والے بڑی کوششیں کر رہے ہیں کہ انھیں قدرتی ماحول میں پنپنے دیا جائے۔ڈولفن کی عقل مندی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ کی بحریہ اور نیوکلیئر سائنسداں ان سے ہر طرح کا بیجا کام لے رہے ہیں جس پر کافی نکتہ چینی ہو رہی ہے۔اوشین ایریم کا یہ کامیاب شو مجھے پوری طرح خوش نہ کر سکا۔اس پر ہم کافی دیر تک ٹونی سے بحث کرتے رہے۔

کچھ ہی فاصلے پر ''واٹر ورلڈ'' تھا۔یہاں ایک مصنوعی جھیل سورج کی روشنی میں جھلملا رہی تھی۔قریب ہی واٹر سلائیڈ کی بل کھاتی دھاریاں تھیں جس پر بچے، بوڑھے، عورت، مرد دھینگا مشتی کر رہے تھے۔ان کے علاوہ طرح طرح کے پیچیدہ ہنڈولے اور جھولے تھے جنھیں دیکھ کر میرا سر چکرا رہا تھا۔ہم لوگ کافی یا چائے کی تلاش میں کچھ آگے گئے تو دیکھا تھوڑی ڈھلان پر ایک ندی بہہ رہی ہے۔پہلے میں سمجھا یہ بھی مصنوعی ہے، پتہ چلا اصلی ہے۔یہاں مقامی سے زیادہ گورے سیاح مختصر ترین لباس میں غسلِ آفتابی میں عبادت کی سی یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اپنے آپ میں مگن تھے۔اوشین ایریم اور واٹر ورلڈ کی گہما گہمی سے پرے یہ منظر اپنی مثال آپ تھا۔میں کافی لانے چلا گیا اور ٹونی نے ایک قاعدے کا ٹھیلہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔جب میں کافی لے کر آیا تو دیکھا ٹونی صاحب کسی خاص اینگل کے پوز کا اپنے کیمرے کے زوم لینس سے معائنہ کر رہے ہیں۔میں سمجھ گیا کہ تصویر کے بہانے ٹونی کیا کر رہا ہے۔میرے ہنسنے پر بے چارہ بور ہو گیا۔کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے پتہ نہیں مجھے کیسے شاہین صاحب کی نظم ''غسلِ آفتابی'' یاد

آ گئی۔ مجھے خیالوں میں کھویا اور مسکراتا دیکھ کر ٹونی نے پوچھا معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا' لوگوں کے برمحل اشعار یاد آتے ہیں' مجھے دوستوں کی نظمیں یاد آتی ہیں۔ آؤ تمھیں ایک دلچسپ نظم سنائیں۔ غسلِ آفتابی :

بدن کی حشر سامانی سوا کرنے کو پھر بالائیں اپنے زخم
غسلِ آفتابی میں تمغے جان کر سب کو دکھائیں گی
ساحل کی مخمل ریت پر کہ سورج نے انھیں کتنا جلایا ہے
بالاؤں کا گنجان میلہ ہے نکھرتا حسن کتنا اور نکھرا ہے
نشیلی جھیل آنکھوں میں بدن کا رنگ جواب گندمی ہے کتنا گہرا ہے
ابھرتے ڈوبتے سورج نے سوادِ خلدِ مغرب
جیسے جال سا کوئی بچھایا ہے کیا عجب تیرا معمہ ہے
دھڑکتی چھاتیوں سے تتلیاں اڑتی ہیں تری منزل ہے میرا رنگ
جن کا رنگ میرا رنگ ہاں جس پر تری نفرت سایہ ہے
خوابوں کے سرے پر پھوٹتی ٹہنی سے ملتا ہے مگر جادو کا کیا کیجئے
ڈھلے گی دھوپ کہ سر چڑھ کر ہی رہتا ہے!

نظم سن کر ٹونی نے زور سے تالی بجائی۔ شاید مجھے یقین دلانے کے لیے کہ نظم اسے پوری طرح سمجھ میں آ گئی ہے۔ حالاں کہ مجھے معلوم ہے کہ ٹونی کا ذوق شاعری کے معاملے میں اسی قدر ہے جتنا میرا گارمنٹ فیکٹری کے سلسلے میں ہے۔ پھر بھی میں خوش تھا کہ شاہین صاحب کی نظم کا میں نے صحیح جگہ استعمال کر لیا ہے۔ اب پتہ نہیں نظم کہتے وقت شاہین صاحب (جو فطرتاً وضع دار ہیں) نے بھی ٹونی اور میری طرح زوم لینس سے غسلِ آفتابی کا صحیح معنوں میں نظارہ کیا تھا یا نہیں ـــــ میرے خیال میں کیا ہوگا کیوں کہ نظم نہ صرف تاثراتی بلکہ تجرباتی بھی ہے۔

اوشن ایریم کی مچھلیوں اور جل پریوں سے فرصت کر کے ہم لوگ واپسی کے لیے اٹھے۔ شام ہوا چاہتی تھی اور ٹونی ڈنر کے لیے ''آبرڈین'' جانا چاہتا تھا۔ کافی لمبی ڈرائیو کے بعد ہم لوگ ''آبرڈین'' کے ساحلی علاقے میں داخل ہوئے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فضا میں کچی مچھلی کی بو بسی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا یہ ہانگ کانگ کا نہ صرف سب سے قدیم علاقہ ہے بلکہ سب سے بڑا مچھلی بازار بھی ہے۔ گاڑی ایک جگہ روک کر ٹونی مجھے پیدل سیر کرانے چل پڑا۔ ہانگ کانگ کی فلک بوس عمارتوں اور نیون سائن کی چمک

دمک سے پرے یہ علاقہ اپنی خستہ حالی کی کہانی سنا رہا تھا۔اس بندرگاہ پر ہزاروں لوگ کشتیوں پر ڈیرہ ڈالے نسل در نسل سے آباد ہیں۔انھیں کسی خوش آئند صبح کا انتظار نہیں' کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ صبح کبھی نہیں آئے گی۔یہ لوگ حال میں مست بس زندہ ہیں۔ان کشتیوں کو یہاں ''سمپان'' کہا جاتا ہے۔انہی سمپان پر ان کا مرنا جینا' سب جاری وساری ہے۔ننگ دھڑنگ بچے ایک کشتی سے دوسری پر اچھل کود کر رہے تھے۔لالٹین کی روشنی میں کچھ بوڑھے ''ماہ جونگ'' (چینی جوا) کھیلنے میں مصروف تھے۔چند عورتیں ندی کے پانی سے برتن اور کچھ کپڑے دھو رہی تھیں۔گھر گرہستی کا یہ کام شام کو اس لیے ہو رہا تھا کہ صبح بچے' جوان عورتیں اور بوڑھے ہر کوئی مچھلی بیچنے یا سمیٹنے میں مصروف رہتا ہے۔یا پھر واٹر ٹیکسی یعنی کشتی سے مال برداری یا سواری لانے لے جانے میں مصروف رہتا ہے۔ٹونی نے ایک عورت سے کنٹونیز میں کچھ کہا۔ وہ سر ہلاتی ساحل کی طرف چل دی۔ہم لوگ اس کے پیچھے چلے۔ٹونی نے بتایا کہ یہ عورتیں سمپان یعنی واٹر ٹیکسی چلاتی ہیں۔ہماری سمپان ''وینس'' کے ''گنڈولا'' اور کشمیری ''شکارا'' کے بیچ کی چیز تھی۔دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ''آبرڈین'' کے ساحل کی خستہ حال آبادی کے نظارے کے بعد ٹھنڈی لہروں پر ڈولتی سمپان بہت اچھی لگ رہی تھی۔تھوڑی دیر سیر کرنے کے بعد ہم لوگ پانی پر ڈولتے ہوئے ایک ریستوران ''سی کوئین'' میں داخل ہوئے ــــ ویٹرس نے ہمیں کھلے عرشے پر ایک ٹیبل دے دی۔بیٹھتے ہی چینی چائے سامنے رکھ دی گئی۔میں تھکا ہوا تھا اس لیے ٹونی کو ہی آرڈر دینے کو کہا ــــ بھائی نے دو ''ماہی مسلم'' کا آرڈر دیا۔پتہ نہیں چینی میں اس کا کیا نام تھا۔کھانا آیا' ہم لوگ پوری مچھلی باتوں کے دوران صاف کر گئے جو مزہ اور ماحول کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔کوئی گھنٹہ بھر کھلے آسمان اور پانی پر ڈولتے ہوئے رومانٹک ریستوران میں ہم لوگ دنیا بھر کی گپ ہانکتے رہے۔پھر وقت کا اندازہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔کچھ موسم کی خنکی نے بھی الجھنا شروع کر دیا تھا۔واپسی کے لیے دوبارہ ایک واٹر ٹیکسی کو بلایا گیا اور ہم لوگ ساحل پر گئے۔آج کا دن بہت مصروف اور لاجواب گزرا تھا۔ٹونی بضد تھا کہ میں رات اس کے یہاں رک جاؤں مگر مجھے ڈر تھا کہ چن کنگ مینشن والے ڈربے میں پتہ نہیں آج رات سلطنت خاں کی طرح کوئی اور گھس کر میرا بوریا بستر نہ گول کر دے ــــ ٹونی کا شکریہ ادا کرتے میں لمحہ بھر اس سے بغل گیر رہا کہ پتہ نہیں اب کب ملاقات ہو ــــ وہ فکرمند اور میں بہت پرامید تھا کہ اب ملاقات کینیڈا میں ہوگی۔ٹونی نے مجھے قریبی زمین دوز ریل کے اسٹیشن پر چھوڑا اور ہم لوگ اپنے اپنے مسکن کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

جائیں تو جائیں کہاں

ھائے ۱۹۹۷ء؟

آج کل اس بات پر بڑی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں کہ ۱۹۹۷ء کے بعد ہانگ کانگ کا کیا حشر ہوگا؟ نہ صرف ہانگ کانگ کے چینی اور دیگر باشندے بلکہ سیاحوں کی ٹولیاں اور اسمگلر حضرات بھی پریشان ہیں کہ ہانگ کانگ کا مستقبل کیا ہے؟ کیوں کہ ۳۰/جون ۱۹۹۷ء کورات کے بارہ بجے ہانگ کانگ کی باگ ڈور واپس اس کے پرانے اور کہنہ مشق آقا پیپلز ریپبلک آف چائنا کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔

افیون کے نشے میں مدہوش چینی فوج نے پہلی اور دوسری جنگِ افیون میں بری طرح شکست کھا کر برٹش فوج کو ۱۸۴۲ء میں جزیرہ ہانگ کانگ بڑی شرافت سے پیش کر دیا تھا پھر اتنی ہی سادگی سے کاؤلون اور دیگر شمالی ''نیوٹریٹوری کا علاقہ بھی ایک ۹۹/سالہ ٹھیکے پر سمجھوتہ کر کے انگریز بہادر کے حوالے کر دیا تھا۔ اس طرح ہانگ کانگ اور قرب وجوار کے دیگر جزیرے برٹش کالونی میں شمار ہونے لگے —— ایک طرف انگریز اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی والی شطرنجی چال میں کامیاب ہوئے اور دوسری طرف ان جزیروں پر ''فری پورٹ'' کی بہار آ گئی۔

ان جزیروں پر یونین جیک لہراتا نظر آتا ہے —— یہاں کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہانگ کانگ ایک بڑا تجارتی مرکز بنتا چلا گیا۔ ۱۹۱۱ء کی چینی خانہ جنگی ہو یا ۱۹۳۰ء کا چین پر جاپانی حملہ یا دوسری جنگ عظیم ہانگ کانگ میں مہاجروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۰ء تک اس جزیرے کی آبادی ۳۰/لاکھ سے زائد ہو چکی تھی اور رہائش ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ چین سے فرار ہو کر آنے والوں پر پابندی عائد کر دی گئی مگر مہاجروں کا قافلہ رات دن ہانگ کانگ کی بندرگاہوں پر اترتا رہا۔ مگر لاکھوں جو اس نئی کالونی میں آباد ہوئے انھوں نے اپنی محنت، لگن، ہنر اور جوش سے اسے جنت نظیر بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ صنعت، تجارت اور برآمد نے اسے دنیا میں ایک اہم مال گذاری کا مرکز بنا دیا۔ ہانگ کانگ کی چمک دمک اور ڈالر کی ریل پیل کو مین لینڈ چائنا کے لوگ حسرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ برٹش کلچر اور سرمایہ داری نے ہانگ کانگ کے باشندوں کو نہ صرف زندگی کی آسائشوں اور عیاشیوں سے روشناس کرایا بلکہ صنعتی نظام اور معاشی تگ ودو میں بھی مبتلا کر دیا۔ انسانوں کے بپھرے ہوئے سمندر میں یہاں پر ہر کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے چکر میں سرگرداں رہنے لگا۔ پھر تیسری دنیا کے کسی

بھی ترقی پذیر ملک کی طرح اس نو آبادی میں بھی ایک طبقہ بہت امیر ہوتا چلا گیا اور ایک طبقہ ہمیشہ کی طرح افلاس زدہ حالت میں' ٹالی کے کچے جھونپڑوں اور کشتیوں پر ڈیرہ ڈالے زندگی گزارنے لگا' بلکہ اب تک گزار رہا ہے۔ ایک طرف نو دولتیوں کے نفیس ترین مہنگے بنگلے تھے اور دوسری طرف خانہ بدوش غریب ـــــ ان غریبوں کو اپنی مفلسی میں بھی ایک طرح کا سکون حاصل تھا اور ہے۔ انھیں اس کی قطعی فکر نہیں کہ ۱۹۹۷ء کے بعد کیا ہوگا۔ حکومت کسی کی ہو انھیں معلوم ہے کہ ان کی حالت ابتر ہی رہے گی' مگر امیر طبقے کو فکر لاحق ہے۔ ان لوگوں نے رفتہ رفتہ ہانگ کانگ سے اپنے سرمائے اور کاروبار کو باہر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کا رخ شمالی امریکہ کی طرف ہے۔ کچھ لندن اور یورپ کی طرف بھی نکل رہے ہیں۔ مگر ان کا خاص انتخاب کینیڈا ہے۔ اسی وجہ سے اِدھر چند سالوں میں کینیڈا میں زمین اور مکانوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کینیڈین حکومت بڑی فراخ دلی سے ہانگ کانگ کے امرا اور شرفا کو شہریت کا تمغہ عطا کر رہی ہے کیوں کہ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی دولت بھی لا رہے ہیں مگر کینیڈین عوام کا ردِعمل کچھ بہت خوش گوار نہیں ـــــ انھیں ڈر ہے کہ ہانگ کانگ کے چینی یہاں اپنی دولت کے ساتھ اپنے موروثی نشے کی دولت بھی ساتھ لائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ آج بھی ہانگ کانگ میں ڈرگ کا مسئلہ عام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شمالی امریکہ میں نشے کی لت نے کئی منزلیں عبور کر لیں ہیں اور بات افیون سے بڑھ کر کوکین اور ڈرگ تک پہنچ کر عادت سے علّت میں شامل ہو چکی ہے۔ حسنِ اتفاق کہیے کہ چند ماہ قبل ہم لوگوں کو پتہ چلا کہ ہمارے مالکان بدل گئے ہیں۔ جس اپارٹمنٹ میں ہم پناہ گزین ہیں' یہ ایک چار مختلف فلک بوس عمارتوں پر مشتمل ایک کمپلیکس ہے' جسے محض ۱۵ ملین ڈالر میں ہانگ کانگ کے کسی شریف زادے نے چوں چرا کیے بغیر خرید لیا ہے۔ مجھے نئے مالک مکان سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ تذکرہ تو یوں ہی ہجرت کے اس شاندار طریقے پر ہے۔ ایک ہجرت ہم نے اور ہمارے دوستوں نے کی ہے۔ مگر اس میں بھی ناشکری کی گنجائش نہیں۔ وہ تو حضرت افتخار عارف کے شعر کو مزید میلوڈرامیٹک بنانے کے لیے میں تمہید باندھ رہا تھا ـــــ کہ :

شکم کی آگ لیے پھر رہے ہیں شہر در شہر
سگِ زمانہ ہیں ہم کیا' ہماری ہجرت کیا

ہانگ کانگ کے انگریزی اخبار ''ایشیا ویک'' میں مقامی لوگوں کے مختلف انٹرویو تقریباً ہر روز شائع ہو رہے ہیں جن سے حالات کا کچھ یوں انداز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہر امیر آدمی نے (خاص کر جن کے احباب شمالی امریکہ میں موجود ہیں) گرین کارڈ کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر ابھی

ہانگ کانگ ہی میں موجود ہیں کہ جس قدر نقدی جمع ہو سکے کرلیں یا پھر چلتے چلتے جتنا مزہ کر سکتے ہیں کرلیں پتہ نہیں اگلا پڑاؤ کیسا ہو کسے خبر —— تصویر کا دوسرا رخ وہ غریب ہیں جنھیں ہر دور میں ایک طرح سے زندہ رہنا ہے۔ پھر ایک طبقہ ہر برادری کا وہ ہے جو آئندہ چند برسوں میں ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ جائے گا۔ ایسے لوگ بھی ملک چھوڑ کر نئی جگہ بسنے کی بجائے پرانے ماحول میں رہنا پسند کریں گے۔ اب مڈل کلاس کا جوان طبقہ رہ جاتا ہے، سب سے زیادہ پریشان یہی طبقہ ہے جو اپنے مستقبل کے لیے ہراساں ہے۔ یوں تو بیجنگ گورنمنٹ ''ایک ملک دو سسٹم'' والے فارمولے کی بات کر رہی ہے' ساتھ ہی یہ یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ ہانگ کانگ کے باشندوں کے طرزِ رہائش اور طریقۂ کار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ساتھ ہی یہاں قائم مقام گورنمنٹ برطانوی آئین کے طرز کی ہوگی جس میں ہر فرد کو تقریر' پریس اور سفر کی آزادی حاصل ہوگی۔ مگر ہانگ کانگ کے چینی باشندوں نے پچھلے چالیس سالوں میں چین کی سیاست میں جو اتار چڑھاؤ دیکھا ہے' وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ چینی حکام ہانگ کانگ کے معاملے میں کوئی جلد بازی یا نادانی یا بے جا سختی نہیں کریں گے۔ انھیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔ کیوں کہ چین تمام طاقت، محنت اور پیداوار کے باوجود ہانگ کانگ والی برقی مال گزاری کا طریقہ نہیں اپنا سکا ہے۔ چین کو عالمی منڈی کے تعلقات کی کنجی ہانگ کانگ کے تیز طرار کاروباریوں سے حاصل کرنا ہے۔ ہانگ کانگ والے بھی چاہتے ہیں کہ چین ترقی کرے۔ ویسے بھی چینی وسائل اور سستے مزدوروں سے ہانگ کانگ کی معیشت اور مضبوط ہوگی۔ یہ تو دونوں ملکوں کا ایک دوسرے پر دارومدار ہے کہ معاملہ کس خوبصورتی سے سلجھایا جائے۔ ایک طبقہ کاروباریوں کا ایسا بھی ہے جو مستقبل کے لیے پریشان ہونے کی بجائے حال کو پوری طرح گرفت میں لیے کھا کما رہا ہے۔

ہانگ کانگ کے بازاروں میں گھومتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بیشتر اسٹور والے طرح طرح کی ٹی شرٹ بیچ رہے ہیں جن پر ''گڈ بائی برٹش''، ''لیزاز اوور ۹۷'' وغیرہ لکھا ہے۔ ایک شرٹ مجھے پسند آئی جس پر ایک چینی کی تصویر بنی تھی جو یونین جیک کے آدھے جھنڈے کو مٹا کر چین کا پرچم بنا رہا تھا۔ میں نے ٹی شرٹ کی قیمت پوچھی۔ دکاندار نے ۱۵ ڈالر بتایا جو ہمارا تقریباً دو کینیڈین ڈالر بنتا تھا۔ میں نے وہ ٹی شرٹ ایک یادگار کے طور پر خرید لی —— میری طرح ہزاروں سیاح، مقامی جوان اور اسٹوڈنٹ اس طرح کی ٹی شرٹ نہ صرف خرید رہے تھے بلکہ پہنے گھوم رہے تھے۔ میں نے دکان دار سے پوچھا ۱۹۹۷ء کے بعد تمہارا کیا خیال ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں' ہم لوگ ایسے ہی رہیں گے۔ ہوسکتا ہے اس وقت کوئی اور نئی لہر چل جائے یا نیا شوشہ چھوٹے اور ٹی شرٹ بنانے والوں کو نیا بہانہ مل سکے۔ اصل کمائی تو ان بڑے

لوگوں کی ہوتی ہے۔ہم تو صرف میڈیم ہیں اور رہیں گے۔ٹی شرٹ کے علاوہ پوسٹر' جھنڈے' جگ' پیپر ویٹ' قلم اور طرح طرح کی چیزوں پر۱۹۹۷ء کی دہائی کندہ تھی۔سیاح منہ مانگی قیمت ادا کر رہے تھے۔ مڈل کلاس طبقہ جان لگا کر ان سوینیر کو بیچ رہا تھا اور کارخانہ داروں کے ڈالر شمالی امریکہ کے بینکوں میں سبک رفتاری سے منتقل ہو رہے تھے۔

ہانگ کانگ کے چینی باشندوں کے علاوہ ہندو پاک کے ہزاروں کاروباری جو یہاں مقیم ہیں وہ بھی مستقبل سے ہراساں ہیں مگر بیشتر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کہ آخری وقت میں دیکھا جائے گا۔ ان دیسی لوگوں میں ایک برادری ایسی ہے کہ جس نے چینیوں سے پہلے دوسرے پڑاؤ میں منتقل ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہ انڈیا کے سندھی بھائی ہیں۔میرا دوست ٹونی پھلوانی بھی نیویارک میں کسی سے شادی کر کے سکونت اختیار کرنے کے لیے سنجیدگی سے غور کر رہا تھا مگر مجھ سے حالیہ ملاقات کے بعد اب وہ کینیڈا کے خواب دیکھ رہا ہے۔میں نے اسے مشورہ دیا کہ پہلے شمالی امریکہ کا سفر کرو پھر فیصلہ کرنا' ویسے اس کے لیے نہ نیویارک' نہ ٹورانٹو کہیں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی کیوں کہ وہ اپنے ساتھ دو چار لاکھ ڈالر لے کر آئے گا اور اسے بصد خلوص واحترام شہریت عطا کر دی جائے گی ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں نیویارک کے کولمبس سرکل کے علاقے میں ایک شاندار ملبوسات کے اسٹور کا افتتاح ہوا۔اس کا نام ''کوکا کولا اپیرل'' تھا۔ پتہ چلا ہانگ کانگ کے کسی رئیس ''مرجانی'' نے دکان کھولی ہے۔اس اسٹور کی خاص بات یہ تھی کہ شوکیس میں سامان یا کپڑوں کی جگہ قد آدم اسکرین پر خوبصورت ماڈل مختلف رنگ، ڈیزائن اور قیمتوں کے ملبوسات پہنے فیشن پریڈ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ ویڈیو ۲۴ رگھنٹے چلتی رہتی ہے۔ساتھ ہی اسٹور کے اندر جو لباس آپ کو پسند آئے گا' سیلس گرل فوراً آپ کو اس کی ویڈیو قریب کی دیوار یا ٹی وی پر دکھا دے گی۔دس میں سے میری طرح کا ایک ہی ان تمام لوازمات اور سیلس گرل کی نفیس مسکراہٹ کے باوجود خالی ہاتھ اسٹور سے باہر نکلتا ہوگا —— سندھی وہ بھی انڈیا کا' ایسے ہی نہیں دنیا میں جہاں بیٹھا ہے' نقشے اور ترنگ کے ساتھ جما ہے ۔ پتہ نہیں اس برادری کے مسلمان (پاکستانی) بھائی کیوں اب تک اتنے Dashing نہیں ہوئے ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ طبقہ اب تک وڈیرا اور چودھراہٹ کے زعم میں اپنے خول میں بند ہے۔

ایک طرف ہانگ کانگ کے مقامی رفتہ رفتہ اپنی اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق خود کو باہر منتقل کر رہے ہیں یا کم از کم ایسا سوچ رہے ہیں جس پر یہاں کی حکومت کو فکر لاحق ہے کیوں کہ ہنر مند نوجوان رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ''ساؤتھ چائنا پوسٹ'' اخبار کا ''اسامی خالی ہے'' والا حصہ ہر روز

بڑھتا جا رہا ہے۔ کام کرنے والوں کا فقدان ہے۔ مگر دوسری طرف آج بھی چین کے قرب و جوار کے غریب بہتر مستقبل کا خواب لیے ہانگ کانگ کی کشتیوں پر لد کر چلے آرہے ہیں۔ ان رفیوجیوں کو عام طور پر ''بوٹ پیپل'' کہا جاتا ہے۔ ان میں صرف چین کے نہیں' ویت نام کے بھی خاصے مہاجر ہیں۔ گرفتاری اور کیمپ کی تکلیفوں کے باوجود یہ لوگ اپنے ملک واپس جانا نہیں چاہتے۔ ہانگ کانگ کے لیے ایسے رفیوجی' جن کی تعداد کئی لاکھ ہو چکی ہے' رہائش کا بندوبست کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مگر لگتا ہے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود اب بھی ایک باشعور طبقہ ایسا بھی ہے جسے اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ملک چھوڑ دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ خود کو یکجا اور مضبوط کرنے میں لگے ہیں کہ حکومت کی باگ دوڑ میں ان کا بھی ہاتھ ہونا چاہیے — مگر مسئلہ یہ ہے کہ تمام روایتی چینی فطرتاً سیاسی طور پر متحرک نہیں ہوتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا محنتی چینی جو دنیا کے کونے کونے میں آباد ہیں انھیں اس بات کی قطعی فکر نہیں ہے کہ گائے کی رسّی کس نے تھام رکھی ہے۔ انھیں تو بس یہ فکر ہوتی ہے کہ انھیں دودھ ملتا رہے۔

یہی حال سنا ہانگ کانگ کے چینیوں کا ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے جب ۱۹۹۷ء میں برٹش اپنے پرچم کو اتار لیں گے۔ تو اپنے ساتھ کچھ عیش و عشرت بھی لیتے جائیں گے اور ہانگ کانگ کے عوام کو مختلف پریشانیوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا' مگر عوام صرف دودھ حاصل کرنے کی بجائے گائے کی رسّی کو بھی اپنے ہاتھوں میں تھامنے کا سوچ لیں تو پریشانیوں کا خاطر خواہ حل نکل سکتا ہے۔ بس یہ صرف سوچنے اور اس پر خلوص کے ساتھ عمل کرنے کی بات ہے۔ اس طرح ہانگ کانگ کے چینی اپنی دولت، کل کارخانے، فیشن اور انفرادیت کو قائم رکھ سکتے ہیں اور ایک بار پھر وہ خود کو چینی ملکوں میں مصروف ترین، امیر ترین اور جلیل القدر ثابت کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

مسکراہٹوں کا شہر بنکاک

دو سال پہلے میں کلکتے گیا تو ایک مخصوص مڈل کلاس طبقے کو کچھ زیادہ ہی ترنگ میں پایا۔ فلمی نغموں کی چنگھاڑتی موسیقی پر محلے ٹولے کے نوعمر لڑکوں کو مائیکل جیکسن والے بھڑکیلے لباس میں ''بریک ڈانس'' کی کمر توڑ مشق کرتے بھی دیکھا۔ جتنی گندگی عروج پر تھی فیشن بھی اسی قدر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میٹرو ریل کی کھدائی، گرد و غبار اور ٹریفک جام حسبِ معمول اپنی جگہ کوہِ راسخ! میں نے اپنے چھوٹے بھائی ریاض سے ایک صبح ناشتے کے دوران پوچھا —— میاں قوم کچھ خوش حالی کی جانب گامزن لگتی ہے، مگر یہ گندگی اور گرد و غبار اور ناقص ٹیلی فون وغیرہ کیوں نہیں سدھرتے؟ ریاض نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا کس نے کہہ دیا قوم ترقی...... میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دوبارہ پوچھا، اور یہ فیشن، اڈی ڈاس کے جوتے، لی وائز کی جینز، رینگلر کی جیکٹ یہ سب کیا ہے یار؟ بھئی آپ دراصل کافی عرصے کے بعد آئے ہیں۔ یہاں حالت ابتر ہے۔ اس شہر اور قوم کو اوپر والا چاہیے تو سدھار لے۔ مجھے تو وہ بھی Interested نظر نہیں آتا —— اور یہ فیشن تو بنکاک کی دین ہے۔ جسے دیکھو اسمگلنگ میں لگا ہے۔ میں نے مزید حیرت سے پوچھا مطلب؟ مگر میرے کسی مداح نے صبح صبح ملاقات کے لیے حاضری دی اور ہم لوگوں کی قوم کو سدھارنے والی باتیں ادھوری رہ گئیں!

دوسرے دن میں گھر سے نکلا، راستے میں دوست احباب روک روک کر خیریت پوچھ رہے تھے۔ میں بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ محلے والوں سے ملتا رہا اور بچپن کی یادیں تازہ کرتا، طارق سے ملنے ویلسلی کی طرف جا رہا تھا۔ ویسے تو بہت سے لوگ صبح و شام مل رہے تھے اور اکثر کو میں پہچان بھی رہا تھا۔ مگر ایک جھلمل کرتی نیلی شرٹ اور ڈیزائنر جینز پہنے لڑکے نے قدرے شرماتے سلام کیا، میں نے جواب تو دیا مگر اسے پہچان نہ پایا —— اس نے جھجکتے ہوئے کہا صاحب، ہم عبدل ہیں —— کولوٹولہ میں رکشہ چلاتے تھے، اکثر آپ کو چاندنی لے گئے ہیں، بھول گئے صاحب! مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا بھیا آج کل کیا چلاتے ہو؟ کہنے لگا، کچھ نہیں بس ایک پارٹی کے لیے بنکاک سے مال لاتے ہیں —— اچھا اب سمجھ میں آیا قوم کدھر جا رہی ہے۔ ایک طرف مجھے خوشی تھی کہ مظفر پور کا عبدل رکشہ کی لعنت سے آزاد ہو گیا مگر وہ جن لوگوں کے ہاتھوں لگ گیا تھا، مجھے ڈر تھا کہ وہ بہت جلد تباہ ہو سکتا تھا۔ پھر اور بھی بہت سارے لڑکے اسی طرح کے کاروبار میں مصروف نظر آئے۔ صرف مسلم نہیں ہر برادری کے نوجوان —— ایک دن

ایک اور نوجوان کو سرخ ٹی شرٹ اور کالے پینٹ میں دیکھ کر ہنسی بھی آئی اور میں نے اسے پہچان بھی لیا۔ میرے بچپن کے حجام رام لال کا بھتیجا بنارسی لال اپنے خاندانی پیشے کو تج کر بنکاک کے خط سنوارنے لگا تھا ۔ پیسہ آرام سے آنے لگے تو دھیرے دھیرے منشیات اور جرائم بھی پنپنے لگتے ہیں ۔ ادھر نوجوانوں میں اسمگلنگ کے وسیلے سے کچھ بیکاری کم ہوئی تو منشیات نے زور پکڑا اور پولس تمام باتیں جانتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیوں معذور تھی ۔ مجھے اس بے راہ روی میں' حکومت کا نظام اور موقع پرست ایجنٹ حضرات کا انتظام ساجھے دار نظر آیا ـــــ اور وقتی چمک دمک میں عبدل اور بنارسی لال جیسے جوان جان بوجھ کر بے وقوف بن رہے تھے ۔ بات کہاں سے کہاں جانکلی ۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ بنکاک کا خاکہ میری نظر میں بہت دلکش نہ تھا اس لیے دوبارہ پروگرام بنا کر بھی میں نے سفر ملتوی کر دیا تھا۔ اس دوران میرے دوجگری دوست طارق اور نیاز چودھری بھی کسی کمپنی کی ایجنسی کی بات کرنے ہانگ کانگ گئے تو واپسی پر بنکاک ہوتے ہوئے آئے ۔ان کی سفارش پر بھی میں بنکاک کا پروگرام نہ بنا سکا اور وقت گزرتا گیا۔

اچانک امسال ٹورانٹو سے ''تھائی ایئر'' والوں نے اپنی پہلی اڑان کا اعلان کیا' اسی دوران میں جاپان کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ زاہد نے مشورہ دیا کہ ''تھائی'' سے جاپان، ہانگ کانگ اور بنکاک رکتے ہوئے کلکتے جایا جا سکتا ہے ۔ اس سفر میں خالد سہیل بھی میرے ساتھ انڈیا جا رہے تھے مگر بھارتی سفارت خانے کی ''اعلیٰ ظرفی'' نے وقت پر ویزا مہیا نہ کیا اور سہیل نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے الگ ہو گئے ۔ یہ قصہ پھر کبھی ! ہاں اشفاق جگر نے میرے ٹکٹ کم سے کم میں بنوائے مگر اس خصوصی رعایت سے سہیل کے ساتھ نہ جانے کا غم بہت کم ہلکا ہوا' حالات سے مجبور ہو کر میں تنہا سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔

۲ر دسمبر ۱۹۸۸ء کی ایک سرد شام پیئرسن ایئرپورٹ ٹورانٹو میں سہیل کو الوداع کہتے ہوئے میں بڑی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ ''تھائی'' کا جمبو جیٹ پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں نے ''چیک ان'' میں اپنا سامان دیا۔ ایک آخری نگاہ سہیل کے مسکراتے وجود پر ڈالی اور کسٹم کی طرف بڑھنے لگا۔

عنابی رنگ کے ریشم میں لپٹی ایک حسین سانولی سلونی دوشیزہ نمستے والے اسٹائل میں ہاتھ جوڑے طیارے کے گیٹ پر سراپا تبسم بنی مسافروں کو ''سواس دی'' بڑے قرینے سے کہہ رہی تھی ۔ اس اجمالی استقبال پر میرا موڈ کچھ ٹھکانے لگا۔ ساتھ ہی ''تھائی'' زبان سے پہلی مگر دلکش شناسائی ہوئی ـــــ میں نے ہمیشہ کی طرح ''ایمرجنسی دروازے'' کے ساتھ والی نشست محفوظ کروا رکھی تھی ۔ اس لیے نہیں کہ بادلِ ناخواستہ کوئی مصیبت آئی تو سب سے پہلے میں چھلانگ لگا دوں' بلکہ اس لیے کہ اس سیٹ کے سامنے والی

کھلی جگہ میں اپنی لمبی ٹانگیں پسار کر آرام سے بیٹھ سکوں گا۔ حفاظتی اقدام کا سبق پہلے ''تھائی'' زبان پر انگلش میں دہرایا گیا' پھر کچھ دیر میں ٹھنڈا پیش کیا گیا۔ ابھی میں دیگر ایئر ہوسٹس کے ریشمی ملبوسات کی نفاست کا تقابلی جائزہ لے رہا تھا کہ طیارہ فضا میں تیرنے لگا۔ ویسے تو عموماً جہاز والے خوش مزاج ہوتے ہیں (یہ اور بات ہے کہ ہمارے جہاز والے کبھی کبھی خوش نظر آتے ہیں' اس دوران بھی وہ اپنی خوشی میں ہمیں شریک نہیں کرتے) مگر ''تھائی'' کا پورا عملہ ضرورت سے زیادہ مہمان نواز تھا۔ ہر ایئر ہوسٹس بچھی جاتی تھی' کمزور دل والے کئی مسافر طرح طرح کی خوش فہمیوں کا شکار بھی ہوئے ہوں گے۔ ان کی مسکراہٹ بھی قابلِ دید تھی۔ یہ دوشیزائیں بڑا دل لگا کر مسکرا رہی تھیں۔ ساتھ ہی میزبانی کے فرائض بھی بحسن وخوبی انجام دے رہے تھیں۔ اپنے پیشے سے ایسا لگاؤ دوسرے کسی ہوائی عملے کو میں نے عملاً نہ دیکھا تھا۔ بنکاک کو مسکراہٹوں کا شہر کہتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال طیارے میں دیکھ رہے تھے۔ موقع بے موقع طیارے میں اعلانات بھی ہو رہے تھے کہ ''سگریٹ باتھ روم میں کھڑے ہو کر نہ پئیں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پئیں'' ـــــ اور ''ابھی ہم لوگ تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں' کچھ ہی دیر میں ڈنر پیش کیا جائے گا ـــــ ابھی موسم کا مزاج ٹھیک ٹھاک ہے، جب گڑبڑ ہو گا آپ کو خبردار کر دیا جائے گا ـــــ آج کی فلائٹ میں بعداز ڈنر فلم ''کروکوڈائیل ڈنڈی II'' دکھائی جائے گی وغیرہ وغیرہ' یہی اعلانات انگریزی سے پہلے تھائی زبان میں ہوئے تھے جو پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے تھے مگر اتنا اندازہ ضرور ہوا تھا کہ یہ زبان سماع خراش نہیں' اس میں ایک چاشنی سی ہے اور خاص کر لہجہ میٹھا اور دھیما ہے۔ چینی یا دیگر جنوب مشرق ایشیا کی زبانوں کی طرح نہیں ـــــ ہمارا طیارہ ''سیاٹل'' اور ''تائی پے'' رکتا ہوا بنکاک جا رہا تھا۔ ابھی طیارہ تقریباً خالی تھا۔ شاید سیاٹل سے امریکنوں کی بھیڑ سوار ہو۔ سفر کوئی اٹھارہ گھنٹے کا تھا اور مجھے سوچ کی ہی وحشت ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ کی نشست خالی تھی اور میں پھیل کر بیٹھا تھا۔ ایک من ہی من مسکاتی ایئر ہوسٹس خراماں خراماں آئی اور کھانے کی کشتی میرے سامنے لگا کر جا رہی تھی کہ میں نے کہا ''کوپ کھن''۔ یعنی تھائی میں شکریہ ادا کیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا اور خوش ہوتے ہوئے بولی ''آپ تھائی جانتے ہیں'' میں نے کہا ''چائی'' یعنی ہاں جی! اس نے مزید حیرت سے پوچھا' کہاں سیکھا آپ نے؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا ابھی ابھی شروع کیا ہے' پھر کہا ـــــ ''چان یک چانام'' یعنی کھانے کے ساتھ مجھے پانی بھی چاہیے۔ اس نے متاثر ہوتے ہوئے کہا ''آپ بہت جلد سیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا بس جتنی تھائی ہم جانتے تھے تم پر نچھاور کر دی' اب اور سیکھیں گے تو بات ہو گی۔ اس نے کہا ''مائی پین رائی'' مطلب یہ بھی بتایا کہ کوئی بات

نہیں ـــــ سب اچھا ہوگا۔‘‘ اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا دیکھا۔ چکن کری اور سادہ چاول، ساتھ میں نفاست سے تراشے ہوئے سلاد، ایک طرف پڈنگ نما کوئی میٹھا بھی تھا۔ دیکھنے اور خوشبو سے کھانا ٹھیک لگا۔ چکھنے پر مزے کا لگا۔ سالن میں حیدرآبادیوں کی طرح ناریل کا دودھ ملا تھا۔ کھانا اجنبی نہ لگا۔ اس میں مشرقی خوبو تھی۔ ابھی ہم کھا رہے تھے کہ ایئر ہوسٹس پانی کا گلاس لیے حاضر ہوئے اور بڑی اپنائیت سے کچھ پوچھا۔ جملہ سمجھے بغیر میں متن سمجھ رہا تھا کہ کھانا کیسا لگا۔ اس وقت کوئی اور سوال کم ہی پوچھا جاسکتا تھا۔ میں نے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا ’’ڈی مارک‘‘ یعنی شاندار! جاتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا ’’کافی چا؟‘‘ میں نے اس کو بتایا‘ چلو کچھ تو ہماری زبان میں مشترک نکلا۔ اس نے پوچھا کیا؟ میں نے بتایا ہم لوگ بھی تمہاری چا کو چائے کہتے ہیں‘ مگر اس وقت ہم کافی لیں گے! ڈنر سے فارغ ہو کر میں تھوڑی دیر تھائی لینڈ کے بارے میں پڑھتا رہا‘ پھر پتہ نہیں کب نیند نے آن گھیرا۔ آنکھ کھلی تو طیارہ ’’سیاٹل‘‘ پہنچ چکا تھا۔ صحت مند امریکی قدآور لڑکیاں، لڑکے اور بوڑھے جہاز پر سوار ہونا شروع ہوئے جن کے آگے پستہ قد تھائی کا عملہ بڑا بچکانہ لگ رہا تھا۔ ساتھ ہی بہت سارے زردکورین! اتنے بے شمار بچوں کے ساتھ داخل ہوئے تو طیارہ تقریباً بھر گیا۔ خوش قسمتی سے میرے ساتھ کی نشست اب تک خالی تھی اور میں آرام سے لکھ پڑھ رہا تھا۔ جہاز نے اُڑان بھری‘ ایک بار پھر تمام سبق دہرائے گئے‘ ٹھنڈے مشروبات پیش کیے گئے اور پروگرام بتایا گیا۔

مجھے کچھ خطوط لکھنے تھے‘ کچھ پڑھنا تھا۔ اپنے سفر کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ میں کافی دیر تک اپنا دفتر پھیلائے کام کرتا رہا۔ میری میزبان دوبارہ کھانا لے آئی جسے میں نے واپس کر دیا۔ پتہ چلا اس پرواز میں پانچ بار ناشتہ و کھانا پیش کیا جائے گا اور ساقی ہر وقت ہمہ تن گوش ـــــ دوسری بار میں ہمت ہار چکا تھا۔ ڈنر کے بعد فلم شروع ہوگئی۔ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر مجھ پر ایک غنودگی کا غلبہ طاری ہوا اور میں سو گیا۔ میں اصطبل بیچے سو رہا تھا کہ کسی کھٹکے سے آنکھ کھلی۔ دیکھا بیشتر امریکی طیارے کی کھڑکیوں سے لگے باہر جھانک رہے تھے۔ پہلے میں سمجھا جہاز سے کوئی چیز گر پڑی ہے۔ پھر آنکھیں ملتا کھڑکی سے باہر دیکھا۔ افق پر لالی رفتہ رفتہ کھل رہی تھی اور دور بادل کی اوٹ سے سورج کی سواری نکلنے کو تیار تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی تو سوئے ہیں۔ صبح اتنی جلدی کیسے ہوا چاہتی ہے! گھڑی دیکھی رات کے تین بجے رہے تھے۔ میری نیند پوری طرح غائب ہو چکی تھی۔ آدھی رات کا سورج پوری شان و شوکت کے ساتھ دھند کی دبیز چادر سے سر نکالے ہمیں تاک رہا تھا۔ جس تیزی سے ہمارا طیارہ سورج کی طرف بڑھ رہا تھا‘ اتنی ہی بے قراری سے سورج کا رتھ ہماری جانب کھنچا آ رہا تھا۔ یہ سب جغرافیائی کمال تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج کا گلال بھرا

تھال چھلک پڑا اور دور دور تک روشنی کی لالی پھیلتی چلی گئی۔ مجھے مرحوم سرؔور بارہ بنکوی کا ایک شعر یاد آ گیا :

ایک ہی ساعت میں آنے کو ہے سنگِ آفت
اور پھر مانندِ آئینہ بکھر جائے گی رات

ہم تقریباً تین چوتھائی سفر پورا کر چکے تھے۔ ہماری نازک اندام میزبان نے گرم تولیہ بڑھاتے ہوئے ''سوادی کا''، یعنی صبح بخیر کہا! میں نے جواب میں ''سوادی کلاپ'' عرض کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ کافی لے آئی۔ پھر ناشتے کی کشتی رکھی گئی۔ میں سفر میں عموماً کم کھاتا ہوں۔ کافی کے ساتھ ایک مالٹا کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ کپتان کے اعلان پر معلوم ہوا کہ ہم کچھ ہی دیر میں ''تائی پے'' پہنچنے والے ہیں اور وہاں عملے کی تبدیلی وغیرہ کی وجہ سے ۵۰ منٹوں کا بریک بھی ہے۔

''تائی پے'' طیرانگاہ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں چیونٹی کے رینگنے کو جگہ نہ تھی۔ مسافروں کی مزاج پرسی کے لیے لاؤنج میں ہی گرم اور ٹھنڈے کا معقول اہتمام بھی تھا۔ میں کافی دیر ٹہلتا رہا۔ کیوں کہ بیٹھے بیٹھے کمر بول گئی تھی۔ روانگی کا اعلان ہوا۔ سب طیارے میں سوار ہوئے۔ حفاظتی تدابیر کا آموختہ دہرایا گیا اور ہم اپنی منزل کی طرف مائلِ پرواز ہوئے۔ میرے سر میں کچھ درد ہونے لگا تھا۔ میں نے ایئر ہوسٹس کو بلانے کے لیے گھنٹی دبائی۔ ایک تازہ دم میزبان مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ میں نے ایک گلاس پانی اور اسپرین کی فرمائش کی۔ جب وہ لے کر آئی تو کہہ دیا کہ مجھے اٹھانے کی زحمت نہ کرنا، بنکاک پہنچ کر ہی ہوشیار کرنا۔ اس نے بڑی سعادت مندی سے گردن ہلائی اور چلی گئی۔ اسپرین لے کر میں نے دریچے بند کیے اور کمبل اوڑھ کر دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

کسی کے ہولے سے جگانے پر میں نے آنکھیں کھولیں۔ میری میزبان نے خوش خبری دی کہ میں بنکاک پہنچ چکا ہوں۔ میں کافی دیر سے سو رہا تھا۔ لوگ اپنا سامان اٹھائے اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے تھائی میں ''کوپ کھن''، یعنی شکریہ ادا کیا اور اپنا بریف کیس' کیمرہ اور کوٹ اٹھاتا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ باہر دیکھا اندھیرا پھیلا تھا۔ میں چکرایا کہ اتنی جلدی پھر رات کیسے ہوگئی؟

بنکاک انٹرنیشنل ایئرپورٹ نیا اور جدید طرز کا تھا۔ معلوم ہوا پہلے کرنسی کا تبادلہ کیجیے پھر ویزا فارم پر کر کے فلاں کاؤنٹر پر جمع کیجیے۔ پھر قطار میں لگ کر اسے حاصل کیجیے۔ پھر ''بیگیج کلیم'' سے اپنا سامان اٹھا کر ایک اور قطار میں لگ کر خود کو کسٹم کے لیے پیش کیجیے تب باہر نکلیے۔ مختلف قطاروں کو دیکھ کر پسینہ آ گیا۔ بھانت بھانت کے لوگ اپنی اپنی وضع کے ملبوسات میں قطار میں لگے تھے۔ ان میں ۸۰ فیصد شکل ہی سے سیاح کی بجائے کچھ اور ہی لگ رہے تھے۔ ایک لمبی نیند سے جو سر کا درد ٹھیک ہوا تھا' یکبارگی پھر واپس

ہونے لگا۔ مجھے لگا کسی جانے پہچانے چڑیا گھر میں آ گئے ہیں۔ ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے بے شمار نوجوان تہبند باندھے، پگڑی لپیٹے، دھاری دار پاجامہ پہنے، تنگ کرتا چڑھائے، چست سوٹ پر ڈھیلی ہوائی چپل سٹپٹاتے، پان چباتے، بیڑی سلگاتے، سگریٹ کے مرغولے بناتے' بنگلہ میں بحث کرتے، ہندی میں گالی بکتے، اردو میں بے سرا گانا گاتے، قطار کو رنگین بنائے ڈالر کے بھاؤ اور ہنڈی کے تبادلے کی بات کر رہے تھے۔

''میں کہاں سے یہ کہاں آ پہنچا'' —— بنکاک کی عالم آرائی کو دیکھ کر سخت کوفت ہوئی مگر اس وقت واپسی ممکن نہ تھی۔ میں نے بڑے صبر و تحمل سے تمام کارروائی پوری کی اور باہر نکلا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس سبزی منڈی نما طیرانگاہ میں ایک اور بات کا اندازہ ہوا کہ آج تاریخ ۴؍دسمبر ہے جب کہ دو کی شب کو ٹورانٹو سے چلا تھا۔ یعنی بیچ سے پورا ایک دن گول ہو چکا تھا مگر تھکن سے کچھ سوچنے کی تاب نہ تھی۔ باہر نکلا اور ایک سرخ چمچماتی ٹیکسی کو روکا۔ ڈرائیور کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا ''ہوٹل'' اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا انڈین! میں نے گردن ہلائی اور وہ چل پڑا۔ شہر توقع سے زیادہ روشن تھا مگر رات گئے بھی ٹریفک کا زور اور شور بہت تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹیکسی ایک گلی سے گزرتی ہوئی ایک چار منزلہ ہوٹل ''نیو پلازا'' کے سامنے رکی۔ ہوٹل کے سامنے خوانچہ والے کچھ تل کر بیچ رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک گاڑی کے کھلے دروازے سے لگے دو سردار لڑکے بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ تین ملباری جوان اپنی لنگی اٹھائے ٹہل رہے تھے۔ ایک کمرے سے ''ہو نگاہِ کرم......'' قوالی کی پاٹ دار آواز آ رہی تھی۔ دوسری جانب سے ''...... اور چابی کھو جائے'' گانے کی دبی دبی آواز ابھر رہی تھی۔ اندر کاؤنٹر پر ایک مریل لڑکی فضا میں گھور رہی تھی۔ مجھے پہلے غصہ آیا پھر ہنسی آئی مگر ضبط کرتے ہوئے اپنے خرد ماغ ڈرائیور سے کہا۔ آگے بڑھو! اسے حیرت تھی کہ میں دیسی ماحول میں آ کر مطمئن کیوں نہ تھا۔ کچھ دیر بھٹک کر ہم ایک صاف ستھری شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ سامنے ایک بڑا سا نیون سائن ''امباسیڈر ہوٹل'' بتا رہا تھا کہ جگہ اچھی ہے۔ میں نے ٹیکسی روکنے کو کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی ہوٹل کے برساتی میں روکی اور ۲۰۰؍بھات کا مطالبہ کیا۔ کچھ پوچھنا اور سوچنا فضول تھا۔ میں بندے کو پیسہ دے کر ہوٹل میں داخل ہوا۔ ریزرویشن کاؤنٹر والی نے سنگل کمرے کا ہزار بھات بتایا۔ میں نے چوں چرا کیے بغیر کمرہ لیا۔ ۵ ویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۰۵؍ میں آ کر کھڑکی سے سامنے کی شاہراہ کو دیکھا۔ ٹریفک رات کے ساتھ دھیمی پڑتی جا رہی تھی اور پلک جھپکاتے قمقمے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے فرج سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لیا اور پی کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

مسکراہٹوں کے شہر بنکاک کی پہلی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ فضا معتدل، نہ گرمی نہ سردی۔ میں نے اپنا

گرم کوٹ وغیرہ اتار کر کنارے رکھا۔ جب میں چلا تھا تو ٹورانٹو میں برف باری شروع ہو چکی تھی اسی لیے میں نے گرم کپڑے لادر کھے تھے۔ یہاں موسم معتدل تھا۔ میں نے ٹی شرٹ اور جینز پہنا' کیمرہ اٹھایا اور آوارگی کے لیے نکل پڑا۔ ''امباسیڈر'' ہوٹل پانچ ستارۂ امتیاز لیے بڑا خوبصورت، آرام دہ اور بارونق ہوٹل تھا۔ میں کمرے کی چابی جمع کرنے ریسیپشن پر آیا۔ ایک خوش مزاج ہونہار بی بی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ''سواس دی کا'' کہا۔ میں نے بھی اتنی ہی خوش مزاجی سے ''سواس دی کلاپ'' یعنی صبح بخیر کہا اور چابی دیتے ہوئے پوچھا کہ محترمہ تمہارے ہوٹل کے آس پاس قابلِ دید کیا ہے۔ بندہ سیر کو جانا چاہتا ہے۔ محترمہ نے جلدی جلدی پلک جھپکاتے اور ہولے ہولے مسکاتے بتایا کہ آج ۵ر دسمبر ہمارے ہر دل عزیز راجہ صاحب کا جنم دن ہے اس لیے قومی چھٹی ہے۔ صرف راجہ جی کا محل اور کچھ مندر کھلے ہیں۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ تھائی قوم اس نیک دل خاتون کی طرح بھولی بھالی ہے۔ دنیا چاند کے آگے نکل گئی۔ ان کی سادگی دیکھیے کہ اب تک اپنے راجہ جی کی سال گرہ کام کاج چھوڑ کر منا رہے ہیں۔ یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ سارے شہر میں چراغاں کیوں ہو رہا تھا۔ رات تھکن میں ہم سمجھ رہے تھے کہ اتنی روشنی ان کی روشن خیالی کی آئینہ دار ہے۔ میں نے مجسم لطف و کرم والی دوشیزہ سے دوبارہ پوچھا' آپ اپنے راجہ جی کے درشن کو کیوں نہیں گئیں؟ اس نے کہا ہاں —— آج شام ان کی تقریر سننے جاؤں گی۔ ساتھ ہی ہز میجسٹی اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ پتہ چلا ظلِ سبحانی ''جاز'' موسیقی کے دلدادہ ہیں اور نفیری بڑی چاؤ اور مہارت سے بجاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں دوشیزہ سے گزارش کرتا کہ شام مجھے اپنی قیادت میں راجہ (اندر) ''بھومی بول ادلیا دیج'' کے دربار لے چلے' کسی بد ذوق سیاح نے ہماری ثقافتی اور باہمی گفتگو میں رخنہ اندازی کی اور مجبوراً دوشیزہ اس کے بیجا سوالوں میں الجھ گئی۔ پھر میں نے سوچا ایسی بھی کیا لاچاری۔ راجہ و پرجا کو اپنے انداز سے دیکھیں گے! پس میں نے اپنا نیک ارادہ ترک کیا اور دوشیزہ کو ہاتھ کے اشارے سے شکریہ کہا اور کاؤنٹر سے بنکاک کا نقشہ اور دو ایک کتابچہ اٹھاتا ہوا باہر نکل آیا۔

''سوکھوم وِٹ روڈ'' بنکاک کا ڈاؤن ٹاؤن یا چورنگی تھا جہاں نہ صرف ہمارا ہوٹل تھا بلکہ پورا فیشن ڈسٹرکٹ تھا۔ مگر پچھلے دس منٹوں سے ہم سڑک پار کرنے کی کوشش میں اپنے بلڈ پریشر کو ابال رہے تھے۔ میں نے کلکتے کی ناقص ٹریفک میں اسکول جانا سیکھا تھا۔ کراچی کی بدتہذیب ٹریفک میں دوستوں اور رشتہ داروں کو پرکھنا سیکھا تھا۔ نیویارک کی بدکار ٹریفک میں گرمی کی گھٹن اور سردی کی یخ بستہ شامیں جھیل چکا تھا مگر آج یہاں میں چیخ چیخ کر بتانا چاہ رہا تھا کہ بنکاک کی ٹریفک دنیا کی واہیات ترین ٹریفک قرار دی جاتی ہے۔ خاص کر آٹو رکشا جسے یہ ''ڈگ ڈگ ٹیکسی'' کہتے ہیں اس کا شور ناقابلِ برداشت تھا۔ آخر

تھک کر ایک فرلانگ چلا تو فلائی اوور نظر آیا۔ اس کے ذریعہ راستے کے اس پار گیا۔ ایک اسٹور سے اپنے کیمرے کے لیے فلم خریدی، میں کیمرہ لوڈ کر رہا تھا کہ ایک اچھا بھلا آدمی قدرے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگا۔ سر، مساج؟ پہلے مجھے بندے کی فراغ دلی پر حیرت ہوئی کہ دن دہاڑے کسی اسٹور کے اندر ایسی دعوتِ خاص، پھر بوریت ہوئی کہ کم بخت ہم اسے ایسے تھکے نظر آ رہے ہیں —— مزے کی بات یہ تھی کہ دکان دار صاحب بھی اس مالشیے کی تعریف میں کہنے لگے، سر! یہ اپنا کام خوب جانتا ہے! میں نے دونوں کو خاموشی سے دیکھا اور اسٹور کے باہر آ گیا۔ شہر رفتہ رفتہ مسکرا کر اپنے آپ کو ظاہر کر رہا تھا!

''سوکھوم وِٹ'' روڈ کے دونوں طرف فٹ پاتھ پر بے شمار ٹھیلے والے ہر قسم کا سامان فروخت کر رہے تھے۔ ہانگ کانگ کی نقلی مگر دل کش گھڑیاں، رے بین چشمے، طرح طرح کی رنگ اڑی جینز اور قسم قسم کے رنگین ملبوسات، تھائی سلک کے اسکارف، رومال اور تہبند، مگرمچھ اور سانپ کے چمڑے کی مصنوعات وغیرہ۔ پھر ۹ ربینڈ کے ریڈیو، ڈبل ٹیپ ریکارڈر، رنگین ٹی وی، ۵ رسسٹم کے وی سی آر سے دکانیں بھری پڑی تھیں۔ یہ وہ چیزیں تھیں، جن کی للک میں سیدھے سادے عبدل اور بنارسی لال خود غرض اسمگلروں کے جال میں پھنس کر یہاں چکر لگا رہے تھے۔ ہر قدم پر خوانچے والے بے رنگ اور بدہیئت کھانے پینے کی چیزیں بھی بیچ رہے تھے۔ فٹ پاتھ کے کنارے ہی انھوں نے میز کرسیاں ڈال رکھی تھیں۔ مقامی لوگوں کے ساتھ ہپی نما کفایت شعار سیاح بھی ان خوانچوں میں منہ مار رہے تھے۔ مجھے پہلی نظر میں بنکاک نے بڑا بور کیا۔ ذہنی طور پر ابھی تک میں نے اس شہر کو قبول نہ کیا تھا —— میں نے خود کو دلاسہ دیا کہ رفتہ رفتہ شہر کی بہتر چیزیں پسند آئیں گی۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ واپس اپنے ہوٹل آیا جس میں صبح آتے وقت میں نے ''انٹرنیشنل فوڈ کورٹ'' دیکھا تھا۔ ہوٹل سے متصل ایک خوبصورت باغ تھا اور اس سے لگا ایک بڑا سا ہال جس میں دنیا بھر کے پکوانوں کے کاؤنٹر بنے تھے۔ میں نے ایک لائن سے دیکھنا شروع کیا۔ فرنچ، اٹالین، جرمن، انڈین، چائینز، تھائی۔ میں رک گیا۔ پھر تھائی میں ایک حصہ تھا ''مسلم تھائی''، میں نے سوچا دیکھیں یہاں کے مسلمان کیا کھاتے ہیں۔ مختلف سالن، روٹی، بریانی نما چاول کی ڈش، سبزی اور کونے میں ایک تختی لگی تھی ''بایا''۔ میں نے پوچھا یہ کون سالن ہے؟ سر پر رومال لپیٹی ایک جنت بی بی نما صحت مند مسلم تھائی خاتون نے اٹک اٹک کر انگلش میں بتایا کہ ''بیل کی دم کا سوپ'' ہے۔ میں نے گائے اور بکرے کا پایا کھایا تھا مگر بیل کی دم کا سوپ کبھی نہ چکھا تھا۔ میں نے عزیزہ سے بڑے احترام کے ساتھ روٹی اور پائے کی فرمائش کی —— مزے کی بات یہ تھی کہ پائے پر بکھرے ہوئے پیاز کے لچھے، کٹی ہوئی ہری مرچ اور ہرا دھنیا اور نیبو بھی ڈالا گیا تھا۔ میں نے اپنے

کھانے کی کشتی اٹھائی اوراس وسیع ہال میں جگہ تلاش کرنے لگا۔ ہال بھرا پڑا تھا۔ایک میز پر جگہ بناتے ہوئے میں بیٹھ گیا۔ بابا چکھا۔ بہت مزے کا لگا۔ بیل کی دم اتنی مزے دار اور کارآمد شے ہوتی ہے، پہلی بار اس کا اندازہ ہوا۔ کھانا ختم کر کے میں کاؤنٹر پر واپس آ گیا اور محترمہ کو بتایا کہ ان کے بیل کی دم بہت لذیذ تھی۔ایک عجیب چیز دیکھی کہ وہ خاتون کیلے کو چولہوں پر بھٹے کی طرح بھون رہی تھی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے۔اس نے بتایا ''کلوے''۔ میں نے سوچا اسے بھی چکھا جائے۔ بھنے ہوئے کیلے کو کسی میٹھے شیرے میں ڈبو کر اس نے مجھے بڑھایا۔ساتھ ہی میں نے چائے کی بھی فرمائش کر دی۔سب ملا کر بل ۱۰۰ر بھات کا بنا۔ میں نے گرم اور میٹھا کیلا کھایا تو عجیب طرح کا لگا۔مگر چائے دیسی تھی۔اس کھانے نے طبیعت کو قدرے بحال کیا اور ہم تازہ دم ہو کر دوبارہ باہر نکلے۔

تھائی لینڈ کے بارے میں مجھے اتنی خبر تھی کہ اس کا قدیم نام ''سیام'' ہے اور یہاں بدھ ازم کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ یہاں ۵۰۰۰ر سال پہلے تانبے کے عہد کی تہذیب موجود تھی۔موجودہ تھائی نسل جنوبی چین سے ہجرت کر کے تقریباً گیارہویں صدی میں یہاں آ کر آباد ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ چینی ملیشی، خلیج فارس کے کچھ لوگ اور کچھ ہندستانی بھی آ کر آباد ہوئے تھے۔اس لیے تھائی لوگوں کی ساخت ملی جلی ہے۔ بیشتر یہ لوگ پستہ قد اور سانولے رنگ مگر تیکھے نقوش کے ہوتے ہیں۔ ۱۷۲۸ء میں راجہ ''راما یکم'' نے موجودہ ''چکری سلطنت'' کی راجدھانی کے لیے بنکاک کا انتخاب کیا تھا۔ پھر راجہ ''مونگ کٹ'' (راما چہارم) نے مغربی تہذیب کو اپنایا۔اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ عوام میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی مگر باہر وہ ایک متنازعہ فیہ کہانی کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں ہم نے نیویارک میں ڈراما "The King And I" دیکھا تھا۔مشہور زمانہ اداکار ''یول بر ینز'' نے اس ڈرامے میں راجہ ''مونگ کٹ'' کا کردار بڑے شاندار طریقے سے ادا کیا تھا مگر تھائی لوگ اس کہانی سے (جس کی فلم بھی بنی تھی) ناخوش تھے اور حکومت نے فلم پر پابندی لگا دی تھی۔ مجھے اس ڈرامے میں کوئی ناقابلِ نمائش بات نظر نہ آئی مگر تھائی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بادشاہت کے خلاف ایک پروپیگنڈہ ہے۔خیر بادشاہت چیزے دیگری ـــــ کیا کیا جائے! مگر ''یول بر ینز'' نے فرعون کے رول کے بعد شاید اس ڈرامے میں یادگار رول ادا کیا تھا۔ یہی شاید اس کی زندگی کا آخری ڈراما بھی تھا۔ ہاں راجہ ''مونگ کٹ'' کی ایک اور بات مشہور ہے کہ ''ہز میجسٹی'' نے ''امریکی سول وار'' کے دوران صدر ابراہم لنکن کو اپنی مدد اور ہاتھیوں کا دو جوڑا پیش کرنے کے لیے خط لکھا تھا جسے امریکی صدر نے شکریہ کے ساتھ رد کر دیا تھا۔تمام نادانیوں کے باوجود راجہ مونگ کٹ اور اس کا بیٹا ''چولالونگ کورن'' (راما پنجم) جس نے

۱۹۱۰ء-۱۸۶۸ء تک حکومت کی تھی۔ اپنے ملک کو مغرب کی یلغار سے بچاتے رہے اور جنوب مشرق ایشیا میں تھائی لینڈ واحد ملک تھا جو برٹش کالونی نہ بنایا جا سکا۔ اس پر تھائی بڑا فخر کرتے ہیں اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ آج ''ہز میجسٹی راجہ بھومی بول ادلیا دیج'' تھائی لینڈ کے مائی باپ ہیں۔ ۱۹۳۲ء سے تھائی لینڈ میں ''آئینی بادشاہت'' ہے۔ ان کی دستور سازی کے باوجود بھولے بھالے لوگ آج بھی اپنے راجا کی پوجا کرتے ہیں! یعنی بنیادی طور پر یہاں کے لوگ بھولے بھالے ہیں۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ''گرانڈ پیلس'' چلنے کو کہا۔ پورا شہر قمقموں سے جگمگ کر رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کر ہماری گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی۔ دس منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے محل کا پتہ پوچھا۔ اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا ــــ میں نے کرایہ دے کر ٹیکسی چھوڑ دی۔ ایک خلقت محل کی طرف رواں تھی ۔ میں بھی اِدھر اُدھر دیکھتا اسی جانب چلنے لگا۔

شاہی محل کے احاطے میں ایک دل کش شہر آباد تھا۔ صدر دروازے پر دو دیو قامت راکشش، مکروہ شکل مگر دیدہ زیب رنگوں اور مینا کاری سے آراستہ تھے۔ زرق برق ملبوسات میں خوش شکل زائرین سیلِ رواں کی طرح امڈے آ رہے تھے۔ ہر عمر، شکل اور قد کے بدھ راہب بھی گیروے لباس میں گھوم رہے تھے۔ کوئی میل بھر لمبی فصیل نے محل اور دیگر شاہی عمارتوں کو اپنے احاطے میں لیا ہوا تھا۔ عام دنوں میں محل کے دروازے عوام کے لیے بند رہتے ہیں مگر آج کی تقریب میں دعوتِ عام تھی۔ چکری سلطنت کے ہر راجہ نے محل کی توسیع میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لی تھی اور ہر ایک نے ایسی نئی عمارت کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہاں روایتی تھائی فنِ تعمیر، جس میں عمارتوں اور مندروں میں منقش منارے اور تیز رنگوں کی ٹائلی والی چھت اور پگوڈا نما مندر کے ساتھ کلاسیکی یورپین کاٹج نما عمارتیں بھی اپنی شان وشوکت دکھا رہی تھیں۔ شاہی دربار جسے ''ڈوسٹ ہال'' بھی کہتے ہیں۔ اس کے سامنے دو سو سال پرانے چینی شیروں کا جوڑا آنے والوں کا استقبال کر رہا ہے۔ قریب کے محل میں ایک جمِ غفیر کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہی راما پنجم کا تخت ''چکری مہا پراساد'' ہے اور راجہ پالکی میں بیٹھ کر اس تخت تک آتے تھے اور ہاتھی پر سوار ہو کر ہر روز محل کا چکر لگاتے تھے (کیوں کہ دیگر مصروفیات نہیں تھی۔)

محل کے باہر بہت سارے مقامی بچے ہاتھوں میں پنجرہ اٹھائے، جس میں مقید چڑیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں، زائرین کو روک روک کر فروخت کر رہے تھے۔ مقامی لوگ ان بچوں سے چڑیاں خرید کر آزاد کر رہے تھے۔ پنجرے کا دروازہ کھلتے ہی چڑیاں ہوا سے باتیں کرنے لگتیں اور بچے، بوڑھے، جوان تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی نیک نیتی اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ویسے یہ بدھ مت میں کارِ ثواب تصور کیا جاتا ہے

۔مگر آزادی کے حامی تھائی عوام اپنے خودکار سونے کے پنجرے سے غافل نظر آئے۔شاید ابھی گھٹن کا احساس جاگا نہیں تھا یا یہ لوگ کسی کے منتظر تھے کہ وہ پنجرے کا دروازہ کھول دے۔مگر ہر آزادی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے' چڑیوں کی طرح! اس منظر کو محفوظ کر لینے کے لیے میں نے چند تصویریں کھینچ لیں۔ یہ میرے کیمرے سے بنکاک کی پہلی تصویر تھی۔

بنکاک کا سنگِ بنیاد جسے ''لاک مونگ'' کہتے ہیں اور جسے ''راجا راما اول'' نے نصب کیا تھا' بہت سے لوگوں کے لیے عقیدت کا مقام تھا۔لوگ اس پر پھول کے ہار چڑھا رہے تھے۔آس پاس کچھ دیوداسیاں محوِ رقص تھیں۔ان کا رقص جنوبی ہند کی کتھاکلی سے ملتا جلتا تھا۔قریب ہی ''پراما نے گراؤنڈ'' تھا جو عام دنوں میں شاہی جنازے کے لیے استعمال میں آتا تھا مگر آج اس پر میلہ لگا تھا۔رنگ برنگی پتنگ، طرح طرح کے پھول، قسم قسم کے کھانے، بھانت بھانت کے لوگ باگ خرید رہے تھے۔ ہر کوئی خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔

ان شاہی محلات کے زیر سایہ ایک شاہی مندر بھی تھا جسے ''واٹ پھرا کیو'' کہتے ہیں' جو ہزاروں زائرین اور شائقین کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔قطار میں لگ کر پہلے جوتا اتروایا گیا۔پھر کیمرہ لے کر ایک ٹوکن دے دیا گیا کیوں کہ تصویر اتارنے کی ممانعت تھی۔ پتہ نہیں کیوں! پھر یہ بتایا گیا کہ غیر بدھسٹ حضرات' احترام کا خیال رکھیں' کسی طرح کی بے ادبی برداشت نہیں کی جائے گی۔ باہر والے میری طرح ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئے۔سامنے ایک سنہرے منبر پر ایک سو فیصد خالص زمرد کا سبز بدھا گیان دھیان میں مست تھا۔اس پر ڈرامائی کیفیت طاری کرنے کے لیے تیز اسپاٹ لائٹ کی روشنی ڈالی جارہی تھی۔ لوگ عقیدت سے مرے جا رہے تھے۔ یہاں کی بھیڑ سے میری طبیعت الجھنے لگی۔موقع ملتے ہی میں بھی بڑی عقیدت سے دبے پاؤں باہر آ گیا۔

شام بھیگ چلی تھی اور میں تھک چکا تھا۔سنا گھنٹہ بھر بعد راجہ صاحب اپنی پرجا سے خطاب کرنے کے لیے درشن جھروکے میں آئیں گے۔بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بھیڑ سے بچتا بچاتا باہر نکلا۔لوگ اب بھی ہر طرف سے محل کی جانب بڑھ رہے تھے۔میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ہوٹل کا نام بتایا۔کچھ ہی دیر میں ہم اپنے عارضی مسکن کے سامنے کھڑے تھے۔کرایہ دے کر باہر نکلا تو روشنی میں نہایا بنکاک دور دور تک جگمگ کر رہا تھا۔ میں نے ایک تصویر ''سوکھوم وٹ روڈ'' کی اتار دی اور پھر قریب ہی کھڑے ایک بھلے مانس سے اپنی تصویر کی گزارش کی۔پس منظر میں ہوٹل ایمبا سیڈر چمک رہا تھا۔تصویر اتار کر بندے نے کیمرہ واپس کیا اور قریب آتے ہوئے بولا' سر' مساج! اس بار غصہ کی بجائے مجھے ہنسی آئی' آ بیل مجھے

مار —— کم بخت میں نے بھی کس کو پکڑا! میں نے کہا ابھی تک پورے طرح تھکے نہیں۔ جب تھک جائیں گے تمھیں ڈھونڈ کر نکال لیں گے۔ بندے نے فوراً جیب سے ایک کارڈ نکالا اور بڑھاتے ہوئے چہک کر بولا ''سر' اپنی ٹائم۔''

میں نے کارڈ دیکھے بغیر جیب میں ڈالا اور اس سے جان چھڑائی۔ ہوٹل کے گیٹ سے تھوڑے پرے کچھ سناٹا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں ایک ٹھیلہ والا گنگناتے ہوئے کچھ تل رہا تھا۔ اس کے خوانچے پر بھورے رنگ کی کسی شئے کا ڈھیر لگا تھا۔ میں قریب جاتے ہوئے دیکھنا چاہ رہا تھا کہ بندے نے ایک گرما گرم بادام نما شئے منہ میں ڈالی۔ زور سے پٹ کی آواز آئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''باتنگا!'' لعنت ہے —— معلوم ہوا بھائی میاں ٹڈے تل کر بیچ رہے ہیں۔ مزا اس کا جیسا بھی ہو مجھے ایک پھریری سی آ گئی۔ میں لپک کر ہوٹل میں داخل ہوا۔ استقبالیہ والی خانم کو دیکھے بغیر پانچویں منزل پر اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ مگر سوختہ ٹڈے کا سوچ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

واقعی بنکاک مسکراہٹوں کا شہر تھا!

☆☆☆

''میں گوتم نہیں ہوں''

صبح آنکھ کھلی تو سات کا عمل ہوگا۔ دور کسی مندر میں گھنٹے کی آواز گونج رہی تھی۔ تھوڑے وقفے سے بھجن کی سی گانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ابھی ٹریفک کا شور شروع نہیں ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کچھ جاگا کچھ سویا بنکاک بڑا معصوم لگا ـــــ تھوڑی دور پر زعفرانی چادر لپیٹے تین بوڑھے اور دو بچے بدھ سائل نظر آئے۔ رسوم اور عقیدے کی سختی نے بچوں کے چہرے سے بچپن کی شوخی چھین کر سنجیدہ بنا دیا تھا۔ پانچوں بڑے گمبھیر آواز میں صبح کی پھیری پر نکلے تھے۔ انھوں نے ایک کالے کاسۂ گدائی کو جس پر چمکتے ہوئے پیتل کی سپاٹ تھالی ڈھکی تھی بڑی مضبوطی سے اپنے پیٹ سے لگا رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ کاسہ کوئی الگ شئے نہیں بلکہ ان کے پیٹ ہی کا حصہ ہو! آج بھی بدھ سائل صبح و شام گھر گھر گھوم کر سوال کرتے ہیں اور تھائی لوگ چاول اور دیگر کھانے کی چیزیں ان کے کاسوں میں ڈال دیتے ہیں۔ راہب یا سائل اس دین کو خیرات نہیں سمجھتے، نہ ہی لوگ انھیں خیرات سمجھ کر دیتے ہیں بلکہ ان کا ایمان ہے کہ سائل ان کے کھانے کو قبول کر کے انھیں ثواب کمانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ہر مذہب کی طرح بدھ مت میں بھی عذاب و ثواب کے بڑے عجیب و غریب طریقے رائج ہیں :

''تم ایک پیسہ دو گے وہ دس لاکھ دے گا''

بودھی راہب کی سخت کوشی بحث طلب موضوع ہے مگر ان کی سادگی اور بے نیازانہ زندگی پر مجھے بڑا پیار آتا ہے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں بھی ایک بے نیاز اور بے ضرر ملنگ پل رہا ہے، مگر میری آوارگی اپنی جگہ ـــــ! میں نے جلدی جلدی خود کو تیار کیا اور نیچے آیا۔ ہوٹل کے کیفے میں ولایتی ناشتہ یعنی دو سلائس، مکھن، جام، سنترے کا رس اور کافی پی کر ۷۵ بھات کا بل ادا کیا اور باہر نکل پڑا۔

آج موسم گرم تھا۔ خشک ہوائیں چل رہی تھیں اور ٹریفک کا شور اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا۔ میں آج بدھ مت کے مختلف موڈ، شکل اور انداز کے مجسّمے دیکھنے نکلا تھا۔ تھائی لینڈ میں ۹۰ فیصد تھائی ''تھیرواوا بدھ ازم'' پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی روزانہ زندگی پر اس عقیدے کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ مورخ بتاتے ہیں کہ ہند کے شہنشاہ اشوک نے جب بدھ عقیدہ اپنایا تو تیسری صدی کے دوران اپنے مفکروں اور راہبوں کو بدھ مت کی تبلیغ کے لیے جنوب مشرقی ایشیا روانہ کیا۔ اس دوران تھائی لینڈ کے ''ناکھون پاتھم'' کے علاقے میں پہلے پہل اس عقیدے کا ظہور ہوا۔ بدھ مت نے زندگی کی بے ثباتی، روح کے استقامت، کردار کی پختگی کے علاوہ آرٹ اور فنِ تعمیر کو بھی بڑا فروغ دیا۔ تھائی حاکموں اور بدھ مت کے ماننے

والوں نے ہمیشہ دوسرے عقیدے اور فلسفے کی بھی عزت کی ہے' اسی لیے تھائی لینڈ میں اسلام' عیسائی' ہندو اور سکھ عقیدے کے ماننے والوں کو پوری آزادی ہے۔

تھائی اپنے مندروں کو''واٹ'' کہتے ہیں اور بنکاک میں تقریباً ۲۰۰؍ بودھی واٹ موجود ہیں۔ میں ان میں سے چند کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے ہاتھ کے نقشے کے مطابق قریب ہی''واٹ آرون'' یعنی صبح کا مندر موجود تھا مگر ٹیکسی والے نے مشورہ دیا کہ اس ٹریفک میں پھنسنے کی بجائے میں اسٹیمر سے پانچ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ اس نے مجھے گھاٹ پر چھوڑ دیا۔ ہمارے لوگوں کی طرح تھائی بھی لین دین میں بہت بھاؤ تاؤ کرتے ہیں۔ اسٹیمر جا چکا تھا۔ دوسرا گھنٹہ بھر بعد جانے والا تھا۔ میں نے ایک کشتی والے سے بات کی' اس نے میرا حلیہ دیکھا اور سو بھات طلب کر لیے۔ بہت ہاں' نا کے بعد وہ ۴۰؍ پر تیار ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا اتنے بھی زیادہ ہیں مگر وقت کی تنگی کے سبب میں چل پڑا۔

بنکاک''چاؤ پھیا'' دریا کے کنارے آباد ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم شہر کے ہنگاموں سے دور ہوتے چلے گئے۔ دریا میں کشتی کی سواری نے کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا۔ میں نے کچھ تصویریں بنکاک کے ساحل اور اپنے مانجھی کی اتاریں اور اس پار مندر کے متعلق پوچھا۔ وہ انگریزی نہ جانتا تھا مگر کہنے لگا ''تھون بوری۔'' میں سمجھ گیا یہ اس علاقے کا نام ہوگا۔ مجھے''واٹ آرون'' کے منارے نظر آنے لگے جو دھوپ کی کرنوں سے چمک رہے تھے۔ تھائی اپنے مندروں کو بہت مرصع اور بڑا منقش بناتے ہیں۔ ان مندروں کا اپنا مزاج اور حسن ہوتا ہے جو کسی اور ملک کے مندروں خواہ وہ بدھ مندر ہوں نہیں ملتا۔ اس پار پہنچ کر میں نے اپنے کم گو مانجھی کی چھٹی کی اور''صبح کے مندر'' کی طرف بڑھنے لگا۔ اس مندر کے بیچ قطب مینار کے جیسا اونچا ایک منارہ تھا جسے''پرنگ'' کہا جاتا ہے۔ تمام عمارت اینٹ کی بنی تھی مگر مناروں پر چینی مٹی کے ٹکروں سے میناکاری کی ہوئی تھی' جگہ جگہ شیشہ بھی نصب تھے جو دھوپ میں چمک رہے تھے۔ مجھے ان نقش ونگار نے بہت متاثر نہیں کیا۔ میں مندر کے صحن میں کافی خرید رہا تھا کہ کچھ سیاح کسی خالص سونے کے بدھا کی باتیں کر رہے تھے۔ پتہ چلا کہ شہر میں چائنا ٹاؤن کے نزدیک کسی''واٹ ٹیری میٹر'' میں عجوبہ رکھا ہے۔ میں نے کافی ختم کی اور خراماں خراماں ساحل تک آیا۔ ایک اسٹیمر واپسی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ٹکٹ صرف دس بھات۔ مجھے خاموش مانجھی اور ۴۰؍ بھات یاد آ گئے۔ خیر آج میں اس کا حاصلِ روزگار بنا تھا۔ دعائیں دے رہا ہوگا یا میری بے وقوفی پر ہنس رہا ہوگا۔ میں خود اپنی بے وقوفی پر ہنس پڑا تھا ——پانچ منٹوں میں ہم واپس شہر کے ہنگاموں میں کھڑے تھے۔

ہر ملک کی طرح بنکاک کا چائنا ٹاؤن بھی اپنی انفرادیت، وضع قطع لیے اپنے آپ میں مگن تھا۔ چینی

قوم بھیڑ بکری کی طرح ہوتی ہے۔ جہاں ایک چلی سب اس کے پیچھے۔اس اکائی اور بھائی چارگی کی جتنی خوبیاں ہیں، اتنی برائی بھی ہے۔اس طرح یہ لوگ اپنے خول میں بند رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے نہ کوئی مطلب، نہ واسطہ —— چینی بھائی بندوں، رنگ برنگی دکانوں، مچھلی بازار، الم غلم بیچتے خوانچہ والوں اور چینی ریستورانوں کے سامنے سے گزرتا میں ''واٹ ٹری میٹر'' پہنچا۔ یہاں کافی تعداد میں زائرین موجود تھے۔معاملہ شاید خالص سونے کے مہاتما بدھ کا تھا۔ یہاں فوٹو کھینچنے پر پابندی نہ تھی۔ حالاں کہ سونے کی موجودہ قیمت دیکھ کر ہونی چاہیے تھی۔مندر کے صحن میں اگربتیوں کی تیز خوشبو سے فضا معطر تھی اور دماغ اڑا جاتا تھا۔اندر مندر یا ''اسٹوپا'' پر بدھ کا عظیم مجسمہ اپنے دھیان میں گم تھا۔معلوم ہوا عرصۂ دراز تک اس مجسّمے پر ایک ملمّع چڑھا کر اس کے خالص سونے کو صیغۂ راز میں رکھا گیا تا کہ باہر والوں کی نظرِ بد اور خاص کر برما کے حملہ آوروں سے اسے بچا کر رکھا جا سکے۔مگر ۱۹۵۳ء میں اس ۸۰۰ سالہ قدیم مجسّمے کو ایک مندر سے دوسرے مندر منتقل کیا جا رہا تھا کہ کرین کا ہک ٹوٹ گیا اور مجسّمے کے ملمّع میں شگاف پڑ گیا جس سے سونے کی چمک باہر جھانکنے لگی اور پھر عوام سے یہ راز چھپایا نہ جا سکا۔ مجھے اس مجسّمے میں کوئی خاص فن کاری نظر نہ آئی۔دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا مجسمہ تھا مگر ساڑھے پانچ ٹن ٹھوس اور خالص سونے کی قیمت اور اہمیت کو عالم قدر کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور تھا۔ یہاں بھی مختلف اسپاٹ لائٹ کی کرنیں اسے چمچما رہی تھیں اور لوگ ہر زاویے سے فوٹو کھینچنے میں مصروف تھے۔ پہرہ بڑا سخت تھا اور عقیدت بھی بڑی گہری تھی۔ میرے قریب دو امریکی جوان اپنے کیلکولیٹر پر ۵ر ٹن سونے کی قیمت نکال رہے تھے۔ میں نے کان کھڑے کیے۔ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ۵۰۰ر ڈالر ایک آؤنس کے حساب سے بے چون و چرا ۵ر ٹن کا سیدھا سا لڈ ۸۹ر ملین ڈالر بنتا ہے۔ پتہ نہیں ان سناروں نے آدھا ٹن کیوں چھوڑ دیا تھا۔ بے چارے تھائی ڈرنے میں حق بجانب تھے۔لوگ کھڑے کھڑے گولڈن بدھا کی مارکیٹ ویلیو نکال رہے تھے۔ بہتر ہوگا کہ مندر کے ذمہ داران اس نیندا چاٹ مجسّمے کو کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دیں۔

واپسی پر چائنا ٹاؤن میں ایک چینی نعمت کدہ کچھ قاعدے کا لگا اور ہم بلا جھجک اس میں داخل ہو گئے۔میزبان خالص چینی تھی۔انگریزی نہ جانتے تھے۔مگر مینو چائینیز، تھائی اور انگریزی زبانوں میں چھپا تھا۔ میں نے دیکھ بھال کر جھینگا منگایا۔سادہ ابلا ہوا چاول اس کے ساتھ آنا تھا۔ پینے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ مینو میں گنے کا رس اور ناریل کے دودھ پر نظر پڑی۔ میں نے ناریل کا آرڈر مینو پر انگلی رکھ کر بتایا۔ ویٹرس گردن ہلاتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بڑے گلاس میں چھلے ہوئے برف میں ناریل کا تھوڑا سا دودھ اور ایک چمچہ لیے حاضر ہوئی۔ ساتھ میں شکر کا پیالہ۔میں سمجھ گیا کہ برف پر شکر چھڑک کر کھانا ہے

۔مجھے بچپن میں کھائے ہوئے برف کے رنگ برنگی گولے یاد آ گئے۔ناریل کا شربت مزے کا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے میں اسے صاف کر گیا۔پھر ویٹرس نے سادہ چینی چائے کی کیتلی اور ایک چھوٹا سا پیالہ سامنے لگا دیا۔عموماً یہ چائے مجھے بے مزا لگتی ہے مگر اس وقت کرنے کو کچھ اور نہ تھا۔میں چائے سے شغل کرنے لگا۔ جب کافی دیر ہو گئی تو مجھے تشویش ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ساتھ ہی اپنے ایک امریکی دوست کا واقعہ یاد آ گیا ۔فرینک چند برس پہلے شنگھائی گیا تھا۔ایک شام وہ کسی چینی ریستوران میں پہنچا اور پوچھا ''ہاٹ ڈاگ'' ہے۔ویٹرس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور اشارہ پاتے ہی آرڈر لانے چلی گئی۔گھنٹہ بھر بیٹھنے کے باوجود کھانا نہ آیا تو اسے حیرانگی ہوئی کہ ''ہاٹ ڈاگ'' جیسے معمولی سینڈوچ نما کھانے میں اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے۔وہ مزید حیران ہوا کہ جب ویٹرس نے پلیٹ میز پر اس کے سامنے رکھی ۔ چند گوشت کے پارچوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔اس کے کنارے قرینے سے فرائڈ رائس سجی تھی۔معلوم ہوا کتے کے نفیس پارچوں کو گرم گرم پیش کیا گیا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ بھونکنے لگتا مینیجر نے آ کر معاملہ سنبھالا۔اب پتہ نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے مگر وہ سبھوں کو ہنستے ہوئے تنبیہ ضرور کرتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے علاوہ کہیں ''ہاٹ ڈاگ'' کبھی نہ مانگنا ورنہ...... میں آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا کہ میرا کھانا آ گیا۔میں نے غور سے دیکھا کہ کوئی دم وغیرہ تو ہل نہیں رہی ہے مگر پلیٹ میں بے چارے جھینگے شرافت سے پڑے تھے۔جھینگے تھے تو جغادری مگر مزا بالکل ابلا ہوا تھا۔میں اوپر سے مرچ مسالہ ڈال کر اسے کھا گیا۔ہمارے منہ کو جو چینی پکوان لگے ہیں دراصل وہ دیسی چینی ہیں جو ہمارے ذائقے کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔ٹورانٹو میں بمبئی کا ایک چینی باورچی ہے۔اس نے ویٹرس بھی ہندستانی چینی رکھے ہیں۔ہمارے علاوہ دیگر دیسی بھی اس ریستوران کے لگے بندھے مہمان ہوتے ہیں کیوں کہ کھانا مرچ مسالوں سے مزین ہوتا ہے۔

دوپہر ایک بجا چاہتا تھا اور قاعدے سے مجھے اب ایک اور مندر دیکھنا تھا جس کے لیے مشہور ہے کہ بدھا کی دیوقامت مورت وہاں لیٹی ہوئی ہے۔چلیے صاحب بدھا جی کو کھڑا اور بیٹھا دیکھ لیا' لیٹے بھی دیکھ لیتے ہیں۔اس مطلوبہ مندر کا نام ''واٹ پھو'' تھا جو معلوم ہوا شاہی محل کے عقب میں واقع ہے۔اب مجھے پہلے خبر ہوتی تو کل ہی دیکھ لیتے۔میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک آٹو رکشا روکا اور پچھتایا کیا۔اس مندر تک پہنچتے پہنچتے ڈگ ڈگ ٹیکسی کے شور سے میرے دماغ کی رگیں پھٹی جاتی تھیں۔لگتا تھا ڈرائیور پہلے سرکس میں تار پر کرتب دکھایا کرتا تھا۔وہ وہ موڑ جوان نے کاٹے اور وہ برق رفتاری دکھائی کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ لائف انشورنس کے کاغذات میرے ساتھ ہیں یا ٹورانٹو بھول آیا ہوں۔موت سے آنکھیں ملاتے ہم لوگ ''واٹ پھو'' پہنچے۔میں نے اسے ۳۰ بھات دیے۔وہ دادطلب نگاہوں سے

مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بندے کی پیٹھ تھپتھپائی کہ پہلوان صحیح جا رہے ہو اور خود پر لعنت بھیجتا مندر میں داخل ہوا کہ آج خرچ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

''واٹ پھو'' نہ صرف ایک مندر بلکہ بدھ خانقاہ بھی ہے۔ یہ بنکاک کا سب سے قدیم مندر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۶ ویں صدی میں رکھی گئی تھی۔ مندر کے صحن میں بڑی بھیڑ تھی۔ آرام فرماتے ہوئے مہاتما کی مورت تقریباً ۱۸۰ فٹ لانبی تھی اور کوئی ۵۰ فٹ اونچی۔ ایک خلقت یہاں تصویر کھینچنے میں مگن تھی۔ میں نے سوچا عموماً بدھا کو میں نے بیٹھے یا کبھی کبھی مالا جپتے کھڑا دیکھا ہے۔ پتہ نہیں دوبارہ موصوف قیلولہ کرتے ملیں یا نہ ملیں۔ ان کی ایک تصویر اتارنا چاہیے۔ صحن میں ایک میلہ لگا تھا۔ بھیڑ کے ساتھ شور بھی تھا۔ لوگ عبادت کم خرید وفروخت زیادہ کر رہے تھے۔ پوسٹ کارڈ اور تصویریں بیچتے لڑکے، مونگ پھلی اور سگریٹ بیچتے جوان، اگربتی اور موم بتیاں بیچتے بوڑھے، ہر طرح کے خوانچہ والے اور ہر قسم کے سیاح اور زائرین نے مجمع لگا رکھا تھا۔ یہاں بھی بھیڑ سے میری طبیعت الجھنے لگی تو میں پچھواڑے کی طرف نکل گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے پگوڈے بنے تھے اور سنگِ مرمر کے بت باغ میں لگے تھے۔ کچھ چیزیں آثارِ قدیمہ کی لگیں۔ ایک راہب سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ ''آیوتھیا'' کے قدیم نمونے ہیں۔ مجھے لگا کہ یہ نام ہند کے ''اجودھیا'' سے لیا گیا تھا۔ راہب نے میری دلچسپی دیکھ کر ایک بڑے سے ڈبے کی طرف اشارہ کیا کہ کچھ نذرانہ بھی ہو۔ صرف عقیدت مندی سے گاڑی نہیں چلتی۔ مجھے مزاروں کے مجاور یاد آ گئے۔ یہ سب ایک ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ یہ جگہ اور طریقے بدل لیتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر ڈبے میں چند سکے ڈال دیے کہ اس بہانے ان کا بھلا ہوگا اور شاید کچھ کام کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ میری فیاضی دیکھ کر راہب نے ایک بیڑی سلگائی اور بتانے لگا کہ ۱۳۵۰ء میں ''آیوتھیا'' اس دور کے لیے ''سیام'' کی راجدھانی بنا' جو چار صدی تک قائم رہا۔ یہ دور سیام اور بدھ مت کا زریں دور تھا۔ مگر ۱۷۶۷ء میں برما کے شدید حملوں سے پورا شہر تباہ ہو گیا۔ ''راجہ تاک سین'' نے پھر بنکاک کو راجدھانی بنایا۔ پھر بوڑھے راہب نے زمانۂ قدیم کی چند نادر مورتیاں دکھائیں۔ کچھ مورتیاں پانچویں صدی کی بھی تھیں۔ خاص مندر کے پیچھے راہبوں کے مکان بھی تھے۔ وہیں کچھ غیر آباد مندر بھی نظر آئے۔ میں اپنے تجسس میں اس طرف بڑھنے لگا۔ ایک جواں راہب اس ویران مندر کے صحن میں آنکھیں بند کیے آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اندر کچھ اندھیرا تھا۔ یہاں بدھ کی ایک شکستہ مورت اپنے ماضی میں گم تھی۔ ساتھ ہی بے شمار چمگادڑیں مورت سے چمٹی' کچھ چھت سے الٹی لٹک رہی تھیں۔ آہٹ پر کچھ پھڑ پھڑانے بھی لگیں۔ فضا میں گھٹن اور زمین پر ہر جگہ چمگادڑوں کی بیٹ پڑی تھی۔ اس کا تعفن مت پوچھیے' میں فوراً باہر نکل آیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ راہب

شدت پسند کیوں ہوتے ہیں، یا تو اگر کی تیز خوشبو سے دماغ اڑا دیں گے یا گھٹن یا تعفن سے پریشان کر دیں گے۔ یہ اپنے معاملے میں میانہ روی کیوں نہیں اختیار کرتے۔ نروان کے لیے کیا یہ بیچ کا راستہ اختیار نہیں جا سکتا؟ شاید نہیں! میں ان سوالوں میں الجھتا باہر آیا۔ کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے واپسی کے لیے مڑا، کچھ دور کھلے میدان میں ایک بوڑھا راہب تقریر کر رہا تھا۔ اس کے گرد کافی لوگ جمع تھے۔ میں بھی رک گیا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک پتھر تھام رکھا تھا۔ کہنے لگا ''دوستو، یہ ایک معمولی پتھر ہے، مگر وقت کے بدلتے دھارے ایک مدت کے بعد اسے خاک یا مٹی میں تبدیل کر دیں گے، اور مٹی میں کسی روز ایک پودا جنم لے گا یا پھر وقت کی گردش اسے کیڑا، جانور یا انسان کی شکل دے دے گی۔ یہ پتھر صرف پتھر نہیں، یہ بھگوان اور بدھا بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس کی قدر اور محبت اس لیے نہیں کرتا کہ یہ ایک شئے سے دوسرے میں تبدیل ہو سکتا ہے، میری محبت اس لیے ہے کہ یہ شروع سے ہی سب کچھ تھا اور ہے ــــ یعنی ازل سے تھا اور ابد تک رہے گا ــــ اس لیے جان لو کہ یہ پتھر پھول ہے ــــ انسان ہے ــــ دیوتا ہے! دوستو یہ میری باتیں نہیں، سدھارت کا کہا ہے، میں تو ان کے کہے کو دہرا رہا ہوں ــــ میں بس ایک ذریعہ ہوں ــــ جیسے یہ پتھر!'' تھائی لوگ اس تقریر پر سر دھن رہے تھے، اشک بار آنکھیں لیے گہری سوچ میں گم تھے، مگر سیاح بھٹک گئے تھے۔ سفید فام لوگوں کی سمجھ سے یہ باتیں بالاتر تھیں۔ خود میں الجھ گیا تھا۔ کچھ دور چل کر میں نے ایک سایہ دار درخت دیکھا اور اس کے سائے میں ستانے بیٹھ گیا۔ ذہن میں مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی کی مشہور نظم ''میں گوتم نہیں ہوں'' کلبلانے لگی۔ مجھے یہ نظم اس قدر پسند ہے کہ اس موضوع پر میں نے ایک ڈراما بھی لکھا تھا جسے نیویارک ڈراما فیسٹیول میں انعام سے نوازا بھی گیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ راہب کی تقریر کے بعد میں اس نظم کو با آوازِ بلند لوگوں کے سامنے پڑھوں مگر زبان اور ماحول نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا مگر میں اسے قلم بند کر سکتا ہوں، اپنے ذہن کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے میں زیرِ لب پڑھنے سے خود کو روک نہ سکا :

''میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں جب بھی گھر سے نکلا تھا
یہی سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
میں بھی کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھوں گا
مجھے بھی کچھ گیان حاصل ہوگا

مگر جسم کی آگ جو گھر سے لے کے نکلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
اک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک بس
خلا ہی خلا ہے —— !''

میں اس نظم میں ڈوبا ہوا تھا کہ غیب سے ندا آئی ''دانش'' میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں موند لیں کہ میں تو اپنا راستہ خود تلاش کرنے کا عزم لے کر چلا تھا' یہ گوتم سدھارت نے کیوں کر آواز دی —— دوسری آواز قدرے قریب سے آئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں' سامنے نیویارک والا اقبال سنگھ کھڑا تھا۔ وہی ہنس مکھ چہرا، شریر آنکھیں، شوخ پگڑی اور استری لگی داڑھی' ارے جگر کہتا ہوا میں اس سے لپٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا ''حضور نروان کی کس منزل سے میں آپ کو گھسیٹ لایا'۔ میں ہنسنے لگا۔ سارا فلسفہ رفو چکر ہو چکا تھا۔ میں نے کہا' بزرگ ٹھیک کہتے ہیں کہ جب منزل بالکل سامنے ہوتی ہے' شیطان بہکا دیتا ہے —— خیر کہاں بھئی؟ یار آج کل ٹور کنڈکٹ کر رہا ہوں' بیس بندوں کو لے کر پرسوں ہی نیویارک سے آیا ہوں —— ویسے تم کہاں؟ بس آوارگی! تم نہیں بدلو گے دانش۔ جگر تم بھی کہاں بدلے۔ ویسے یار وقت بدلتا رہتا ہے' ہم سب وہی رہتے ہیں' جو بنیادی طور پر ہیں! میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ بنکاک میں اقبال سنگھ سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس نے دوبارہ پوچھا کب آئے' کہاں ہو اور کب تک کا ارادہ ہے۔ میں نے بتایا کہ دو روز سے نروان کے مختلف عکس دیکھ رہا ہوں۔ ایمبا سیڈر میں قیام ہے اور پرسوں واپسی کا سوچ رہا ہوں۔ اقبال نے کہا میرے آج کے ٹور کا آخری حصہ رہ گیا ہے۔ یہاں سے گھنٹہ بھر دور ''دریائے کوائی'' ہے' وہاں بس لے جانی ہے' تم بھی ساتھ چلو' میں نے گھڑی دیکھی' سوا تین بجے تھے۔ اقبال سنگھ نے پھر ٹھوکا دیا' چلو یار تفریح رہے گی اور ہاں واپس آ کر ہوٹل کی چھٹی —— میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ میرا جواب سنے بغیر اس نے اپنے مہمانوں کو

جمع کرنا شروع کیا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

مندر کے باہر بس تیار کھڑی تھی۔ بیس مرد وزن کو گن کر گائیڈ صاحب نے ڈرائیور کو منزل کا پتہ بتایا اور ہم لوگ چل پڑے۔ اقبال اپنے ٹورسٹ حضرات کے سوال و جواب میں لگا تھا اور میں اس زندہ دل دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹھیک چار سال قبل اس سے بڑی افسانوی ملاقات ہوئی تھی۔ اقبال سنگھ میرے نیویارک کے قیام اور جدوجہد کے دنوں کا ساتھی تھا۔ جتنی نفیس انگلش بولتا تھا اس سے خوش رنگ اشعار اسے یاد تھے۔ اردو زبان سے اسے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ ہم لوگ اکثر نیویارک کی یخ بستہ شاموں میں اس کے یہاں جمع ہوتے تھے اور رات گئے شعر و ادب، ڈراما، فلم اور موسیقی پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اسے حسرت ہی رہی کہ میں اسے اپنے ڈرامے میں رول دیتا۔ میرے ڈرامے عموماً سماجی مسائل یا بغاوت پر مبنی ہوتے تھے اور بندہ مسخرہ بننا پسند کرتا تھا —— ہاں جگر' اب سناؤ، اقبال نے میرے خیالات کا جالا توڑ دیا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ایک شعر کی فرمائش کر ڈالی۔ اقبال بنیادی طور پر سنگھ تھا۔ ہر کام کرنے سے پہلے اپنی پگڑی سنبھالتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی گلابی کلف لگی پگڑی کو ٹھیک کیا اور فیض کا مشہور شعر سنایا :

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

میرا یار گو کہ امریکی تہذیب اور طرزِ رہائش کا دلدادہ تھا مگر جب شعر سناتا تو کسی اور ہی مزاج کی عکاسی کرتا تھا۔ پھر بڑی دیر تک نیویارک کی باتیں' ٹورانٹو کے قصے' پرانے دوستوں کے احوال اور پنجاب کے ناگفتہ بہ حالات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ہماری لگژری بس شہر کے ہنگاموں سے نکل کر اب مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ یہاں زندگی کا رنگ بالکل مختلف تھا۔ ہرے بھرے سبز کھیت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ دھان کے کھیتوں میں بھینس لگا کر ہل جوتا جا رہا تھا۔ تنکوں والی ٹوپی اوڑھے اور تہبند لپیٹے پستہ قد تھائی عورتیں کھیت میں جھکی کام کر رہی تھیں۔ کاشتکاری تھائی لوگوں کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش ہے مگر پیٹ بڑا بدکار ہے بابا —— تھائی لوگوں سے مساج بھی کراتا ہے اور ہر قسم کے سیاہ و سفید کی اجازت بھی دے ڈالتا ہے۔

یہاں ماحول صاف ستھرا اور پُرسکون تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے تالاب اور جگہ جگہ نہروں کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ بنکاک کو ''مشرق کا وینس'' بھی کہتے ہیں! ہمارا گزر ایک گھنے جنگل سے ہوا' جس میں کئی جگہ ہاتھی نظر آئے۔ یہ سدھائے ہوئے ہاتھی تھے جو لکڑی اور دیگر مال برداری کے کام میں مگن تھے۔ جنگل میں

ناریل کے بے پناہ جھنڈ نظر آئے۔سنا بندروں سے یہ لوگ ناریل توڑنے کا کام بھی کرواتے ہیں۔ پھر درختوں میں رسّیوں پرسفید چوکور کپڑے، بچے کے لنگوٹ کی شکل کے، سوکھنے کے لیے ایک قطار سے پھیلے نظر آئے۔ پہلے بڑا عجیب سا لگا کہ شہر سے کوسوں دور یہ لوگ اپنے بچوں کے لنگوٹ کیوں سکھا رہے ہیں مگر جب ہر دس قدم پر اس منظر نامے میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو میں نے اقبال کو دکھایا۔اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ یہ سفید خام ربر ہے اور دھوپ میں سوکھنے کے لیے لٹکے ہیں۔ پھر ایک مقام پر کچھ لوگوں کو ایک ٹرک میں ربر کے بنڈل رکھتے دیکھا جس کا رنگ مٹیالا ہو چکا تھا۔

ہم لوگ ''دریائے کوائی'' کے ساحل پر پہنچے تو تمام لوگوں کو بس سے اتار کر ایک جگہ جمع کیا گیا۔ اقبال سنگھ نے اپنے مہمانوں کو بتانا شروع کیا —— ''یہ سامنے جو پل آپ دیکھ رہے ہیں اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔اس پر ایک مشہور فلم بھی بنی تھی —— The Bridge Over The River Kwai" جو پیر بولے "Pierre Boulle" کے مشہور ناول پر مبنی تھی۔اگر آپ لوگوں نے فلم دیکھی ہوگی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دوسری جنگِ عظیم کے قیدیوں سے یہ پل بنوایا گیا تھا جو سیام اور برما کے درمیان آمدورفت کے لیے تھا۔اس پل کو ''موت کا پل'' بھی کہا جاتا تھا۔کیوں کہ ان قیدیوں پر جو سختیاں کی گئی تھیں اور کیمپ میں جس حال میں انھیں رکھا گیا تھا ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' وہاں سے کچھ ہی فاصلہ پر ''کنچنا بوری'' نام کا علاقہ تھا جہاں ۸۰۰۰؍ ہزار قبریں ان قیدیوں کی تھیں، جو اس پل کی تعمیر کے دوران کام آگئے تھے۔ بیشتر بھوک اور ملیریا سے مارے گئے تھے۔ بے شمار قبروں کے کتبے پر سادہ زبان میں غمگین اور موثر نظمیں کندہ تھیں۔ یہ قبریں برٹش، ڈچ، آسٹریلین، ملاین، ہندستانی، نیوزی لینڈ، کینیڈین اور برما کے قیدیوں کی تھیں۔مختلف کتبوں اور نشانیوں کے باوجود یہ قبریں انسانوں کی تھیں، جنھیں ان کے ہم عصر انسانوں نے مارا تھا۔مگر دنیا بھر میں ایسے بے شمار قبرستانوں اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے حادثات کے باوجود حضرتِ انسان اب بھی اسی بحث میں مبتلا ہیں کہ نیوکلیئر جنگ کس حد تک جائز ہے۔! میرے خیال میں ''جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے۔'' اب بھی ہم انسانوں کو بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ پل کے قریب ہی ایک چھوٹا سا عجائب گھر بھی تھا جس میں قیدیوں کے روزمرہ کے مسائل اور پریشانیوں کی داستان، تصویریں اور دیگر چیزیں رکھی تھیں۔ کچھ بانس اور پھوس کے تنگ و تاریک جھونپڑے بھی دکھائی دیے جن میں ان قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔

یہاں جاپان کے تشدد اور دہشت کی تصویریں بھی تھیں۔ جاپان کی امپیریل آرمی نے ۸؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو تھائی لینڈ پر حملہ کیا تھا اور بہت اودھم مچایا تھا۔ وہاں ایک گزارش نامہ بھی لکھا تھا جس میں تھائی

حکومت نے عوام سے بلکہ سارے ایشیا سے گزارش کی گئی تھی کہ اگر ان کے پاس دوسری جنگِ عظیم کی کوئی نشانی جیسے کارتوس، ہتھیار، استعمال شدہ بم، نقشے، خطوط یا ایسی دیگر چیزیں ہوں اور وہ نمائش کے لیے رکھنا چاہیں تو فلاں نمبر پر فون کریں۔'' ان باتوں کے باوجود مجھے لگا تھائی عوام امن پسند اور خوش مزاج ہیں۔ وجہ وہی ہے کہ تھائی لینڈ کبھی کسی سپر پاور کی کالونی نہیں بنا۔ اسی لیے ان کے لاشعور یا دل و دماغ میں کسی طرح کا انتقامی جذبہ یا نفرت کارفرما نہیں ہے۔

شام ہو چکی تھی۔ تمام لوگ بوجھل قدموں اور مضمحل سے بس میں واپس آئے۔ میں نے اقبال سے کہا یار خواہ مخواہ تم نے سب کو رنجیدہ کر دیا۔ اقبال سنگھ چہکتے ہوئے کہنے لگا ابھی کوئی اور چٹکلہ سناتے ہیں۔ اس نے بس کا جائزہ لیا۔ ہر کوئی خاموشی سے باہر جنگل کو گھور رہا تھا۔ دور افق پر دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنی خواب گاہ میں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔ اچانک اقبال صاحب اٹھے اور فرمانے لگے —— ''خواتین و حضرات! آپ کی داہنی طرف جو دریا رواں ہے یہ بھی بڑا مشہور ہے۔ ہالی ووڈ کا ایک ہر دل عزیز اور شریف النفس اداکار ہے ''جیمس بانڈ'' —— مسٹر بانڈ کی ایک کامیاب فلم آئی تھی —— The Man With A Golden Gun —— اس فلم میں ایک جگہ مسٹر بانڈ ایک تیز رفتار موٹر بوٹ پر دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ یہی وہ مقام ہے مہربان، اتفاق ہے کہ فلم میں وقت اور سین بھی بالکل آج ہی کی طرح تھا'' کچھ قدر دانوں نے اپنا کیمرہ درست کرتے ہوئے جنگل، دریا اور خاموشی کی تصویریں اتاریں۔ میں نے اپنا کیمرہ اقبال سنگھ پر فوکس کیا اور شٹر دبایا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ کہنے لگا چلو خوش ہو، سبھوں کا موڈ منٹوں میں بدل گیا۔ میں نے کہا ظالم جھوٹ بولتے ہو۔ اس فلم کی شوٹنگ ''پھوکٹ'' کے علاقے میں ہوئی تھی۔ یار کمال کرتے ہوئے۔ یہاں سے ۳۰۰ میل دور ہی تو ہوگا پھوکٹ۔ پھر یہاں بھی دریا، وہاں بھی دریا۔ میں نے سین کا ''سی کوئنس'' ملایا یا نہیں، یہ تو نہیں کہا کہ ہوائی جہاز سے پیچھا کر رہا تھا۔ ہم دونوں کے قہقہے سے بس لرز اٹھی!

اقبال سنگھ کی ملاقات نے بنکاک کے سفر کو زندہ و تابندہ کر دیا تھا!

☆☆☆

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

تھائی لینڈ کے معنی ''آزاد سرزمین'' کے ہیں۔ یہاں کے خوش باش اور محنت کش عوام کو شخصی آزادی حاصل ہے جو آج بھی اپنی ''بادشاہت'' اور زرّیں ماضی پر فخر کرتے ہیں۔ بارہویں صدی میں تھائی ادب، کلچر اور فنونِ لطیفہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔ راجہ ''رام کام ہاینگ'' نے چین، ہندستان اور کمبوڈیا سے فلسفہ، آرٹ، تکنالوجی اور سنگ تراشی کے ماہروں کو درآمد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے تھائی زبان کے ''حروف'' کا موجد یہی راجہ تھا۔ اپنے دور کو بیان کرتے ہوئے راجہ ''رام کام ہاینگ'' ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''ہم خوش حال لوگ ہیں، ہمارے کھیتوں میں دھان کی فروانی ہے، دریا مچھلیوں سے پر ہے، جو چاہے ہمارے سونے، چاندی اور ہاتھیوں کا کاروبار یا تبادلہ کرسکتا ہے۔'' میرے خیال میں راجہ صاحب کے اقوالِ زرّیں میں ایک سطر کا اضافہ کردیا جائے کہ ''جو چاہے اور جس قدر چاہے اس آزاد سرزمین پر رنگ رلیاں منا سکتا ہے — کھلی چھوٹ ہے۔ اور ہاں، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔''!

ٹیلی فون کی بے سری گھنٹی نے میری معلومات کی کڑی کو توڑ دیا۔ فون اقبال سنگھ کا تھا۔ آج وہ اپنے گروپ کو کسی نگینے، جواہرات کی فیکٹری دکھانے لے گیا تھا اور وقت نکال کر مجھے فون کر رہا تھا مگر فون اس لیے کیا تھا کہ وہ شام ۷ بجے سے پہلے واپس نہ ہوسکے گا۔ میں نے شام کا وعدہ کرکے فون رکھ دیا۔ دوپہر تین بجے تھے اور میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ میں نے بنکاک کی نہروں پر ''ڈولتا بازار'' کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ شاہی محل کے عقب پر دریائے ''چاؤپھیا'' سے موٹر بوٹ، چھوٹی بڑی کشتیاں سیاحوں کو لے کر تنگ اور مصروف نہروں کی سیر کراتی ہیں۔ جہاں مقامی لوگ ساگ، سبزی، پھل، انڈا، مچھلی، اناج سے لے کر سلک کے کپڑے، اوزار اور مٹھائیاں تک اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سجائے بیچتے نظر آتے ہیں۔ میں بھی ایک اسٹیمر لانچ میں سوار ہوا۔ ہم محل کے عقب سے نکلے تو شاہی جہاز اور کشتیاں نظر آئیں جو کشمیر کے ہاؤس بوٹ اور شکارے اور وینس کے ''گونڈولا'' سے کسی طرح کم آراستہ نہ تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ دریائی بازار سیاحوں میں بڑا مقبول ہے کیوں کہ ہر طرف سے چھوٹی بڑی کشتیاں، موٹر بوٹ ہمارے آگے پیچھے چل رہی تھیں، بنکاک کا ساحل، خوبصورت محل، منقش مندر اور سربلند پگوڈا کے منارے، فیکٹری سے اٹھتا دھواں اور مال بردار بادبانی جہاز سب ہمارے ساتھ ہولے ہولے چل رہے تھے۔ ساحل پر ہاتھ لہراتے بچے، شرماتی اور مسکراتی دوشیزائیں اور مکانوں سے جھانکتے بوڑھے بھی نظر آرہے تھے۔ ہمارے لانچ میں صرف سیاح نہیں مقامی لوگ بھی سوار تھے۔ ان

میں دفتر اور کاروبار کو آتے جاتے لوگ، اسکول اور کالج کے مقامی طلبا، سپاہی، گرجا کی راہبہ اور پگوڈا کے زعفرانی راہب اور مساج پارلر والی لڑکیاں بھی اپنے لباس، میک اَپ اور اداؤں سے پہچانی جارہی تھیں۔ بنکاک کو ''مشرق کا وینس'' ان ہی تنگ مگر خوش رنگ نہروں اور ان پر آباد کشتی والوں کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ سنا سورج ڈھلنے کے بعد جب بازار کی گہما گہمی ماند پڑ جاتی ہے' ان پانیوں پر ایک اور طرح کی رونق مچلنے لگتی ہے۔ بڑے جہاز جیسے ''اورینٹل کوئن'' وغیرہ سیاحوں کو رنگ ورامش کی دعوتِ خاص پر مدعو کرتے ہیں۔ ہمارا اسٹیمر ایک جگہ ٹھہر کر لنگر انداز ہوا۔ کچھ ہی دیر میں پچاسوں چھوٹی کشتیاں اپنا مال واسباب لیے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ منظر بڑا سہانا تھا۔ زیادہ تر کشتیاں عورتوں کی تھیں اور روزمرہ کے استعمال کی تقریباً ہر چیز ساتھ میں تحفے تحائف برائے فروخت موجود تھیں۔ اس بھیڑ سے کچھ الگ دو لڑکیاں ایک لانبی کشتی میں ہر قسم کے پھول بیچ رہی تھیں۔ وہ خود بھی نازک سی تھیں۔ دیہی حسن کثافت سے پاک لگ رہا تھا۔ میں اس کی تصویر لیے بغیر نہ رہ سکا۔ کافی دیر میں اس پانی پر ڈولتے بازار سے محظوظ ہوتا رہا۔ گھنٹہ بھر بعد ہمارا اسٹیمر شہر واپس آ گیا۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ بنکاک کے بازاروں میں دنیا بھر کی اشیا بڑی مناسب قیمتوں پر دستیاب ہیں۔ میرے پاس گھر والوں کی ایک نہ ختم ہونے والی فرمائشی فہرست موجود تھی۔ بھائی بہنوں کے لیے الٹے سیدھے تحائف خرید کر میں لدا پھندا ہوٹل پہنچا تو اقبال سنگھ ہوٹل کی لابی میں بھوکے شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دہاڑتا میں نے صفائی پیش کی کہ یار میری گھڑی میں اب تک ٹورانٹو کا وقت سیٹ ہے' بدلنا بھول گیا۔ اقبال میری مسکین صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔ پھر کہنے لگا پہلے ڈنر کے لیے ایک عربی ریسٹورنٹ چلتے ہیں۔ اس کے بعد رات اپنی ہے' بھٹکا کریں گے۔

اقبال کار لے آیا تھا' شام بھیگ چلی تھی' اور آج راجہ کے جنم دن کے طفیل پورا بنکاک پرستان بنا ہوا تھا۔ ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ اقبال صاحب اپنی عادت کے مطابق ہمیں بھی بتانے لگے کہ ''یہ چار وین روڈ ہے' داہنے ہاتھ پر جنرل پوسٹ آفس ہے' اور وہ سامنے 'اورینٹل ہوٹل' ہے جس میں اقبال سنگھ کے علاوہ 'جوزف کان راڈ' اور 'سامرسیٹ مام' قیام کیا کرتے تھے۔ مام نے اپنے بیشتر شاہ کار کمرہ نمبر ♠ میں بیٹھ کر لکھے ہیں۔'' میں نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ بھڑک اٹھا۔ کمال ہے ایک تو بتا رہا ہوں پھر ـــــ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا' ان افسانوں کے نام بھی تو تمھیں معلوم ہوں گے ـــــ ''رب دی قسم چلو تمھیں اس ہوٹل میں لے چلتے ہیں' تمھیں یقین نہیں آ رہا۔ اور وہ گاڑی گھمانے لگا۔ آ گیا یقین میرے بھائی۔ اچھا پھر آگے بتاؤ ـــــ ''خاک بتاؤں۔'' میں نے اسے بہت پھسلایا تو وہ پھر شروع ہوا۔

ہاں تو وہ سامنے دیکھو۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ایک چھوٹے سے سڑک کی مندر کے آگے کافی لوگ ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔اقبال نے بتایا۔ یہ ہندو مندر ہے۔تھائی لوگ آج بھی ہندو دیوتاؤں سے ڈرتے ہیں۔اب تک شاہی پوجا بدھ راہب کی بجائے برہمن پنڈت کرتے ہیں۔ایک موڑ پر گھومتے ہی اس نے بتایا' یہی یہاں کی سب سے مشہور سڑک ہے۔''رت چادام نوین''۔اسے مقامی لوگ پیرس کی ''شانزے لیزے'' سے ملاتے ہیں۔میں نے لقمہ دیا بھولے ہیں تمہارے تھائی دوست کیا کرو گے! یہ دو رویہ حکومت کی عمارتیں، رنگ برنگے اسٹور اور باکسنگ اسٹیڈیم کے علاوہ یہاں کوئی چیز قابلِ دید نہ تھی۔ میں نے کہا شہزادے بھوک لگ چکی ہے۔وہ تمہارا عربستان ہوٹل کہاں ہے؟

گاڑی دو تین شاہراہوں سے گزرتی ہوئی ایک تنگ راستے میں گھوم گئی۔اچانک ایسا لگا کسی صحرا کے نخلستان میں آ گئے ہیں۔فضا میں کباب کا دھواں اور خوشبو مسلط تھی اور عربی موسیقی زور زور سے بج رہی تھی۔راستہ کافی لمبا تھا مگر اندر جا کر شاید ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں بیشتر سائن بورڈ عربی میں تھے۔بے شمار عربی بوڑھے اپنی لمبی قبا میں بھٹک رہے تھے۔راستے کے ایک طرف فٹ پاتھ پر ''اوپن بار'' کا سلسلہ تھا۔جوان عربی اور ایرانی لڑکے کلائی میں زنجیر کی طرح تسبیح لپیٹے اپنی تھائی گرل فرینڈ کے ساتھ خوش فعلیوں میں مگن تھے۔میں نے اقبال سے پوچھا یار یہ کہاں لے آئے ہو؟ کہنے لگا جگہ بکواس ہے مگر کھانا اچھا ہوتا ہے۔میں ایک بار آ چکا ہوں ـــــ گاڑی اس نے ایک ''مطعم ابوداؤد'' کے سامنے روکی۔ یہ کوئی شاندار ریستوران نہ لگتا تھا مگر بھیڑ بہت تھی۔ہم لوگ ایک کونے والی میز پر قابض ہوئے۔میں نے اقبال سے کہا تم ہی آرڈر دو۔اس نے ویٹرس کو سیخ کباب اور تندوری بٹیر کا آرڈر دیا۔ساتھ تندوری روٹی اور کوک! ہمارے سامنے کی میز پر دو عرب چند کمسن مگر بے ڈھنگی لڑکیوں کو لیے بکرے کی بھنی ران پر چھری چلا رہے تھے۔ساتھ ہی وہ لڑکیوں کی ران پر بھی ہاتھ صاف کرتے جا رہے تھے۔کیش کاؤنٹر پر ''حلال گوشت'' کا اعلان نامہ لکھا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ''شیواز ریگل'' کا ہوش ربا پوسٹر اور ۵۰ر بھات فی جام کا اشتہار بھی لگا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یہ جگہ بہت بھونڈی لگ رہی تھی اور حیرت ہو رہی تھی کہ عربوں نے یہاں بھی اپنی تفریحِ طبع کے لیے پورے علاقے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ویٹ نامی ویٹرس نے خاموشی کے ساتھ ہمارا کھانا میز پر چن دیا۔

میں عربوں کو چھوڑ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کباب اور بٹیر دونوں لذیذ تھے۔ میرا یار عام سرداروں کی طرح خوش خوراک تھا۔ایک آرڈر اور منگایا گیا اور جی بھر کے بٹیر کی ٹانگ توڑی گئی۔کھانا ختم کرتے ہی ہم لوگ یہاں سے اٹھ گئے۔ باہر دو موٹر سائیکل کھڑی تھی جس پر موٹے حرفوں میں ''ٹورسٹ

پولس'' لکھا تھا۔ پتہ چلا تھائی لینڈ کی بڑی آمدنی چوں کہ سیاحوں سے ہے اس لیے ان کی حفاظت' شکایت' رہبری اور حجامت کے لیے یہ پولس مخصوص ہے۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ اس پھیری کے تمام پولس انگلش سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور سیاحوں سے نرمی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ کیوں نہ آئیں' ڈالر اور درہم کی ریل پیل کا معاملہ ہے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اقبال نے ایک گائیڈ بک مجھے تھماتے ہوئے کہا دیکھو کوئی کلب کا پتہ دیکھو' وہاں چلا جائے۔ میں نے کتاب کھولی۔ پہلے دس صفحات صرف ''اسکورٹ سروس اور مساج پارلر'' کے اشتہار سے بھرے پڑے تھے۔ میں نے کتاب بند کرتے ہوئے اقبال سے کہا یار ان کی تاریخ تو ٹھیک ٹھاک ہے' لوگ بھی شریف اور ملنسار لگتے ہیں' عقیدے کے پکے بھی ہیں پھر یہ ''سروس'' کا معاملہ یہاں کب اور کیسے شروع ہو گیا۔ اقبال نے کہا جب سے تمہارے امریکی سروس والے یہاں آنے لگے۔ تقریباً ۱۹۶۱ء کا زمانہ تھا۔ ویٹ نام کی جنگ کے دوران امریکی فوجی یہاں "R-R" کے لیے حاضری دینے لگے۔ میں نے کہا' کیا مطلب؟ کہنے لگا ''ریسٹ اینڈ ریلاکس'' پھر مڈل ایسٹ کے عربوں نے اسے اپنا مسکن بنایا' آج بنکاک نہ صرف اسمگلروں کی جنت ہے بلکہ ''گناہ کا شہر'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کے نائٹ کلب اور ''گوگو بار'' کے لیے امریکہ کے علاوہ جرمنی اور دیگر ممالک سے عیش پرستوں کا جہاز لد لد کر آتا ہے۔

بنکاک کا پرانا نام ''کرنگ تھیپ'' ہے جس کے معنی ''فرشتوں کا شہر'' ہے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی کیوں کہ آج بھی عام تھائی بنکاک کو اسی نام سے پکارتا ہے۔ ہم لوگ ایک علاقے سے گذر رہے تھے کہ دور سے ''قلوپطرہ'' کا سائن نظر آیا' ساتھ ہی جگمگاتا ''نوفرنگ'' کا بورڈ نظر آیا۔ میری تشویش بڑھی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اقبال نے کہا یہ بھی قاعدے کا کلب ہے چلو اسی میں چلتے ہیں۔ گاڑی ایک کنارے روک کر ہم ''فرشتوں کی نگری میں آ گیا ہوں'' گنگناتے اس شبینہ کلب میں داخل ہوئے۔ دروازے پر دو جلا نما باؤنسر پہلوانوں نے پہلے ہماری تلاشی لی' ہمیں اوپر نیچے دیکھا' دوسو بھات لیے پھر اندر داخل کیا۔ اندر مدھم روشنی تھی اور ڈانس فلور پر بے شمار مقامی لڑکے لڑکیاں ''مائیکل جیکسن'' کے ''تھریلر'' پر تھرک رہے تھے ۔ہم لوگوں نے شور سے بچنے کے لیے دور کنارے والی میز پکڑی۔ مرکری کی تیز روشنی میں ڈانس فلور نہایا ہوا تھا مگر ہال میں روشنی مدھم تھی۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا' جگر یہ ''نوفرنگ'' سے کیا مراد ہے؟ اقبال کی نظریں کہیں اور تھیں مگر وہ بتا رہا تھا کہ مقامی لوگ ''فارنز'' کو فرنگ کہتے ہیں جس سے مراد سفید فام ہوتا ہے ۔پچھلے چند سالوں سے ''ایڈز'' کی دہشت سے ساری دنیا کے کلب اور عیش فراہم کرنے والوں نے اپنے

اپنے ڈھنگ سے حفاظتی اقدام اٹھائے ہیں۔ بنکاک میں بھی اس کا خوف و ہراس ہے۔اس لیے اس کلب کے دروازے ''شمالی امریکہ'' کے سفید فام لوگوں کے لیے بند کر دیے گئے ہیں۔حالاں کہ اس پر بھی بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ کیا ''ایڈز'' کے جراثیم صرف امریکی لیے گھوم رہے ہیں؟ ساتھ ہی ہنسی بھی آئی کہ اس خوف اور حفاظتی اقدام کے باوجود ''فرشتوں کی نگری'' میں عیش کوشی شباب پر تھی۔باتوں کے درمیان ہمیں یہ بھی الجھن ہو رہی تھی کہ ''تھریلر'' گانے کے بول میرے پلے کیوں نہیں پڑ رہے ہیں۔غور سے سننے پر انداز ہوا کہ اس طرز پر مقامی تھائی گانے کا ریکارڈ بج رہا ہے۔میں نے پھر اقبال کو ٹہوکا دیا کہ یاران کا حفاظتی اقدام مسئلے کا حل نہیں لگتا ہے؟ اقبال نے بڑی سعادت مندی سے پوچھا' آپ بتایئے حضور یہ لوگ کیا کریں؟ میں نے کہا کچھ لوگوں پر پابندی لگانے سے کچھ لوگ ہی اس موذی مرض سے بچ پائیں گے مگر اس کے سدباب کے لیے سب سے پہلے یہ اشتہار انھیں اپنی پیشانی سے ہٹانا ہوگا کہ ''بنکاک سیکس کیپٹل آف دی ورلڈ''! اقبال نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''گرو تمہاری تقریر یہ لوگ سن لیں تو تمھیں نکال باہر کریں اور اگر یہ پتہ لگ جائے کہ ہم شمالی امریکہ سے آئے ہیں تو دونوں کی حجامت رکھی ہے! میں موضوع سے ہٹنا نہیں چاہ رہا تھا —— میں نے پھر کہا' ایک تو مساج والوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔صبح' شام' رستہ' بازار' مندر کم بخت ہر جگہ حاضر! اقبال اچانک ہنسنے لگا۔ میں نے کہا معاملہ سنگین ہے یار۔اس بے ہودہ مالش کے علاوہ ان کے پاس دنیا کو پیش کرنے کو بہت کچھ ہے۔اقبال ہنسی روک کر کہنے لگا۔مساج کے ذکر پر ایک زبردست واقعہ یاد آ گیا۔میرا ایک دوست ہے نیویارک میں نام نہیں بتاؤں گا۔فرض کرو اس کا نام چارلی تھا۔وہ دو سال قبل بنکاک بڑے رومانٹک موڈ میں آیا۔جب واپس گیا تو بڑا بور تھا۔میں نے کریدا تو کہنے لگا ''بنکاک کے ایک مساج پارلر میں میرا جانا ہوا تھا۔میزبان نوعمر مگر تجربہ کار تھائی دوشیزہ تھی۔مجھ سے بڑی اپنائیت سے ملی۔دو ڈرنک کے بعد ہزار بھات مجھ سے رکھوا لیے۔پھر رگ پٹھوں کی مالش کے لیے ایک خاص بستر پر لٹا دیا۔ادھر میں نے خود کو لباس سے آزاد کیا' جواب میں ادھر چند بند قبا کھولے گئے۔پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میرا دو دو گھنٹے بعد والا جہاز منزلِ مقصود کی جانب مائلِ پرواز ہو چکا تھا۔گھبراہٹ میں گرتا پڑتا ایئرپورٹ پہنچا۔ٹیکسی والے کو پیسہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو خالی جیب میرا انداق اڑا رہی تھی۔''! اقبال جب دل بھر کے ہنس چکا تو کہنے لگا بے چارہ چارلی! پھر ایک صحت مند پنجابی گالی دیتے ہوئے کہنے لگا غلطی اسی کی تھی۔مساج پارلر کے آگے پیچھے بھی تو دیکھنا تھا۔اب سارے مساج پارلر بکواس تھوڑے ہی ہیں۔میں نے کہا ٹھیک ہے بھیا' یہ چمپی مالش تمھیں

مبارک ہو!

اسٹیج پر پہلے اندھیرا ہوا پھر روشنی کے سیلاب میں دس رقاصائیں نمودار ہوئیں۔ ہر کوئی اپنی اداؤں سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مست تھی۔ اس ہنگام میں چند ڈانسر بڑھ چڑھ کر اپنے غمزوں کے نشتر چلا رہی تھیں۔ اقبال نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ یہ جو چند ڈانسر ہیں' ہاں جو ابھی آئی ہیں' یہ سب Transvestite ہیں مگر ادائیں دیکھو کتنی اور یجنل ہیں! میں نے اقبال کی طرف دیکھا اور کہا' جگر تم نے بنکاک پر ڈاکٹریٹ مکمل کر لی ہے۔ تمھیں اعزازی ڈگری مل جانی چاہیے۔ یہ سن کر اس نے سبھوں کو بور کر دینے والا فلک شگاف قہقہہ لگایا ـــــ اس کے ساتھ ہی پہلا ڈانس سیشن ختم ہوا، ہال میں روشنی ہوئی، پرانے لوگ کچھ اٹھے، کچھ نئے اپنے چہروں پر تجسس اور حیرانگی لیے داخل ہوئے۔ ایک زور دار جھانج کے ساتھ روشنی گل ہوئی۔ نئی دھیمی موسیقی سے نیا سیشن شروع ہوا۔ ہال میں ہلکی نیلی روشنی ہوئی۔ مدھم دھنوں پر سیکسافون کی مدھر لے پر مخمور لڑکیوں نے بے باک رقص کیا جو رفتہ رفتہ کیبرے اور اس کے آگے کی شکل اختیار کرتا چلا گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ لڑکیاں پورے ہال میں زہر کی طرح پھیلتی چلی گئیں۔ ہر ایک رقاصہ اپنے محاذ پر ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اقبال سنگھ بڑی دیر سے خاموش تھا۔ اس حسین فتنے پر اس کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ اسے گھورتے ہوئے اس نے کہا یار حضرتِ جوشؔ نے اسی کو اعضا کی شاعری کہا ہے۔ کیوں؟ میں نے کہا اس وقت مجھے جوشؔ کا فقرہ نہیں بلکہ خالد سہیل کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ سنو گے؟ اقبال نے میری طرف منہ پھیر کر کہا' ضرور سناؤ مگر وعدہ کرو کہ اس بار نیویارک آؤ گے تو اس ظالم خالد سہیل کو ساتھ لے کر آؤ گے اور مجھ سے ملواؤ گے۔ تمہارا ٹی وی والا سقراط طاہر خان بھی اس کی بڑی تعریف کر رہا تھا۔ حیرت ہے مجھ سے اب تک بچ کیسے گیا۔ وہ جگر' ہم لوگ جب بھی نیویارک گئے' ایک تو رانی نگندر کے گھر کی نشستوں سے فرصت نہیں ملی' پھر حمیرا کا مشاعرہ' ان سب کے علاوہ فون کرو تو پتہ چلتا ہے کہ تم بنکاک جیسی کسی یاترا پر نکلے ہو۔ خیر وہ نظم تو سناؤ' اقبال نے بے چینی سے مطالبہ کیا۔ میں نے کہا ضروری نہیں کہ آپ میری طرف دیکھیں۔ آپ رقص کے پیچ وخم کے ساتھ نظم کی گہرائی تک جا سکتے ہیں۔ اب سناؤ گے یا تمہید باندھے جاؤ گے!

میں نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہر ایک اپنے آپ میں گم محوِ تماشہ تھا۔ میں اقبالؔ کے قریب ہوتا ہوا شروع ہوا۔ ہاں تو عنوان ہے :

"شہوت کا وہ شہر ہو جیسے"

تنہائی کے تہ خانے سے
ذات کے کندھوں پر وہ ہر شب
جسم کی اجلی لاشیں لے کر
قریہ قریہ گھوم رہی ہے
میزوں پر وہ ناچ رہی ہے
ہاتھوں میں کشکول اٹھائے
حسن کا وہ اک ڈھونگ رچائے
مردوں سے کچھ مانگ رہی تھی
مردوں کی کمزوری لذت
لذت نے ہی آگے بڑھ کر
تعریفوں اور رحم کے ڈالر
ہمدردی کے کھوٹے سکے
کشکولوں میں ڈال دیے تھے
وقت کے نازک ہونٹوں پر جب
موسیقی کی تانیں — — ٹوٹیں
لاشوں کا پھر رقص رکا تھا
مرد گھروں کی جانب لپکے
اور پھر اپنی گھر والی کی
رات کو جب آغوش میں سوئے
اجلی اجلی لاشیں ساری
خاموشی سے خواب میں آئیں

اقبال سنگھ سہیل کی نظم سے بڑا متاثر ہوا۔ کہنے لگا یار اس گرو سے ملنا ضرور ہو گیا۔ ویسے تو میں بغیر ملے ہی اس کا فین ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا قلندر ہے قلندر —— ویسے یار کتنا اچھا ہوا اگر تو ٹورانٹو آجائے' پھر

بھرپور محفلیں ہوں گی۔اقبال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' ہاں اب تو آنا پڑے گا۔ہم لوگوں کا دل اب اس راگ رنگ کی محفل سے اچاٹ ہو چکا تھا۔رات گئے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔اقبال نے کہا یار' یہی سب ہے بنکاک میں' بس۔لگتا ہے تجھے پسند نہیں آیا؟ میں نے کہا اقبال جانی' یہ کیبرے' کین کین ڈانس وغیرہ وغیرہ کا جو مزاج میں نے پیرس میں دیکھا کہیں نہیں ہے۔ان کی پرفارمنس میں ایک آرٹسٹک ٹچ ہے۔ یہاں سب کچھ ہے مگر کلاس نہیں ۔ یہ رنگ و رامش کی محفل جنگ کے ترسے مجبور اور صحرا کے بھٹکتے عربوں کو تو لبھا سکتی ہے کسی آرٹسٹ کا دل نہیں موہ سکتی —— میں نے کہا' چلو تمھیں اپنے ہوٹل میں ''کپوچینو'' پلائیں۔

ایمباسیڈر ہوٹل کی لابی میں کئی ریستوران تھے۔ان میں ایک کا نام تھا ''مرحبا''۔اس وقت یہی کھلا تھا۔ہم لوگوں نے تلخ ''کپوچینو'' ٹھہر ٹھہر کر حلق سے اتارا۔اقبال کل صبح اپنے گروپ کے ساتھ ''پٹایا بیچ'' جارہا تھا اور بضد تھا کہ میں ساتھ چلوں۔میں نے کہا یار بڑے سمندر دیکھے ہیں' سورج کی تمازت سے اپنی پیٹھ سلگائی ہے اور لہروں سے اٹکھیلیاں کر چکا ہوں اور اب تک کیا کیا زندگی میں ۔تو نے سنا کبھی کوئی قاعدے کا کام کیا ہو۔ پھر ''کیریبین آئی لینڈ'' جیسے ستھرے ساحل بھی تو یہاں نہیں ہوں گے اس لیے میرے بھائی تو جا۔میں تو کل تھائی لوک گیت سنوں گا۔ان کی موسیقی ،رقص اور نوٹنکی دیکھوں گا۔ مجھے تصنع والی مسکراہٹ سے دور رکھ یار۔اقبال سنگھ ایک لمحہ خاموش رہا۔پھر کہنے لگا' یار بھٹکنا دونوں کا مقدر ہے مگر ہم دونوں کی سوچ میں کتنا فرق ہے۔ میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے موضوع بدلا اور کہا' جگر میرے خیال میں ٹور گائیڈ بن کر بھٹکنے کی بجائے تو کوئی تگڑا کاروبار کیوں نہیں کر لیتا۔اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا مثلاً ؟ ہونہہ —— میں نے سوچتے ہوئے کہا۔کیوں نہ تو بنکاک میں ''پینسلین انجکشن'' کی سپلائی کا ٹنڈر بھر دیتا ہے —— جب تک ''ایڈز'' کا خوف ہے یہاں اس کی بڑی مانگ اور کھپت ہے یار۔ اقبال سنگھ نے حسبِ حال ایک فلک شگاف قہقہہ مارا —— ''مرحبا'' کے سارے ویٹر جو اونگھ رہے تھے ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے۔دوسری شب فون کا وعدہ کر کے ''ہز میجسٹی اقبال سنگھ دی گریٹ'' کو میں نے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

راجہ صاحب کی نفیری اور تھائی نوٹنکی

۷ دسمبر کی بھیگی صبح ہے۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز بے موسم کی کم کم بارش سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہ بستر سے نکلنے کو ہی جی چاہ رہا تھا نہ ہی مزید سونے کی خواہش تھی۔ بس کسی مقصد کے بغیر عرصہ کے بعد کاہلی کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ میں نے روم سروس کو فون کر کے چائے کی فرمائش کی اور کچھ خطوط لکھنے پر خود کو آمادہ کیا۔ ابھی میں پہلا خط مکمل ہی کر رہا تھا کہ چائے لیے ایک کلف شدہ ویٹر آ گیا۔ میں نے چائے کی کشتی بستر پر ہی رکھ دینے کو کہا اور بل پر دستخط کر کے اسے واپس دے دیا۔ ساتھ ہی کچھ ٹپ اسے تھما دی ـــــ وہ خوش ہو کر جا رہا تھا کہ اچانک پوچھ بیٹھا' سر آپ کو معلوم ہے آج گیارہ بجے سے ٹی وی پر اسپیشل شو ہے! ہمارے راجہ کی سالگرہ چل رہی ہے نا' آپ ضرور دیکھیے گا۔ بندہ چلا گیا مگر میں سوچنے لگا' یہ سالگرہ کب تک چلتی رہے گی۔ خیر میں نے تھائی ٹی وی کا کوئی شو اب تک نہیں دیکھا تھا' سوچا اسی بہانے ٹی وی کا اسٹینڈرڈ تو دیکھا جائے۔ چائے اور خط ختم کر کے میں باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر نکلا تو بچی ہوئی ٹھنڈی چائے کی آدھی پیالی بنائی اور باہر جانے سے پہلے ٹی وی کا سوئچ آن کیا' تین یا چار چینل تھا شاید مگر ہر ایک پر تھائی زبان میں پروگرام چل رہے تھے۔ میں چینل الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ ایک جگہ انگلش سنائی دی۔ میں رک کر اس پروگرام کو دیکھنے لگا۔ شو کا نام تھا۔ ''ہز میجسٹی دی کنگ آف جاز''۔ مجھے یاد آیا پہلے ہی روز استقبالیہ والی دوشیزہ بتا رہی تھی کہ راجہ جاز موسیقی سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ اس پروگرام میں ''ہز میجسٹی راجہ بھومی بول ادلیا دیج'' کے ذوق و شوق پر ایک ڈاکومنٹری دکھائی جا رہی تھی۔ میں نے رجواڑوں کو فن اور فن کاروں کی سرپرستی کرتے سنا تھا مگر راجہ خود ساز سے شغل کرے اور وہ بھی مہارت کے ساتھ' نہ سنا تھا۔ سوائے روم کے نالائق نیرو کے جو اس وقت بانسری بجا رہا تھا جب شہر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے باہر نکلنے کا پروگرام ترک کیا اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ شو بڑا معلوماتی اور دلچسپ لگنے لگا۔

تھائی لینڈ کی ''چکری سلطنت'' کے نویں راجہ ''بھومی بول'' کی پیدائش کیمبرج، امریکہ میں ہوئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم سوئزرلینڈ میں حاصل کر کے ۱۹۵۰ء میں نہ صرف ان کا جشنِ تاج پوشی ہوا بلکہ ''رانی سری کیت'' سے شادی بھی ہوئی۔ مغربی تعلیم اور طرزِ رہائش نے راجہ کو مغربی موسیقی کا دلدادہ بھی بنایا اور کشادہ ذہن بھی عطا کیا ـــــ سنا موسیقی کی محفلوں میں حضور اپنی بادشاہت بھول کر عام لوگوں سے کھل کر بات بھی کرتے ہیں اور داد و تحسین بھی حاصل کرتے ہیں۔ ان محفلوں میں محمود و ایاز کا فرق مٹا دیا جاتا ہے مگر رہتے

وہ ''ظلِ سبحانی'' ہی ہیں —— سوال یہ ہے کہ سال میں ایسا کتنی بار ہوتا ہوگا؟ معلوم ہوا راجہ صاحب نفیری ، پیپری، بانسری، شہنائی اور کلارنٹ غرض دم لگا کر بجانے والے بیشتر سز پر یدطولیٰ رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ گیٹار اور پیانو بھی خوب بجاتے ہیں۔خود موسیقی ترتیب بھی دیتے ہیں۔موسیقی اور ساز کے بارے میں جہاں پناہ کا فلسفہ یہ ہے کہ ''موسیقی تفریح کے ساتھ سکونِ قلب عطا کرتی ہے۔'' مجھے محسوس ہوا کہ فن کے سلسلے یہ باتیں تو خیر اچھی ہیں کہ ''تھائی اختر پیا'' جنگ کا بگل بجانے کی جگہ نفیری بجا رہے ہیں مگر حضور دیگر کام کب کرتے ہوں گے کیوں کہ اتنی قابلیت تو فل ٹائم ریاض طلب کرتی ہے۔خیر'ان کی قابلیت پر ہمیں رشک آیا۔ پروگرام میں یہ بھی بتایا گیا کہ راجہ بھومی بول ایشیا کے پہلے موسیقار ہیں جنھیں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ''سٹی آف ویانا کے انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ آرٹس'' کے اعزازی رکن ہیں —— (اس اعلان پر پس منظر میں سینکڑوں تالیوں کی بازگشت بھی سنائی گئی) پھر ۱۶ر سالہ راجہ صاحب کو رنگ محل کے رنگ منچ پر آتے دکھایا گیا (ایک بار پھر تالیاں) ''جنبش مکن' ہشیار باش'ظلِ سبحانی' جہاں پناہ'شہنشاہ بھومی بول ادلیادیج'فخرِ ساز و سازنداں اب کلارنٹ پر مغربی دھن ''فالنگ رین'' سنا کر اپنی رعایا کو مشکور و مسحور کریں گے''! راجہ صاحب کی تربیت اور ترتیب دونوں آفت تھیں۔غضب کا کلارنٹ بجایا سرکار نے ۔ہم خواہ مخواہ بادشاہت کے نام پر بدک جاتے ہیں۔اب ہر راجہ ایسا ویسا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔مگر تاریخ کا کیا کریں' کہیں نہ کہیں چغلی کر دیتی ہے۔راجہ صاحب کی زندہ دلی اور ویانا والی نفیری پر عوام پاگلوں کی طرح تالیاں پیٹ کر اپنے عقیدے کا اظہار کر رہی تھی۔اس کے بعد ہی کمرشیل بریک ہوا اور پہلا اشتہار ''شاہی بوا ٹپ تھائی مساج'' کا تھا۔پھر کسی نئے ''کالسپو'' کلب کی چکا چوند دکھانے لگے۔میں نے گھڑی دیکھی' دوپہر ایک بج رہے تھے۔میں نے ٹی وی بند کیا اور لنچ کے لیے نیچے آ گیا۔

لنچ نپٹا کر میں ''بنکاک پوسٹ'' اخبار دیکھ رہا تھا۔آج شہر میں بہت سارے پروگرام تھے مگر ایک خبر میرے مطلب کی تھی۔ ''نیشنل تھیٹر'' میں آج سارا دن لوک رقص و موسیقی کا میلہ لگا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے سے ''نیشنل تھیٹر'' کے لیے کہا اور پندرہ بیس منٹوں میں تھیٹر پہنچ گیا۔فنکشن صبح سے چل رہا تھا اور پورے دن کا پاس صرف ۱۵۰ر بھات کا تھا۔جب میں ہال میں داخل ہوا تھائی لوک رقص کا کوئی شو چل رہا تھا۔اسٹیج پر ایک لڑکی ہاتھ لہرا لہرا کر رقص کر رہی تھی۔اس نے سر پر ایک نوکیلے کلس والا تاج پہن رکھا تھا۔ جھلملاتے بروکیڈ اور سلمہ ستارہ ٹکے کاسٹیوم اور گہرے میک اپ کے علاوہ لڑکی کے ناخن اس کی انگلی سے لانبے تھے جس پر سنہرا پالش چمک رہا تھا۔ پتہ چلا اسے ''ناخن رقص'' کہتے ہیں۔ یہ شمالی تھائی لینڈ کا لوک رقص تھا۔ساتھ ہی ایک مرد کسان کے لباس میں ڈفلی بجا بجا کر کچھ گا رہا تھا۔یہ گیت فصل کاٹے جانے کے

دوران گایا جاتا ہے۔اس رقص وموسیقی اور گانے میں ہمارے لیے کوئی بھی چیز اجنبی نہ تھی۔ ہاں، یورپ اور امریکہ کے سیاح انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیسا رقص ہے۔ مجھے یہ خالص مشرقی اور جنوبی ہند کے بھارت ناٹیم سے بہت قریب لگا۔ زبان مختلف تھی، رقص کی تحریک اور لباس مختلف تھے مگر اس کی روح کو میں محسوس کرسکتا تھا۔موضوع بھی بالکل ہمارے ماحول والا تھا۔ دیوی دیوتاؤں کوخوش کرنے کا انداز، فصل کے تیار ہونے کی خوشی، حق و باطل کا مقابلہ اور محبت کی داستان، سب کچھ تو پرانا تھا۔

پرانے زمانے میں ''سیام'' میں عوام کی تفریح کے لیے یا کسی کے پیغام کے لیے تھیٹر کا رواج نہ تھا۔ عام لوگ تفریح کے لیے مندروں کے بھجن اور رقص میں حصہ لیا کرتے تھے یا کسی خوشی کے موقع پر ناچ گانا کرلیتے تھے ۔ راجہ ، امرا اور شہزادوں کے لیے درباری تھیٹر موجود تھا جس کے فنکار صرف شاہی پروگراموں کے مخصوص تھے۔انھیں راجہ کی سرپرستی حاصل تھی اور ان کا مسکن بھی محل کے احاطے میں ہوتا تھا ۔۲۳۹۱ء میں بنا خون خرابے کے جب تھائی لینڈ کی بادشاہت کو ''دستور سازی'' میں تبدیل کیا گیا' اس کے بعد آرٹ اور تھیٹر کی محل کی چار دیواری سے آزاد ہوکر عوام کے ہاتھوں میں آ گیا۔ گوکہ پرانے راجاؤں نے آرٹ اور تھیٹر کی بڑی قدر اور سرپرستی کی مگر عوام کو اس کی پہنچ سے ہمیشہ دور رکھا گیا —— مگر مجھے معلوم ہے، تھیٹر عوام کی چیز ہے، اسے عوام سے الگ رکھا نہیں جاسکتا۔

''ناخن رقص'' کے بعد کافی بریک تھا۔ اس کے بعد تھائی لینڈ کے ''بابائے کلاسیکل موسیقی'' —— ''مونتری ترا موٹے'' کا ایک لیکچر تھا۔ ۸۸رسالہ استاد مونتری بہت سادہ سے لباس میں اسٹیج پر آئے ۔تقریر وہ تھائی میں کررہے تھے اور اس کا متن انگریزی میں ایک شخص بتاتا جارہا تھا۔کہنہ مشق استاد کے چہرے کی جھریاں بتارہی تھیں کہ ان کی عمر موسیقی کی زلف کو سنوارنے میں گزری ہے۔انھوں نے بتایا کہ تھائی کلاسیکل موسیقی بہت رسیلی اور بہت سرورانگیز ہے مگر اس کی بقا کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ایک وجہ تو پرانی ہے کہ تھائی کلاسیکل موسیقی کو استادوں نے کتابی شکل میں محفوظ نہیں کیا۔تمام راگنیاں سینہ در سینہ حافظے کے سہارے چلی آرہی ہے۔میرے خیال میں اسے مغربی موسیقی کے نوٹ کی طرح کتابی شکل میں ہونا چاہیے تھا۔(مجھے خیال آیا کہ ہماری کلاسیکل موسیقی بھی تو سینہ در سینہ چلی آرہی ہے۔ ویسے تو ہونا اسے بھی نوٹس کی شکل میں چاہیے) پھر ۱۳۹۱ء سے ۱۵۹۱ء کے دوران تھائی لینڈ بری طرح مغرب کی تقلید کررہا تھا ۔اس دور کے وزیر کبیر ''سونگھ رام'' نے کلاسیکل موسیقی کو ''اولڈ فیشن'' قرار دے کر مغربی موسیقی رائج کرنا شروع کیا —— اس دور میں حکومت کی طرف سے پان تک چبانے کی منادی کردی گئی تھی اور عوام کو جبراً کوٹ، ٹائی، پینٹ وغیرہ پہننے کی تلقین کی گئی تھی۔مغرب کی تیز اور چنگھاڑتی موسیقی پرانی قدروں کو اپنے

ریلے میں بہالے گئی۔مگر مونتری اور دیگر استاد اس سے مایوس نہیں ہوئے‘ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ پھر بڑے عرصے کے بعد کلاسیکل موسیقی کو شہزادی ''مہا چکری سیری دھورن'' راجہ بھومی بول کی لڑکی کی سر پرستی حاصل ہوئی۔استاد نے بتایا کہ شہزادی نے تھائی کلاسیکل میوزک کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شہزادی کا بچپن تو ''جاز'' میوزک سنتے گزرا ہوگا کیوں کہ راجہ مغربی موسیقی کا دلدادہ ہے پھر اسے کلاسیکل موسیقی سے عشق کیسے ہو گیا؟ اسٹیج پر استاد کی تقریر کے بعد ''تھائی آرکیسٹرا'' جسے ''پپ ہاٹ'' کہتے ہیں لایا گیا جس میں سات موسیقار شامل تھے! سبھوں نے آ کر ہاتھ جوڑ کر ''سواس دی کلاپ''یعنی شام کا سلام عرض کیا۔پھر ان لوگوں نے استاد مونتری کی طرف سر جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر جسے ''وائی'' کہتے ہیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور پھر ایک گونج کے ساتھ موسیقی شروع ہوئی۔دو آدمی ڈھول بجا رہے تھے‘ دو شہنائی کی طرح ایک ساز جسے ''پی نائن'' کہتے ہیں اس پر زور لگا رہے تھے۔ایک بندہ جھانج پیٹ رہا تھا۔ایک پیچھے بیٹھے سارنگی سے بہت ملتی ''سا'' پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔بیچ میں ایک بہت بڑے گھوڑے کی نعل کا شکل کا بڑا منقش ساز رکھا تھا جس میں سولہ عدد دھات کے پیالے لگے تھے۔اسے ''گونگ ونگ یائی'' کہا جاتا ہے۔اسے ایک استاد جلترنگ کے انداز میں بجا رہا تھا۔میں نے اس طرح کی موسیقی ''جمیکا'' کے سیاہ فام لوگوں کی ''اسٹیل ڈرم'' میں سن رکھی تھی۔موسیقی بہت دلفریب نہ تھی مگر ساز بڑا ہی منقش اور مرصع تھا۔تھائی کلچر میں نقش و نگار صرف مندروں و میناروں تک محدود نہیں‘ یہ اپنے آرٹ اور تھیٹر میں بھی بیحد خوبصورت مینا کاری اور رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔معلوم ہوا ان دنوں ایک امریکی ''بروس گاسٹن'' نے خود کو تھائی موسیقی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔اس نے بڑے دلکش تجربے ویسٹرن میوزک اور تھائی کلاسیکل موسیقی کو ملا کر کیا ہے‘ جو بے حد کامیاب بھی ہے۔ایک گھنٹے تک استاد لوگ میرے جی کو جلاتے رہے۔یہ ڈھول تماشے والی موسیقی کب تک سن سکتے تھے۔میں اٹھ کر باہر آیا۔پتہ چلا اگلا آئٹم تھیٹر سے متعلق ہے۔میں چار و ناچار دوبارہ اس روایتی اور مقدس موسیقی سے اپنے ضبط کا امتحان لینے اپنی سیٹ پر واپس آیا۔تھوڑی دیر میں کفر ٹوٹا۔سبھوں کے ساتھ میں نے بھی زور زور سے تالی بجائی کہ جان چھوٹی ـــــ ایک راہب نما شخص اسٹیج پر آیا اور ''وائی کرو'' (استادوں کو عقیدت پیش کرنے کا جشن) پر تقریر کرنے لگا

۔مشرق کے تقریباً ہر ملک کی طرح تھائی لوگ بھی اپنے استادوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ہمارے یہاں بھی گرو کی عزت پاؤں چھو کر کی جاتی تھی اور اب بھی کچھ لائق شاگرد کرتے ہیں۔اسی عزت کے چکر میں میرا یار ظہیر ٹیچر بن گیا‘ اور اب وضع داری نبھا رہا ہے۔ہر سال تھائی لینڈ میں ''جشنِ گرو'' منایا جاتا ہے مگر جو عزت کلاسیکل موسیقی، ڈراما اور آرٹ کے گرو کو ملتی ہے‘ کسی اور کو نہیں ملتی۔میرے خیال میں لفظ ''وائی

کروٗ' ان لوگوں نے ہمارے ''واہ گروٗ'' سے اچک لیا ہے۔ تھائی لینڈ میں ''گروٗ'' ہونا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اپنے فن میں مہارت اور عظمت کے ساتھ گرو کا کردار بہت اعلیٰ اور سماج میں اس کی بے پناہ عزت اور سب سے بڑھ کر عقیدہ کر پکا اور اس کا بدھ راہب ہونا لازمی ہے۔

زمانۂ قدیم سے تھائی نوٹنکی پانچ حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان میں ''لی کے''، ''ہون''، ''نانگ''، ''لاکن''، ''کھون'' ڈراما اور رقص شامل ہے۔ ان میں کچھ مندروں میں کھیلے جاتے تھے۔ کچھ میلے ٹھیلے میں دکھائے جاتے تھے۔ کچھ ڈرامے پرچھائیں والے بھی تھے جو رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تھائی لینڈ میں زمانۂ قدیم میں پرچھائیں کے میڈیم سے ڈراما موجود تھا۔ حالاں کہ ہمارے یہاں یہ تکنیک بہت پرانی نہیں۔ ایک بات عجیب تھی کہ ہندو مت کا اثر تھائی کلچر میں پہلے بھی تھا اور بدھ فلسفے کے بعد بھی اس کا اثر موجود ہے۔ زمانۂ قدیم میں تقریباً ہر ڈرامے کا موضوع ''رامائن'' (جسے یہ لوگ ''راما کین'' کہتے ہیں) سے لیا جاتا تھا اور آج تک لیا جاتا ہے۔ ''آیوتھیا'' میں محلوں کے صحن میں رامائن کا منظر نامہ چار پانچ روز تک چلتا رہتا ہے۔ لوگ اس ڈرامے سے اٹھ کر چلے بھی جاتے تھے' پھر کام کر کے واپس آجاتے تھے کیوں کہ کہانی انھیں پہلے سے معلوم ہوتی تھی۔

۱۹۱۷ء میں راجہ ''واجی راودھ'' نے تھائی تھیٹر کو دو مخصوص حصوں میں بانٹ دیا۔ ''کھون'' اور ''لاکن'' ـــــ دونوں ڈراموں کا فارم بنیادی طور پر یونان کے قدیم ڈراموں کی طرح تھا جس میں اسٹیج اور منظر کا استعمال ضروری نہیں تھا' ہاں کاسٹیوم پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ کرداروں میں ''جوگی''، ''دیو''، ''راجہ''، ''رانی''، ''ہنومان'' اپنے ماسک یعنی مکھوٹ یا نقاب سے پہچانے جاتے تھے۔ مقرر نے اشارے سے مکھوٹ منگوائے، ونگ سے ایک شخص نے کئی عدد مکھوٹ لا کر میز پر سجا دیے جو رنگ اور نقش و نگار میں اپنی مثال آپ تھے۔ ہر ملک کے تھیٹر میں ایک نہ ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ تھائی تھیٹر یعنی کلاسیکل ڈراموں میں ہر کردار کا نقاب سیامی نقاشی اور مجسمہ سازی کی بہترین مثال ہے۔ ہر کردار کا نقاب یا مکھوٹ اپنی انفرادیت لیے ہوتا ہے۔ اسٹیج پر مختلف کرداروں کے نقاب کی رونمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقرر نے بتایا کہ مردانہ کرداروں میں سب سے مقبول مکھوٹ ''راما'' یعنی حق پرست راجہ رام کا ہوتا ہے۔ پھر ''ٹوٹ سکا کن'' ''دیوراج کا نمبر آتا ہے۔ پھر ''ہنومان'' جنگجو بندر کا مکھوٹ دکھایا گیا۔ یہ سب کھون ڈرامہ کے کرداروں کے نقاب تھے۔ اس ڈرامے میں اداکاری کے ساتھ لوک گیت اور رقص کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔ پھر مکھوٹ کے مختلف رنگ اور وضع سے کردار کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ جیسے دیو کے مکھوٹ میں دانت باہر کو نکلے ہوئے اور ٹیڑھے ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ دیو عمر دراز ہو چکا ہے۔ دانت نو کیلے اور اوپر کو اٹھے

ہوئے ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ دیو نرم دل ہے۔ پھر ہنومان کا مکھوٹ ہمیشہ سفید ہوتا ہے۔ رام اور دیگر دیوتا رشی منی کے نقاب کے ساتھ ایک تاج بھی لگا ہوتا ہے۔ تاج بھی تقریباً دس اقسام کے اور عہدے کے مطابق ہوتے ہیں۔ ''کھون'' ڈرامے کے کردار لڑتے ہیں' ناچتے ہیں مگر بات نہیں کرتے۔ ان کے مکالمے یا گیت ایک راوی ادا کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں رقاصاؤں، راوی اور کرداروں میں تعاون اور توازن برقرار رکھنا کمال ہے۔ غرض تھائی نوٹنکی ہمارے رام لیلا کی طرح نکلی۔ کہانی، پلاٹ اور اداکاری نے مجھے متاثر نہیں کیا نہ موسیقی اور رقص سے میں محظوظ ہوا۔ مگر آج کے پروگرام میں سب سے زیادہ ان ڈراموں کے مکھوٹ سے متاثر ہوا تھا۔ میرے خیال میں دنیا کے بہترین اور دلکش ماسک تھائی لینڈ میں دیکھنے کو ملے تھے۔ اس کے فن کار جنھیں ''چانگ سپ'' کہتے ہیں۔ بڑی محنت، عرق ریزی اور عقیدت سے ان ماسک کو تیار کرتے ہیں۔ بیشتر ماسک ''پیپر ماشی'' سے تیار کر کے اس پر رنگ اور نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔ ہر نقاب کو تیار کرنے کے بعد ایک خاص قسم کی ''پوجا'' کے بعد اسے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ان فنکاروں کے لیے یہ ماسک صرف آمدنی یا تفریح کا وسیلہ نہیں۔ اس سے یہ لوگ دیومالائی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہی عقیدت ہے جو ''کھون'' ڈراموں اور ''مکھوٹ'' کے فن کو زندہ رکھے گا۔

دن بھر کے میلے سے میں تھک سا گیا تھا۔ پروگرام ختم ہوتے ہی میں نے ٹیکسی لی اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ راستے بھر میں سوچتا رہا ہماری زندگی بھی تو ایک نوٹنکی ہے جس میں ہم لوگ مختلف مکھوٹ لگائے حرکت کر رہے ہیں' کوئی ہنس رہا ہے' کوئی رو رہا ہے' کسی کو کچھ بھی نہیں کرنا۔ بے چارے وہ لوگ! وقت اس نوٹنکی کا ہدایت کار ہے۔ مختلف مکھوٹ اسی نے تو دیے ہیں ہمیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے کردار کو بحسن وخوبی نبھاتے جاتے ہیں' افسوس ہے ان کرداروں پر جو کچھ بھی نہیں کرتے۔ بس دیکھا کرتے ہیں —— ایسے کردار کیوں کر زندہ ہیں۔

ہوٹل پہنچ کر میں لفٹ کی بھیڑ میں بھی نوٹنکی' کردار' وقت اور اپنے جگر ظہیر انور کے بارے میں سوچتا رہا جس کے کردار اکثر سنجیدہ مگر میری طرح آوارہ گرد ہوتے ہیں۔

☆☆☆

راہ میں ان سے ملاقات ہوئی!

میں اپنی طبیعت کے خلاف بنکاک میں کچھ زیادہ ہی شاپنگ کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ مساج کے جو پیسے بچے تھے انھیں کہیں تو خرچ کرنا تھا۔ میں اپنے لفافوں اور پیکٹ کے بوجھ کو کم کرنے ہوٹل آیا تو ریسیپشن پر معلوم ہوا کہ اقبال سنگھ کے پانچ فون آ چکے ہیں اور وہ کسی مہمان کو لے کر ایک بجے دوپہر لنچ کے لیے میری طرف آ رہا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ سوا بارہ کا عمل تھا۔ میں نے محترمہ کا شکریہ ادا کیا' کمرے کی چابی لی اور اوپر جاتے ہوئے سوچنے لگا کہ پتہ نہیں سردار اکس کو اٹھائے لا رہا ہے۔

ٹھیک ایک بجے فون کی گھنٹی بجی۔ سردار اقبال سنگھ اپنے مہمان کے ساتھ لابی میں براجمان تھے۔ میں نیچے پہنچا تو دیکھا اقبال صاحب سفید سوٹ پر خونی سرخ پگڑی جمائے ایک ادھیڑ عمر کے سفید فام بندے سے محوِ گفتگو ہیں۔ میں نے بڑھ کر ہیلو کہا۔ اقبال نے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ مسٹر ڈینس میگالز' نیوجرسی کے ہیں اور پچھلے بیس سالوں سے بنکاک میں انگریزی کے مدرس ہیں۔ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ ڈینس خوش مزاج اور باتونی بندہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے اقبال سے دوستی بھی ہوئی ہو۔ میں نے ان لوگوں کو لنچ کے لیے ''انٹرنیشنل فوڈ کورٹ'' کی دعوت دے دی۔ پہلے اقبال نے احتجاج کیا پھر میری دعوت قبول کر لی۔ میں آج پھر تھائی کھانے کے موڈ میں تھا مگر ایک اسٹال پر ''برما'' دیکھ کر میں رک گیا۔ میرے چچا قربان' برمیز ''کھاؤسے'' کی بڑی تعریف کرتے ہیں' ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما کے قصے بھی خوب مرچ مسالہ لگا کر سناتے ہیں۔ میں نے سوچا آج چچا جانی کے ٹیسٹ کو دیکھا جائے۔ میں اپنے مہمانوں سے اس پکوان کا دریافت کیا۔ ڈینس نے ایک شریف امریکن کی طرح کاندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اقبال کھانے کے معاملے میں خالص پنجابی ہے' کچھ کھلا دو آنکھ بند کر کے ہضم کر جاتا ہے۔

میں نے احتیاطاً ''کھاؤسے'' کے ساتھ کچھ ''اسپرنگ رول، فرائڈ رائس اور سلاد'' بھی لے لیا کہ سب ملا کر چکھا جائے گا۔ جب میں کھانا لے رہا تھا اقبال پانی کے تین گلاس اٹھائے ایک میز پر قابض ہو چکا تھا۔ پھر ڈینس اور میں کھانے کی کشتی سنبھالے میز پر جمع ہو گئے۔ بیٹھتے ہی ڈینس نے مجھ سے پوچھا' ہاں صاحب' کیسا لگا آپ کو بنکاک؟ میں نے کہا دلچسپ مگر پریشان کن' اور یہاں کے لوگ؟ لوگ تو سادہ ہیں' ملنسار اور اپنے آپ میں مگن' مگر ان کا پروجیکشن اور بنکاک کی امیج باہر والوں کے سامنے بڑی خراب ہے۔ وہ تو آپ کو معلوم ہے کیوں! ہونہہ —— ڈینس نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ یہ لوگ اتنے برے نہیں

ہیں جتنا باہر والے سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا' اس کی ذمہ خود ان کے "Easy Going" رویے کی وجہ سے ہے۔ خیر آپ بتائیں آپ کو یہ ملک' یہ شہر کیسا لگا؟ میں نے اس سے پوچھا۔ "Oh. I love it!" مجھے تو یہ ملک' لوگ' یہاں کی رسوم بہت پسند ہیں۔ دراصل میری بیوی تھائی خاتون ہے —— میں

نے بات کاٹتے ہوئے کہا' پھر تو آپ کی چاہت اور پسند بے جا نہیں۔ ویسے آپ تو تھائی بڑی روانی سے بول لیتے ہوں گے! ہاں' پچھلے ۲۰ سالوں سے اس نیک دل حسینہ کے ساتھ اس کی زبان بول رہا ہوں —— وہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت بھی کرتی ہے مگر اب بھی کہیں کہیں بھٹک جاتا ہوں —— میں نے

پوچھا' کیا یہ زبان بڑی مشکل ہے یا آپ عام امریکنوں کی طرح نئی زبان سیکھ کر نہیں دیتے۔ اور ہم سب ہنس پڑے۔ اقبال جو بڑی دیر سے ''کھاؤ سے'' پر پورا زور لگائے ہوئے تھا' کہنے لگا کہ زبان تو مجھے بڑی آسان لگتی ہے۔ میں نے دو برسوں کے چکر میں کام چلاؤ تھائی سیکھ لی ہے۔ ڈینس نے کہا کہ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ یہ آسان زبان ہے' کیوں کہ اس میں کسی قواعد' جنس اور صیغے کی قید نہیں مگر یہ "Tonal Language" یعنی لہجے کی زبان ہے۔ نرم اور گرم لہجے میں لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں —— میں نے

کہا۔ بھئی یہ بات تو ہر زبان کے ساتھ ہے۔ ہمارے لہجے ہی سے تو پتہ چلتا ہے کہ ہم خوش ہیں یا ناراض' غصہ میں بول رہے ہیں یا مایوس ہیں۔ ہم سب کھانا بھول کر اچھی خاصی بحث میں پڑ گئے تھے۔ ڈینس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں روکا۔ منہ کا نوالہ چبا کر حلق سے نیچے اتارا۔ پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ آپ لوگ سمجھے نہیں میرا مطلب کچھ اور تھا۔ اب لہجے کی مثال آپ کو دیتا ہوں۔ اگر تھائی میں آپ ''ما'' سیدھے سادے اور دھیمے لہجے یا آواز میں کہیں گے تو اس کا مطلب ہوگا ''آؤ'' —— مگر اسی کو اگر اونچی

آواز میں زور سے کہیں گے تو اس کا مطلب ہو جائے گا ''کتا'' پھر اسی ''کتے'' کو اگر مزید کرخت اور تیز لہجے میں کہا جائے تو یہ بن جائے گا ''گھوڑا'' —— اب آپ سمجھے کہ تین طرح کی آواز سے ایک لفظ کیسے

تین معنی فراہم کرتا ہے —— ''اماں نہیں'' —— ہم لوگ ڈینس کی کچھ کھینچائی کرنے لگے —— ڈینس

نے جوش میں آ کر کہا' میں مدرس ہوں اور خود تھائی زبان کی تعلیم حاصل کی ہے' پھر بھی کبھی کبھی بور ہو جاتا ہوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ تھائی زبان کے پانچ "Tones" یا لہجے ہیں۔ ایک ہی لفظ کو ہلکے' زور' کھینچ کر' اونچی آواز میں یا کرخت آواز میں بدل بدل کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بچپن سے ہر تھائی بچے کو ''گا''، ''گآ''، ''گاہ''، ''گاآ'' اور ''گاآہ'' کی تختی رٹوائی جاتی ہے۔ ہم آپ اسے مشکل سمجھ رہے ہیں' ان کے لیے یہ آسان ہے۔ میں نے کہا بھئی' آپ نے تو بڑے مزے کی بات بتائی! اقبال نے کہا ''ڈینس ڈیر

چند مثالیں اور بتاؤ تا کہ میں ذہن میں رکھوں۔ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ڈینس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ عام لہجے میں ''کائی'' کے معنی ہیں ''انڈا'' مگر یہی گرے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا جائے تو اس کا مطلب ہوگا ''بخار''۔ حالاں کہ مجھے دونوں کے فرق کا خوب اندازہ تھا' مگر ایک شام میری طبیعت خراب تھی' بخار سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے عام لہجہ میں کہا ''پین کائی''، یعنی مجھے بخار لگ رہا ہے۔ بیوی میری بات خوب سمجھ رہی تھی کیوں کہ میری حالت بگڑی ہوئی تھی مگر میری اصلاح کے لیے اس نے بڑے پیار سے کہا ''اچھا مجھے نہیں معلوم تھا آپ ایک انڈا ہیں۔'' مجھے فوراً اپنے لہجے اور غلطی کا احساس ہوا اور ہم لوگ دیر تک اس بات پر ہنستے رہے۔

لہجے کے علاوہ یہاں کے روزمرہ کے آداب اور اطوار بھی سفید فام یورپ اور امریکہ والوں کے لیے مسئلہ ہے۔ ڈینس نے بتایا کہ ان کا ''سواس دی کا''، یعنی ہاتھ جوڑ کر سلام یا استقبال بھی ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا۔ عمر، عہدے اور پیشے سے یہ لوگ اندازہ کرتے ہیں کہ کس کو کس قدر ہاتھ اٹھا کر یا کتنا جھک کر خوش آمدید کہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں تمام بے حیائیوں کے باوجود اگر راستے میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کا (خصوصاً کسی تھائی لڑکی کا) ہاتھ تھامے گھوم رہا ہو تو یہ لوگ بہت برا سمجھتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکی فوجیوں کی عیش کوشی کا اڈہ بنکاک بنا ہوا تھا۔ (اور آج بھی ہے) امریکی جوان جب کسی کال گرل کا ہاتھ تھامے بازار سے گزرتے ہیں تو عام لوگوں کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ حالاں کہ ان نوجوانوں کے لیے یہ بڑا شریفانہ سلوک تھا۔ مندر میں بدھا کی مورت کی طرف پاؤں کر کے بیٹھنے پر تھائی لوگ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ حالاں کہ امریکی ایسا جان کر نہیں کرتے کیوں کہ ان کے کلچر میں پاؤں کا کسی خاص طرف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی عورت کسی مندر کے راہب کو کوئی چیز نہیں دے سکتی' نہ ہی اسے چھو سکتی ہے۔ گو امریکی لڑکی کے لیے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانا کوئی معیوب بات نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی سماجی اڑچنوں سے ''فرنگ''، یعنی سفید فام بہت بدنام ہیں۔ جب میں نے ڈینس کو بتایا کہ میرے خیال میں تھائی لفظ ''فرنگ'' فارسی کے ''افرنگ'' سے لیا ہوا ہے' اسے بڑی حیرت ہوئی۔ ساتھ ہی میں نے یہ بتایا کہ برٹش راج کے دوران ہندستانی بھی سفید برٹش کو لوگوں کو ''فرنگی'' کہتے تھے اور ان کے دل میں بھی فرنگیوں سے نفرت تھی مگر کسی کے ہاتھ پکڑنے سے نہیں بلکہ یہ لوگ ملک کو ہاتھوں ہاتھ خرچ کیے دے رہے تھے ـــــ میں نے ڈینس سے کہا کہ یہاں کے کلچر اور بازار اور لہجے کی تو خوب خوب باتیں ہوئیں' یہ بتاؤ کہ ادب میں کیا ہو رہا ہے۔ کل میں ان کی موسیقی اور رقص کے میلے میں گیا تھا۔ پروگرام دلچسپ تھا' مگر یہاں کے جدید رجحان کا پتہ نہیں چلا۔ ڈینس خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا کہ میں نے مزید کہا کہ مجھے تو یہ

لوگ صرف لباس سے ماڈرن لگ رہے ہیں۔ یا ''ڈسکو میوزک'' والی ماڈرن ازم کا زور ہے —— ڈینس نے کہا' نہیں ادب میں بھی تجربے یہ لوگ کر رہے ہیں۔ مگر چوں کہ روایت پرستی روزمرہ کی زندگی میں اثر انداز ہے اس لیے ماضی کی بازگشت اب بھی ان کے فنونِ لطیفہ میں سنائی دیتی ہے۔ ویسے آج ایک جدید ناول نگار ''نی کوم'' پراسرت بک اسٹور میں بیٹھا اپنی نئی انعام یافتہ کتاب پر دستخط کر کے دے گا۔ اگر ملنا چاہو تو اس سے تمھیں ملواتے ہیں —— میں فوراً تیار ہو گیا۔ اقبال کا پروگرام معلوم کیا۔ وہ شام اپنے گروپ کو ''پھوکٹ'' لے جا رہا تھا۔ اس نے اجازت چاہی۔ میں نے کہا رات فون کر لینا۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ اقبال سنگھ ڈھیر سارا خلوص لیے مجھ سے بغل گیر ہوا اور ہم لوگوں کو چھوڑ کر اپنے کام کو نکل گیا۔ ہم لوگ اٹھ کر باہر آئے۔ ایک ٹیکسی لے کر ''سی لوم'' روڈ کی طرف چل پڑے۔

ڈینس نے بتایا کہ ۳۷ رسالہ جوان ناول نگار ''نی کوم رایاوا'' کو اس سال ۱۹۸۸ء کا ''جنوب مشرق ایشیا ایوارڈ'' اس کے نئے ناول ''ٹالنگ سونگ' سونگ ناک'' (یعنی بھاری پیڑ اور چوڑے پاٹ) پر ملا ہے۔ یہ اس کا تیسرا ناول ہے جو عوام کی روح کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ میں نے پوچھا کیا تم نے ناول پڑھا ہے؟ اس نے کہا نہیں' ہاں اخباروں میں تبصرہ پڑھا ہے۔ موقع ملا تو آج خریدوں گا۔ ڈینس نے پوچھا' کیا تمہارے ملک میں عوام ادیب و شاعر کی عزت کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں بہت عزت کرتے ہیں مگر صرف عزت' کتاب نہیں خریدتے۔ عموماً کسی ناشر یا ادارے کے ذریعہ ہی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ویسے ''ٹریش لٹریچر'' کی مارکیٹ تو ہر زبان مین ساری دنیا میں موجود ہے مگر ادبی کتابیں عام لوگ خرید کر نہیں پڑھتے۔ نہ کسی اسٹور میں شاعر و ادیب اپنی کتاب کی اجراء کے بعد بیٹھتا ہے کہ خریدنے والے کو کتاب دستخط کر کے دے' حالاں کہ مجھے یہ رسم پسند ہے۔ اس سے ادیب اور قاری کے بیچ ایک رابطہ قائم ہوتا ہے۔

''پراسرت بک اسٹور'' بہت بڑی دکان تھی۔ ہزاروں کتابیں الماریوں میں قرینے سے لگی تھیں۔ ڈینس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر کاؤنٹر والی لڑکی سے ناول نگار کے متعلق پوچھا۔ اس نے ایک کونے والی میز کی طرف اشارہ کیا۔ دکان میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میز کے گرد چند لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ڈینس نے ''بھاری پیڑ چوڑے پاٹ'' کی ایک کاپی اٹھائی اور ''نی کوم روایا'' کے سامنے دستخط کے لیے رکھ دی۔ عام تھائی سے قدر لانبا' ایک کلین شیو جوان کاٹن شرٹ اور جینز میں ملبوس خاموشی سے مسکراتے ہوئے سامنے رکھی کتابوں پر دستخط کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے پہلی نظر میں گہری آنکھوں اور سنجیدہ چہرے والا یہ نوجوان اچھا لگا۔ ڈینس کے ساتھ میں نے بھی جب اسے ہاتھ جوڑ کر ''سواس دی کلاپ'' کہا تو وہ بھی یہی دہراتا اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ڈینس نے اپنا اور ہمارا

تھائی زبان میں تعارف کرایا اور پوچھا کہ اگر آپ مصروف نہ ہوں تو ہمارے دوست سے چند منٹ بات کر لیں۔ یہ ہندستانی رائٹر ہیں مگر کینیڈا سے آئیں ہیں۔''نی کوم'' ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس کے آگے چھ کتابیں رکھی تھیں۔ کہنے لگا اسے ختم کر کے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ڈینس سے کہا یہاں تو بھیڑ ہے' بندے سے کہو دس منٹ کے لیے ہمارے ساتھ کسی قریبی کیفے میں چلے —— دستخط کر کے ''نی کوم'' کھڑا ہو گیا۔ اس کی کتابیں خریدنے والے بیشتر نوجوان تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جوانوں میں زیادہ مقبول ہے۔ کاؤنٹر پر کچھ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ باہر آ گیا۔ قریب کے کیفے میں ہم لوگ داخل ہوئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ڈینس نے کافی کا آرڈر دیا۔ میں نے ''نی کوم'' کو انعام کی مبارک باد دی ۔اس نے تعظیماً جھک کر شکریہ ادا کیا۔ ڈینس نے اس سے پوچھا کہ وہ فل ٹائم رائٹر ہے یا کوئی اور بھی کام کرتا ہے۔''نی کوم'' نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''انھیں معلوم ہوگا' ایشیا میں فل ٹائم رائٹر نہیں کے برابر ہیں۔ ہر کوئی پہلے لکھنے کے ساتھ کوئی نہ کوئی (اپنی پسند یا ناپسند) کام کرتا ہے پھر اگر مارکیٹ بن جائے تو پورا وقت لکھنے میں صرف کرتا ہے۔ کتنے ہیں جو اس تجربے میں ہی ہمت ہار دیتے ہیں —— میں لکھنے کے ساتھ کاشت کاری بھی کرتا ہوں —— میں نے پوچھا' آپ نے کاشت کاری کو کیوں اپنایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا' تھائی لینڈ ایک زرعی ملک ہے اور تھائی لوگ اگر اپنی زمینوں کی طرف رجوع ہو جائیں یعنی زراعت اور مختلف کاشت کاری کریں تو ملک کی معاشی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ ہمیں پہلے زراعت میں کامیاب ہونا ہے۔ کل کارخانے خود بخود کامیاب ہونے لگیں گے۔ میں کہنے کی بجائے عمل پر یقین رکھتا ہوں اس لیے خود زمین پر واپس گیا ہوں۔ حالاں کہ میرا کام بڑا سخت ہے۔ میں ربر کی کاشت کاری کرتا ہوں۔ پہلے دوسروں کے لیے کرتا تھا' اب اپنے لیے کرتا ہوں۔ میری کامیابی سے لوگ بھی اس سلسلے میں سنجیدہ ہوں گے۔ پھر میں اپنے قلم سے بھی اس بات پر زور دیتا ہوں۔ میری کہانیاں لوگوں کی پریشانیاں اور ان کے جدوجہد کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں ''نی کوم'' کی سادگی اور فلسفے سے متاثر ہوا۔ کافی آئی اور ہم لوگ چند لمحوں کے لیے اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ پتہ چلا اس سے پہلی والی کتاب ''درختوں پر لوگ'' کے لیے بھی ''نی کوم'' کو انعام مل چکا ہے۔ مگر یہ انعام اسے آسانی سے نہیں ملے۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی پریشانیاں جھیلی ہیں اور ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ کافی پیتے ہوئے ''نی کوم'' گھڑی بھی دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگ زبردستی اس بے چارے کو یہاں گھسیٹ لائے تھے۔ میں نے کہا کہ اس سے پہلے کہ ہم آپ کو چھوڑیں اس نئے ناول کے بارے میں کچھ بتاتے جاؤ۔''نی کوم'' نے کہا کہ سولہ سال کی عمر میں ایک حادثہ میں نے دیکھا تھا

۔ایک بوڑھا ہاتھی درختوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے گر کر مر جاتا ہے۔ میں اس حادثہ کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا مگر نہیں لکھ پایا۔ پھر میں نے ۹۲ رسال کی عمر میں ہاتھی اور دیگر جانوروں کے ساتھ ایک اور طرح کا ظلم دیکھا۔لوگ ہاتھی، ہرن، چڑیا، خرگوش وغیرہ کو بے دردی سے مار کر ان میں بھس بھر کر انھیں دوبارہ زندگی عطا کرتے ہیں کہ وہ امیروں کے ڈرائنگ روم اور شوکیس میں سجائے جا سکیں۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ زندگی لے کر دوبارہ زندگی عطا کرنے کا یہ طریقہ کیسا ہے؟ ہم جان دینے کے لیے جان لیتے کیوں ہیں؟ ہم زندوں سے زیادہ مردوں کی قدر کیوں کرتے ہیں؟ ہم تعمیر کے ساتھ تخریب کیوں پسند کرتے ہیں؟ ہم اچھے کے ساتھ برے کیوں ہیں؟ بس یہی میرے ناول کا موضوع ہے۔

میں نے ''نی کوم'' سے کہا کہ میرے خیال میں ماحول اور حالات انسان سے سب کچھ کراتے ہیں۔آپ مبارک باد اور انعام دونوں کے مستحق ہیں کیوں کہ آج کے مشینی دور میں بہت سے ادیب سستی شہرت اور آسان کمائی کے لیے غیر سنجیدہ تحریروں میں اپنی توانائی صرف کرتے ہیں جب کہ آپ بہت سنجیدگی سے' قلم کی حرمت کو بچاتے ہوئے اپنے مشن میں کامیاب ہو رہے ہیں۔اٹھتے ہوئے ''نی کوم'' نے خوش ہو کر کہا آپ لوگ یقین نہیں کر سکتے کہ آپ سے مل کر ہمیں کتنی خوشی ہوئی اور کس قدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

میں نے چلتے چلتے کہا' آپ کو بھی اندازہ نہیں کہ آپ نے تھائی کلچر کا جو رخ دکھایا ہے وہ کتنا خوبصورت اور زندگی سے بھرپور ہے۔اس مختصر سی ملاقات میں ہم نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں نے ڈینس کا بھی بہت شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ سے ایک اچھے اور ایمان دار ادیب سے آج ملاقات ہوگئی۔وہ بھی بنکاک کے جھوٹے چمک دمک والے ماحول میں۔

صبحِ صادق' مرغ کی بانگ سے پہلے' ریسیپشن کاؤنٹر والی نیک دل دوشیزہ نے وعدے کے مطابق مجھے فون کر کے جگا دیا۔نو بجے کی فلائٹ سے مجھے کلکتہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے جلدی جلدی تیار ہو کر اپنے سامان کو یکجا کیا اور نیچے آ کر ہوٹل کا حساب برابر کیا اور میزبان دوشیزہ کو ''لاگان'' یعنی الوداع کہا جس کا جواب اس نے صبح کی پہلی کرن والی مسکراہٹ سے ''کوب کھن'' کہتے ہوئے دیا۔ میں نے کیفے سے ایک کپ چائے لی اور ٹیکسی لے کر طیرانگاہ روانہ ہوا —— رات بھر کا تھکا ماندہ بنکاک خمار آلود نگاہوں سے ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔راستے سنسان تھے اور کہرے کی چادر نے چہار سو ایک طرح کا سکون پھیلا رکھا تھا۔سویا سویا سا عبدل اور بنارسی لال کا شہرِ امید، اس وقت بڑا معصوم لگ رہا تھا ۔امید کے خلاف اور بہت ساری حیرانگی سمیٹے میرا یہ سفر بڑا کامیاب' پُر لطف اور کارآمد ثابت ہوا تھا۔ میرے ذہن میں بنکاک کی جو کبڑی شبیہ تھی اس کی جگہ ''نی کوم'' کا بردبار مسکراتا ہوا چہرہ آ گیا تھا۔ان

سب سے بڑھ کر اقبال سنگھ دی گریٹ کی غیر متوقع اور ڈرامائی ملاقات نے میرے تجربوں اور مسرتوں کو یادگار بنا دیا تھا۔

طیارے نے جب اپنے پر پھیلا کر ہوا سے باتیں کرنا شروع کیں، تو میں نے ''گناہ کے شہر'' کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ میرے خیال میں کوئی شہر گناہ گار یا برا نہیں ہوتا، لوگ اسے برا بنا ڈالتے ہیں۔ اب لوگوں کا کیا جائے۔ تمام کج روی سمیت بنکاک اب مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ بس ذرا چمپی مالش کی چاپ اور ڈگ ڈگ ٹیکسی کا شور نہ ہوتا تو کیا کہنا اس شہرِ خوش رنگ کا! ــــ ''سواس دی کلاپ'' کہتے ہوئے ایک سانولی سلونی ایئر ہوسٹس نے اپنے گلابی ریشمی پیراہن کو سنبھالتے ہوئے، سنترے کے رس کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ میں بس اس کی مخصوص تھائی مسکان دیکھا کیا!

☆☆☆